ہندوستانی نشاۃ ثانیہ

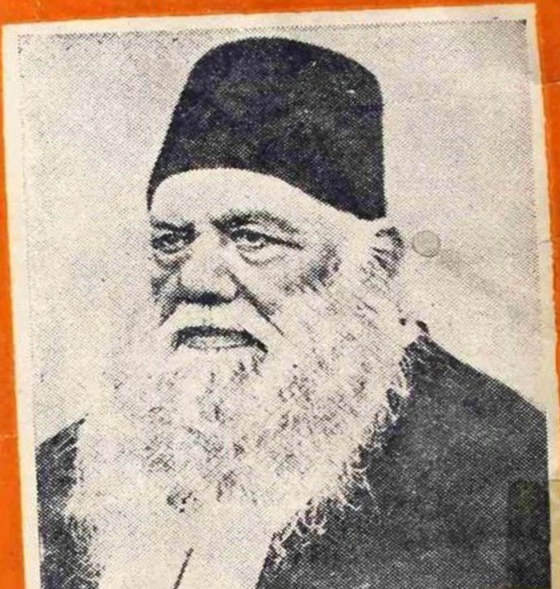

ڈاکٹر

قدسیہ خاتون

سرسید کی ادبی خدمات

اور

ہندوستانی نشاۃ ثانیہ

از

ڈاکٹر قدسیہ خاتون

ناشر

کتابستان

۳۰ — چک — الہ آباد

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکیڈمی
کا مالی تعاون شامل ہے

ستمبر ۱۹۸۱ء

مطبوعہ - اسرار کریمی پریس - الہ آباد

شفیق محترم والد مرحوم جناب ڈاکٹر سیّد **محمود**

کے نام جن کی شفقت و پیار نے

ہمیشہ چراغِ راہ بن کر

حصولِ علم کی تشنگی

بڑھادی

پیش لفظ

اپنے والد محترم (مرحوم ڈاکٹر سید محمود) کی زبانی علی گڈھ کالج کے اوّلین زمانہ کی تعلیمی سرگرمیوں، طلباء اور بورڈنگ ہاؤس کی مخصوص طرز زندگی، لطائف اور جوش جذبات کے کارنامے سن کر بچپن ہی میں مجھے علی گڈھ اور سرسید کی شخصیت سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ زمانۂ تعلیم میں سرسید احمد خاں اور ان کے کارناموں سے واقفیت کے ساتھ یہ دلچسپی زیادہ گہری ہو گئی۔ لہٰذا جب الہ آباد یونیورسٹی سے محترم پروفیسر احتشام حسین صاحب کے تحت اس موضوع پر ریسرچ کرنے کا موقع ملا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ شفیق استاد کے اعلیٰ ادبی ذوق نے ہر آن روشنی دکھائی تو ہمت افزائی ہوئی اور ذوق و شوق نے ادب کی راہ میں آگے بڑھتے رہنے کی تلقین کی۔

سرسید کی زندگی کے حالات اور خدمات پر اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مضامین کا تو شمار نہیں۔ انگریزی میں بھی علی گڈھ تحریک اور سرسید کی خدمات پر کئی تصانیف ہیں جن سے راقم الحروف نے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کام سیاسی جانبداری کے نقطۂ نظر سے کئے گئے تھے یا پھر عقیدت مندانہ انداز رکھتے تھے۔ اس لئے متوازن نقطۂ نگاہ کی کمی ہر جگہ محسوس ہوتی تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تحلیل و تجزیہ، تنقید اور دلائل کی مدد سے سرسید کے کارناموں کی ایسی تصویر بناؤں جو ہندوستانی تہذیب کے ارتقا کے چوکھٹے میں ٹھیک بیٹھ سکے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے لیکن ہر جگہ کوشش یہی رہی ہے اور یہی اس مقالہ کا مقصد تھا۔ چونکہ یہ مقالہ ادبی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اس لئے خاص طور سے اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ میں نے اُن کی ادبی خدمات کو اُس زمانہ کے پس منظر اور اُن کی دیگر تمام خدمات کے مابین دیکھا اور اس کے صحیح

مقام واہمیت کی جستجو کی ہے۔ اس موضوع کی وسعت اور سنجیدگی کے پیشِ نظر حتی الامکان غیر جانبداری سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع میں ایک دقت یہ تھی کہ صرف ادبی خدمات کا جائزہ لینا کافی نہ تھا۔ بلکہ اس دور کے مذہبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی پوزیشن اور ذہنی رجحانات کے پسِ منظر میں سرسید کے کل کارناموں کو سمجھنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس مقالہ میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ اِس سلسلے میں سماجی، سیاسی، اقتصادی ولسانی تمام موضوعات سے نپٹنا پڑا۔

اتنی اہم ذمہ داری کو پورا کرنا میرے لئے آسان نہ تھا۔ اللہ پاک کا شکر ہے کہ میں اس کام کو اپنے محترم اُستاد پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کی سرکردگی میں پورا کرسکی۔ موصوف کی شفقت اور نگرانی نے رہنمائی کی۔ اُن کی علمی و ادبی وسعت نظری اور عمیق نگاہی سے استفادہ حاصل کرنے کا حوصلہ بڑھا اور اُن کی توجہ و شفقت سے اس دشوار گذار کام کو انجام دینے میں پوری پوری مدد ملی۔

میں الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کے کارکنان اور اپنے محسنین کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی وجہ سے مجھے لائبریری سے مواد حاصل کرنے میں آسانیاں ہوئیں۔ چونکہ علی گڈھ میں سرسید کے وسیع حالات فراہم ہیں اس لئے مجھے مستقل طور پر آزاد لائبریری علیگڈھ سے رابطہ رکھنا اور بار بار علی گڈھ میں قیام کرنا پڑا۔ علی گڈھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو اور آزاد لائبریری کے اُن تمام حضرات کی ممنون ہوں جنھوں نے مجھے اس سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہونچائیں۔ میں اُن سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ محترم جناب حکم چند نیرؔ (صدر شعبۂ اُردو بنارس یونیورسٹی) کی ممنون ہوں جنھوں نے کتابت اور تمام ابتدائی اہتمام کی تکمیل میں دلچسپی کے ساتھ اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کیا۔ آخر میں جناب انوار اللہ صاحب کی مشکور ہوں جنھوں نے کتاب کی اشاعت کے تمام آخری مرحلات کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی اور میری مشکل آسان کردی۔

قدسیہ خاتون

فہرست

پیش لفظ	ا	
باب اول ۔ تاریخی پس منظر	ا تا	۴۰
باب دوم ۔ نشاۃ ثانیہ کے عظیم اثرات	۴۶ تا	۸۳
باب سوم ۔ سرسید ۱۸۵۷ء سے پہلے ۔ دَورِ تشکیل	۸۴ تا	۱۰۵
باب چہارم ۔ سرسید ۱۸۵۷ء کے بعد دَورِ تکمیل	۱۰۶ تا	۱۸۵
باب پنجم ۔ سرسید کی ادبی خدمات	۱۸۶ تا	۲۶۵
باب ششم ۔ خدمات کی اہمیت و نتائج	۲۶۶ تا	۳۰۷
تفصیلی فٹ نوٹ	۳۰۸ تا	۳۳۸
کتابیات	۳۳۹ تا	۳۴۹

باب اوّل

تاریخی پس منظر

انیسویں صدی کا دور ہندوستان میں ایک عظیم تبدیلی، سیلابی کشمکش، اور مادی ترقی کا دور تھا جس کے نتیجہ میں ہماری زندگی اور سماج کا گوشہ گوشہ طوفانی وہیجانی کشمکش میں مبتلا تھا طوفانوں کا رخ موڑ دینے والا یہ ہیجان تیز تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا۔ اس کے اچھے اور برے نتائج ایک دوسرے سے پیوست ہو کر غور کرنے والوں کے لئے الجھنیں بڑھا رہے تھے۔ مغربی علوم سائنسی ایجادات، سیاست، حکومت اور معاش ایک ملی جلی کیفیت میں ترقی و تنزلی کی نئی صورتوں کے ساتھ مفید و غیر مفید اثرات اور ان کے واضح نتائج برآمد کر رہے تھے۔ جدوجہد کشمکش اور انتشار کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا مغلیہ زوال اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے تسلط کے ساتھ انگریزوں کے مظالم اور ملک گیری کی ہوس نے ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں فوری طور پر بے حد ابتری پیدا کر دی۔ اس ابتری نے اس وقت کے سماجی و اخلاقی زوال کو وسیع کیا جو قومی و ملکی بربادی کا نشان تھا۔

مغلیہ دور اپنی زوال پذیری کے باعث اس انقلاب سے بے خبر اور غافل تھا۔ زمانے کے تقاضوں کا حل پیش نہ کرنا اور نمو کی طاقت سے ہم آہنگ ہو کر اس کا جواب نہ دینا قوموں کی تاریخ میں جاں کنی کی کیفیت رکھتا ہے۔ مغلیہ ہندوستان اب اس حد میں قدم رکھ چکا تھا۔ لہذا جب یہ اکھڑی اکھڑی ہوا غدر کا طوفان بنی تو ہندوستان کی قسمت انگریزوں کے ہاتھ آ گئی۔ یہ صرف سیاسی محاذ نہ تھا قدم قدم پر مشرق و مغرب کی ٹکر ہو رہی تھی۔ مذہب و عقیدہ، تہذیب و تعلیم، صنعت و معاش، سب اس کی زد میں آ گئے تھے۔ ہر منزل پر ہندوستان کو کڑی آزمائش کا سامنا تھا۔

اس پر آشوب دور میں سرسید کے ذہن نے جن چیزوں کا خاص اثر لیا وہ ملک کی سماجی ابتری، اقتصادی بدحالی، اور روحانی انحطاط تھا۔ اس کے جو دردناک نتائج ہوئے وہ نشتر

بن کران کی روح میں اتر گئے ۔ سر سید نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء نے ہندوستانی سیاست کی باگ ڈور بیرونی طاقت کے سپرد کر دی ہے ۔ اس طاقت کی ترقی کی عمارتیں ہندوستان کی بے پناہ دولت کے خزانوں سے بڑی تیزی سے تعمیر ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ برطانیہ ایک بین الاقوامی طاقت بن چکا ہے ۔ اس جارحانہ تسلط کے باوجود اسی کے ذریعہ ہندوستان مغرب اور اس کی لائی ہوئی نئی قدروں سے آشنا ہو رہا تھا۔ یہ قدریں نئے دور کی آواز ہیں۔ سائنس کا نقیب، عقلیت اسکی پاسبان اور مغربی تہذیب اس کا مظہر ہے ۔ ادھر ہندوستان مشرقیت کی حقیقی روح سے بیگانہ، ذہن و نظر کی الجھنوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سیاست دوسروں کے اختیار میں، دولت بیرونی ہاتھوں میں، قوم معاش کے لئے ان کی دست نگر، اس لئے جدیدیت کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس سے مستفید ہونا قوم کے لئے امکان سے باہر تھا۔

اس تاریخی پس منظر میں سر سید کی شخصیت اور ان کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ علیحدہ علیحدہ ان کی سوشل اصلاحات، مذہبی خدمات یا ادبی کاوشوں سے کرنا صرف محدود اور غیر مربوط دائروں میں دیکھنا ہے ۔ ان کی تمام سوشل اور مذہبی اصلاحات، ادبی خدمات اور تعلیمی مصروفیات، اس طرح ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں کہ ان کے نشان راہ کو دیکھنے اور ان کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے ان سب کے تعلق کو سمجھنا اور درمیانی کڑیوں کی صحیح تلاش لازمی ہے ۔ ساتھ ہی ان سب کو اس عظیم تاریخی پس منظر کی روشنی میں دیکھنا بھی ضروری ہے جو جدید ہندوستان کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے ۔ سر سید غدر کے پہلے کے ہندوستانی سماج سے بھی واقف تھے ۔ مغربی اثرات کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے گہرے نقوش بھی دیکھ رہے تھے ۔ ان کی نظر غدر کے قبل و بعد کی تباہیوں پر بھی تھی وہ مغرب کی ترقیوں اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے بھی آگاہ تھے ۔ ان سب کے علاوہ انگریزی سامراج کی مصلحت اندیشیاں بھی ان کے سامنے تھیں ۔

اسی لئے سر سید کی تحریک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی محرکات سے آگاہی ضروری ہے اس کے بغیر سر سید کے افکار و نظریات کو صحیح روشنی میں نہیں دیکھا جا سکتا اور نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کے علمی و ادبی موثرات کیا تھے ۔ اردو سے اس کا تعلق کیا تھا۔ سر سید کی ادبی خدمات عصری ضروریات سے کس طرح عہدہ برآ ہوئیں، اس سلسلے میں مذہبی سیاسی و اقتصادی تفصیلات بھی آئیں گی ۔ دیگر قدیم و جدید تحریکوں کا بھی ذکر ہوگا اور تاریخی واقعات و

حالات بھی پیش نظر ہوں گے۔ ہمارے ملک میں مغلیہ زوال اس دور کی کمزوریوں کے سبب ہی نہیں تھا بلکہ یہ تاریخ کا ایک ناگزیر موڑ تھا۔ یہ وسطی دور جاگیردارانہ اور شاہانہ نظام کا پروردہ تھا۔ نیا دور اس کے مقابلے میں اپنے ساتھ جو سب سے اہم چیز لایا تھا وہ صنعتی دور اور سرمایہ دارانہ نظام تھا جس سے صرف اقتصادیات ہی نہیں سماج کا سارا خاکہ بدل گیا۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہب کے مقابلے میں مادیت کی طرف رجحان بڑھنے لگا۔ ہر چیز عقل کی ترازو سے تولی جانے لگی۔ چنانچہ قدیم و جدید دور کے درمیان ایک حد فاصل قائم ہوگئی۔ قدیم سے جدید یہ تبدیلی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ جسے نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ یہاں قدیم وجدید تحریکوں کا جائزہ اور ان کے رجحانات کی نشاندہی تشنہ رہ جائے گی اگر نشاۃ ثانیہ کے کردار و مزاج پر روشنی نہ ڈالی جائے۔

ملکوں کی تاریخ میں ہمیشہ انقلاب آتے رہے ہیں اور جب بھی یہ ظہور میں آئے ہیں ملک کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی بنیادوں کو الٹ پلٹ کر ڈالا ہے یہ الٹ پلٹ تخریبی بھی ہوئی ہے اور تعمیری بھی اور ہمیشہ پہلے اس کی تخریبی شکل نمودار ہوتی ہے اور پھر بعد میں تعمیری۔ سیاست ہمیشہ اس کا بنیادی جز ہوتی ہے۔ ایسے عظیم انقلابات جو قوموں اور ملکوں کی تاریخ کا ایک اہم جز بن جائیں، تمام سماجی و تہذیبی روایات پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ ایک نیا نشان راہ قائم کردیں، اقتصادی اور معاشی بنیادوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں پیدا کردیں کہ ایک نیا نظام تشکیل پانے لگے، ایسے انقلابات صرف یہیں تک نہیں بلکہ عقائد کی مذہبی حدود میں بھی اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ یہ تاریخی انقلابات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کا بنیادی رخ ہنگامی اور صرف تخریبی ہوتا ہے۔ ایسے انقلابات آگ کی شدت اور لاوے کی حدت کا اثر رکھتے ہیں۔ ملک کو ویران اور قوموں کو پامال کرتے، روندتے کچلتے اور انہیں تاریخ کا ورق پارینہ بناتے نکل جاتے ہیں۔ ایسے انقلابات کو ہم تاریخ میں خونی انقلابات کا نام دیتے ہیں جو زیادہ تر صرف سیاسی تبدیلیوں اور الٹ پھیر کے درمیان ہوتے ہیں۔

دوسرا طرز ان انقلابات کا ہے جن میں تخریبی اور تعمیری اجزاء ملے جلے ہوتے ہیں۔ جن کی چال صرف کچل دینے والی نہیں بلکہ قافلوں کی رہبری کرنے والی ہوتی ہے۔ ان کے اثرات قوموں کی تہذیبی اور سماجی بنیادوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں اور زیادہ

گھرے ہوتے ہیں۔ یہ انسانی ذہن کی جودت، علمی ترقی، بڑھنے اور حاصل کرنے کی اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ قوموں اور ملکوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرف قدیم قدروں سے ٹکراتے ہیں تو دوسری طرف نئی قدروں سے ان کی بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں نیز ان کی ہیئت و ماہیت بدلتے ہیں، ان کی منزل اور ان کے مقاصد متعین کرتے ہیں ایک نئے سماج اور نئے دور کی تشکیل کرتے ہیں اور نیا نشان راہ قائم کرتے ہیں۔ ایسے ہی انقلابات کو ہم نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔" اگر ہم نشاۃ ثانیہ کو ایک دور مان لیں تو یقیناً ایک تاریخی دور کے دوسرے تاریخی دور میں منتقل ہو جانے کو نشاۃ ثانیہ کہہ سکتے ہیں۔" ۱

ہندوستانی نشاۃ ثانیہ ہمارے سماج کے لئے زندگی کا ایک بالکل نیا خاکہ پیش کر رہا تھا۔" فکر کی آزادی، دینوی تصورات کی ابتداء، قومی ریاست کا ظہور، ابتدائی سرمایہ داری ایک نئے فارغ البال طبقہ کی تہذیبی قیادت۔ عقلیت اور انسان دوستی، ان اقدار سے نشاۃ ثانیہ کی بہتر ترجمانی ہو سکتی ہے۔" ۲

ہندوستان کی تاریخ میں بھی انقلابات آتے رہے ہیں۔ ایک غیر معمولی تبدیلی وہ تھی جب آریہ ہندوستان میں آئے اور یہاں کے تہذیبی، سماجی، اور مذہبی خاکوں میں نئے رنگ بھر دئے۔ قدیم نظام کے پورے ڈھانچے کو نئے سانچے میں ڈھال کر نئی بنیادیں قائم کیں۔ یہ دور ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے۔ دوسرا اہم ارتقائی تغیر وہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ظہور میں آیا۔ ان کی آمد کے بعد صدیوں کی دوڑ میں مغلوں کے سیاسی تسلط کے ساتھ اپنی انفرادی حیثیت متعین کرنے لگا۔ اس نے ہندوستان کو وہ علمی، تہذیبی اور سماجی قدریں دیں جو اس وقت تک یہاں کے لئے بالکل نئی تھیں۔ (فٹ نوٹ نمبر ۱) ۳

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کے ساتھ ہی ہندوستان دنیا کی دو بڑی تہذیبوں کا سنگم بن گیا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہونے کی یہ کیفیت کئی سو سال تک غیر محسوس طور پر جاری رہی۔

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۹ میں ص ۱۲۳

۲۔ سرسید اور مغرب کے تہذیبی اور ادبی اثرات از پروفیسر آل احمد سرور در علیگڈھ تحریک ص ۵۲

۳۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر (۱) باب اول) ۔ ص ۳۰۸

اس کا سب سے نمایاں اور پہلا اثر عام بول چال میں صاف نظر آنے لگا۔ چنانچہ او میلے O'Malley لکھتا ہے "انتظام حکومت اور سوشل زندگی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کے نتیجہ میں ایک مشترکہ زبان اردو وجود میں آئی۔ یہ نئی زبان تمام شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی لینگوا فرینکا بن گئی اور دکن تک پھیل گئی جہاں سترھویں صدی کے وسط تک ادبی حیثیت سے پھلی پھولی۔ ۱

مغلوں کی آمد اور قیام کے ساتھ ایک دوسرے میں جذب ہونے کی رفتار تیز ہو چکی تھی یہاں تک کہ ہندوستان کی ذات پات کی کثرت اور تہذیبی رنگارنگی میں ایک وحدت کا احساس ہونے لگا۔ اس طرح ایک نیا اور ترقی پذیر کلچر وجود میں آیا جسے مشترکہ کلچر کہا جا سکتا ہے۔ یہ کلچر پہلی بار ذاتوں، نسلوں اور مذہبی امتیازات سے قطع نظر تہذیبی سطح پر وحدت قومی کا لطیف تصور پیش کرنے لگا اور رفتہ رفتہ رشتۂ اخوت بن کر نمایاں تر ہو گیا۔ قرون وسطیٰ کی یہی وہ نئی تہذیب تھی جو پہلی بار ایشیا کے ایک بڑے حصے کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ہندوستان کی قومی عظمت کی علامت بن گئی۔

اس تہذیب کا حسن مشترکہ قومی اساس تھا جس کا عکس ہر جگہ صاف نظر آتا ہے۔ قلعے اور شاہی رہائش گاہیں، باغات اور تاریخی عمارتیں، سب اس کے عکاس ہیں۔ شرفاء کی پوشاک، مجلسوں اور محفلوں کے طور طریقے، اطوار و عادات، رسم و رواج اور عوامی رہن سہن جو انیسویں صدی تک ہندوستان میں عام تھے ایک سانچے میں ڈھلتے نظر آتے تھے۔ کبیر، نانک، تلسی داس، رحیم اور ملک محمد جائسی جیسی شخصیتیں اسی دور میں ایک مشترک روحانی داستان سنانے لگیں۔ ان سب میں نمایاں تر شہروں اور بازاروں میں عام طور پر بولی جانے والی وہ زبان تھی جو ہندوستانی اور پھر اردو کہلائی۔ ادب کے مختلف رجحانات اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکے کہ ملک کے بڑے حصہ میں ایک مشترکہ زبان تشکیل پا چکی تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بول چال اور میل جول کا ذریعہ تھی۔" ۲ اس مشترکہ تہذیب کے ذریعہ مشرق وسطیٰ اور اس

---

1. Modern India And The West — By O'Malley P. 9
2. Hindu Muslim Questions — By Beni Prasad P. 10

کے قرب وجوار سے ہندوستان کا ایک مسلسل تہذیبی و سماجی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اور اسی نے ہندوستان میں ایک تہذیبی و سماجی وحدت کی تشکیل شروع کر دی تھی۔ انھیں نئے نئے تہذیبی، مذہبی، لسانی اور سیاسی اثرات نے ملک میں ایک نیا سماجی ڈھانچہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ "ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک دوسرے سے ذہنی محرکات حاصل کئے۔ مسلمانوں نے معاشرت اور تمدن کے مخصوص تصورات جو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کو دیئے۔" ۱

اسی مشترکہ تہذیب کے تحفے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے سرجادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں۔ "اس کے گہرے اثرات مسلمانوں کے طور طریقے، شاہی نظام دربار، لباس اونچے طبقے کی معاشرت، فوجی نظام، ہتھیاروں، آرائش کی چیزوں، فنون لطیفہ، فن تعمیر اور باغبانی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ کاغذ ہندوستان میں مسلمانوں کا متعارف کردہ ہے جو اپنے عربی نام سے مشہور رہے۔" ۲ یہ تاریخی بدقسمتی ہے کہ دور مغلیہ کے زوال کی داستان اس کی ترقی کا روڑا بننے لگی۔ انگریزوں کا ورود وہ بیرونی جرثومہ تھا جس نے مشترکہ تہذیب کے اس مضبوط اور سرسبز درخت کو خشک کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس عمل میں صرف انگریزوں کی ہوس ملک گیری ہی کارفرما نہ تھی بلکہ مستقبل کی پکار، زمانے کے نئے تقاضے اور نئی قدروں کی روشن حقیقتیں نشاۃ ثانیہ کا طوفان بن کر، اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں داخل ہو گئی تھیں۔ طوفان اس لئے کہ حقیقت میں "وہ تین، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی انقلابات جنھیں یورپ پر اثر انداز ہونے میں تین صدیوں سے زیادہ لگ گئے ہندوستان پر بیک وقت ٹوٹ پڑے۔ قدیم سماجی نظام کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کے ساتھ ہی اس مشترکہ کلچر کی بھی جو اس دور کا پروردہ تھا۔" ۳

تیسرا التغیر وہ ہے جسے ہم درحقیقت موجودہ دور میں نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں جس کے اثرات اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کے بنگال پر تسلط کے ساتھ شروع ہونے

---

1. *Modern India and the West* —— By O'Malley P. 8.
2. *India Through The Ages* —— By J. N. Sarkar P. 51, 52
3. *Hindu Muslim Questions* —— By Beni Prasad P. 16

لگتے ہیں۔ یہ اثرات اٹھارہویں صدی کے آخر تک زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف تک نشاۃ ثانیہ کے اثرات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہی نشاۃ ثانیہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں ایک اہم سماجی اور ذہنی انقلاب کا نشان راہ ہے۔ "نیا ہندوستان ہر چیز میں اس کا احسانمند ہے۔ یہ ایک عام ذہنی بیداری کے ساتھ پہلے ہمارے ادب، تعلیم، خیالات اور آرٹ میں اثر انداز ہوتا ہے اور پھر دوسری پشت میں یہ اخلاقی قوت بن کر ہماری سماجی اور مذہبی اصلاح بن جاتا ہے۔ اور پھر یہ ہماری اقتصادیات کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے۔[1]

نشاۃ ثانیہ کے گہرے اثرات کو ساحلی علاقوں خصوصی طور پر بنگال میں جو انگریزوں کا مرکز بن گیا تھا غدر کے بہت پہلے محسوس کیا جا چکا تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے اس سلسلے میں سب سے پہلے قیادت کی۔ مگر شمال و مغرب کے علاقوں میں غدر کے بعد تک اس کے تقاضوں سے عوام خصوصاً مسلمان ناواقف تھے۔ کیونکہ دلی اور مرکزی علاقوں میں قدیم نظام اب بھی اپنا گہرا اثر رکھتا تھا۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ سر سید ہی کی شخصیت تھی جس نے اس علاقے کے عوام خصوصاً مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کے اثرات کو سمجھنے اور اس کا جواب دینے میں غدر کے بعد علمی، ادبی اور معاشرتی ہر میدان میں رہبری کی۔

یہ بات بہت اہم اور قابل غور ہے کہ ہمارا ملک نشاۃ ثانیہ سے انگریزوں کے ذریعہ ان کے سیاسی غلبہ کے ساتھ دوچار ہوا اور ہندوستان کی غلامی کے ساتھ اس کا دامن وابستہ ہے۔ انگریزوں نے آریوں اور مسلمانوں کی مانند ہندوستان کو اپنا مستقل وطن نہیں قرار دیا۔ یہاں کی سماجی اور تہذیبی اقدار میں شرکت کر کے ہندوستان کے نفع و نقصان میں شریک حال نہیں بنے بلکہ ہمیشہ یہاں اپنی الگ حیثیت بہ طور فاتح قائم رکھی اور اس کی غلامی کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا۔ "بہت سی باتوں میں مسلمان ہم سے بہتر تھے۔ انہوں نے جس ملک کو فتح کیا وہیں رس بس گئے۔ ملکی باشندوں سے شادی

---

1. India Through The Ages —— By J.N. Sarkar P. 58

بیاہ کئے۔ انلوگوں کو ہر طرح کی رعایات دیں اور ان کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کیں۔ حتیٰ کہ فاتح اور مفتوح کے مفاد اور ان کی دلچسپیوں میں فرق نہ رہا۔ اس کے برخلاف ہماری پالیسی اُسکے برعکس رہی ہے۔ یعنی بے تعلقی، خود غرضی اور سرد مہری کی۔ (لارڈ ولیم بینٹنگ)" ۱

لہٰذا نشاۃ ثانیہ نے ایک گھٹی گھٹی فضا میں نمو پایا۔ اس کے ساتھ غلامی کی تمام خامیاں بھی لپٹی رہیں۔ جس نے ہندوستان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور عام سماجی اقدار کو انگریزوں کے سیاسی اور اقتصادی فوائد سے منسلک کر کے بڑی حد تک محدود کر دیا۔ اس سے تقریباً دو تین صدی قبل یورپ میں نشاۃ ثانیہ ایک آزاد سیاسی ماحول میں پھلا پھولا۔ مغرب کی اعلیٰ صلاحیتیں غلامی کے مہرے بن کر آنکھیں نہیں کھول رہی تھیں بلکہ علم و عقل کے وسائل کے ساتھ آزاد اور نیا سماج بنانے، ترقی کے نئے راستے نکالنے، ذہنوں کی بیداری اور نئے گل تراشنے میں تیزی سے معاون تھیں۔ اس تیزی میں کوئی غیر حکومت مسلط اور حائل نہ تھی۔ ہندوستان میں ان عظیم اثرات اور ان کے رخ کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بڑھتے ہوئے اثرات میں غیر ملکی حکومت کا مفاد اور مصلحتیں ہمیشہ حائل رہیں۔ جس نے مخصوص سمتوں میں ان اثرات کی رہبری کرنے کی کوشش کی۔

انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور سیاسی تسلط کے ساتھ مغربی تعلیم و تہذیب اور انگریزی ادب کے اثرات نے بڑی تیزی سے اپنا کام شروع کیا۔ مشرق و مغرب کی یہ ٹکر سیاست، مذہب، عقائد، تہذیب، معاشرت، تعلیم اور ادب کے وسیع میدانوں میں پھیلتی نظر آتی ہے۔ جس کے ساتھ ہر طرف مغربی اثرات گہرے ہوتے چلے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی تصادم کے علاوہ دراصل یہ قدیم و جدید کی ٹکر تھی۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی ٹکر تھی۔ قدرت کا ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس سماج و نظام میں، باوجود ہزاروں خوبیوں اور علم و ہنر کے آگے بڑھنے کی صلاحیت، نئی چیزوں اور نئے اصولوں اور نئے قواعد ایجاد کرنے اور انہیں اپنانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے وہ فوراً معطل اور بے جان ہو کر زوال پذیری کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ گو ظاہری طور پر وہ کچھ دنوں اور اپنی ہیئت قائم رکھے، مگر اندرونی طور پر مردہ اور بے جان ہو جاتا ہے۔ اس کی عمدہ چیز بھی غیر مفید اور پیچیدہ بننے لگتی ہیں۔ ایسا نظام اور سماج زمانے کی ضروریات

1. India And The West —— By O'Malley P.87
AND
Rise of Christian Power In India —— By B.D. Basu P.773

کو پورا کرنے اور اس کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

سترہویں صدی کے ہندوستان پر نظر ڈالی جائے تو اس کے سیاسی نظام کی بنیاد جاگیرداری پر تھی۔ جس کی قوت نوابوں، راجاؤں اور جاگیرداروں کی ریاست بندیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں میں منتشر ہو چکی تھی۔ ان کی فوجی طاقت کا انحصار قدیم طرز کے فوجی ہتھیاروں پر تھا جو مغرب کے نئے آلاتِ جنگ سے بہت کم تر درجے کے تھے۔ ہندوستان میں کبھی کوئی مضبوط اور منظم بحری بیڑہ نہ تھا جو سمندر کی طرف سے اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا۔ اسی وجہ سے انگریز طرح طرح کی دست اندازیاں کرتے۔ ہندوستانی مجبور ہو جاتے اور ان کا شکوہ کچھ کام نہ دیتا۔ یہی سبب ہے کہ دیارِ مغرب کے انگریز سوداگر اتنی دور دراز سے آکر بھی سمندری بیڑے کے ساتھ صرف تجارت ہی نہیں سیاست میں بھی بہت جلد دخل انداز ہو گئے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی تمام سماجی و تہذیبی بنیادیں مذہب سے اس قدر پیوستہ تھیں جیسے گوشت سے ناخن۔ ساتھ ہی غلط رسوم اور عقائد مذہب کے نام پر اتنی سختی سے رائج ہو گئے تھے کہ مذہب کا جُز سمجھے جانے لگے تھے جن میں کوئی تبدیلی مذہب سے انحراف تھا۔ اس طرح ہندوستانی تہذیب جو شائستگی اور حسن میں اپنا نام رکھتی تھی اس میں نمو کی طاقت سلب ہونے لگی۔ لہٰذا یہیں سے اس کے زوال کے حدود نظر آنے لگتے ہیں۔

اس سماجی پس منظر میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہ تھی۔ بلکہ دونوں اس میں یکساں شریک تھے۔ عوام جو ترقی پذیر سماج کا ایک اہم جز ہوتے ہیں سماج کے سخت بندھنوں کے غلام ہو چکے تھے۔ فرد کی آزادی اور آزاد خیالی سلب تھی۔ راجہ رام موہن رائے کہتے ہیں "ہندوستان میں نارمل طریقہ حکومت مطلق العنانی کا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے غلام ہونے کے دیگر اسباب تھے۔ دیسی راجوں کا بودا رویہ۔ جنگی آرٹ میں ایشیا والوں کی یورپ کے مقابلے میں جہالت ہندوستانیوں میں حب الوطنی کی کمی۔ ہماری تہذیب میں انتہا پسندی اور ذات پات کی کڑی تقسیم۔ جس کی وجہ سے ہمارے یہاں آپس کی یک جہتی نا پید رہی"[1]

---

1. History of Indian Social And Political Thoughts.
— By B. Majumdar P. 25

لیکن جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے شروع ہی سے تصوف نے اخلاقی قدروں کے ساتھ زندگی کی اعلی اقدار کا سبق سکھایا تھا۔ چنانچہ عہد وسطیٰ میں دنیا سے بے رغبتی نے مشرق کو خوف وطمع کی آلائشوں سے پاک کر کے وہ عالی ہمتی دی تھی جس نے تسخیر حیات وکائنات کے روحانی در کھول دئے تھے۔ اس کے باوجود جب زوال کا یہ دور آیا تو یہی دنیا سے بیزاری، کم ہمتی اور فقدان سعی کا مہلک رجحان بن کر مکمل زوال آمادگی میں تبدیل ہوگئی۔ یہ رجحانات ہر مذہب کے لوگوں میں عام تھے۔ جس کی وجہ سے مادی دنیا اور اس کی ہر چیز بے حقیقت سمجھی جاتی تھی۔ نیز کم ہمتی اور مایوسی کا عالم دلوں میں گھر کر گیا تھا۔ قناعت نے کوشش کی صلاحیت پر غلبہ پا لیا تھا۔

اس کے علاوہ سیاست اور سلطنت کو دیکھیں تو جاگیر دارانہ نظام کی بنیادی طاقتیں زمین پر منحصر ہوتی تھیں۔ اقتصادی بنیادیں کاشتکاری کی رہین منت ہوتی تھیں۔ اور حرفت اس کے گرد گھومتی تھی۔ ایک فرد کا حکم عوام پر مسلط رہتا تھا۔ اچھے یا خراب طرز حکومت کا دارو مدار ایک فرد کی صلاحیت اور مزاج ورجحان پر ہوتا تھا۔ ایسے شاہی نظام میں عوام کو ہمیشہ شخصی مفاد اور آرام کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے مقابل جمہوری نظام میں اچھے برے کا فیصلہ جمہور کی رائے پر منحصر ہوتا ہے اور قوم کی ترقی اور خوبی کا مدار اس کی جمہوری صلاحیتوں یکساں رجحانات اور یک جہتی کی قوت میں مضمر ہوتا ہے۔ زمین کی اہمیت کے ساتھ تجارت، صنعت وحرفت اور برابر کے حقوق، اس نظام میں اہمیت رکھتے ہیں۔

انگریزوں کا لایا ہوا نظام اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ مگر اس نئے خاکہ پر یورپ میں بھی اس وقت سرمایہ داری کا سکہ چل رہا تھا۔ جس میں زر کی مخصوص تقسیم، افراط و تفریط کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ محنت عوام کا حصہ اور دولت سرمایہ دار کا ورثہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جاگیرداری کے مقابلے میں سرمایہ داری ایک ترقی یافتہ اور وسیع اقتصادی نظام پیش کر رہی تھی۔ یورپ میں سائنس کی نئی ایجادات ودریافت دستی صنعتوں کو ختم کر کے مشینی صنعت

کو فروغ دینے کا ذریعہ اور بڑے بڑے کارخانوں کی تعمیر کا وسیلہ بن رہی تھیں۔ اقتصادیات کی یہ نئی منزل سرمایہ داری کو مضبوط تر بنا رہی تھی۔ چنانچہ انگریزوں کے سیاسی تسلط کے ساتھ سرمایہ داری کے دھندلے نقوش یہاں بھی نظر آنے لگے تھے۔ انگریزوں کا سیاسی غلبہ جاگیرداروں کو ہضم کرتا اور جاگیرداری کی کمر توڑتا جا رہا تھا۔ اس وقت جاگیرداری کی جڑیں کمزور ہو رہی تھیں اور ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی بنیادیں بکھر کر رہ گئی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جب کہ قدیم قدریں تیزی سے منتشر ہو رہی تھیں اور نئی قدریں متعین نہ ہو سکی تھیں۔ علمی میدان میں ہمارے ملک کے ہزاروں سال کے کارنامے قابل فخر ضرور تھے ان کا دائرہ بہت وسیع سہی پھر بھی خاص حد بندیوں میں محدود تھا۔ اور آگے بڑھنے کی راہ مفقود تھی۔

مختصر یہ کہ سماجی شعور مکمل تقلید اور ماضی پرستی کا شکار ہو گیا تھا۔ ایجاد اور نئے علوم کی تلاش معدوم تھی۔ جس کے مقابلے میں مغربی سائنس اور نئی ایجادوں نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہی اسباب مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مکمل جواب اپنے اندر پوشیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ سیاسی، سماجی، اقتصادی اور علمی میدانوں میں یہ ٹکراؤ ہندوستان کی تاریخ کا اہم سنگ میل بن گئی اور وہ نشاۃ ثانیہ ظہور میں آیا جس کے اشارے تاریخ کے صفحات میں نظر آ چکے تھے۔ اس نے مغرب و مشرق کے امتزاج سے ایک نئے ہندوستان کو جنم دیا۔ ہندوستان کی تاریخ اب نئے سیاسی اصول و مسائل پیش کرنے لگی۔ قدیم شاہی دور اپنے تمام جاہ و حشم کے ساتھ تاریخ کی گرد راہ بن کر ختم ہونے لگا۔ ساتھ ہی ہندوستان سیاسی طور پر انگریزوں کا غلام ہوتا جاتا تھا۔ مشرق کی یہ شکست، صرف سیاسی شکست نہ تھی بلکہ ہر قدم پر مغرب کی سماجی اور معاشرتی، علمی اور اقتصادی، فوقیت کا اعلان تھی۔ مادیت اور روحانیت میں زبردست کشمکش کا مظاہرہ تھی۔ "ہمارا تمدن اور ہماری معاشرت ایک عرصہ سے عضو معطل اور بے جان ہو گئے تھے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا ہندوستانی نظام اور معاشرت و حکومت کی انتہا تھی۔ برخلاف اس کے اہل مغرب نشاۃ ثانیہ سے فیضیاب ہو کر نئی زندگی کے مالک ہو چکے تھے۔ جب ہندوستان ان سے دوچار ہوا تو معلوم ہوا کہ عرصہ دراز سے وہ نئے علوم و انکشافات سے کوسوں دور ہے۔ اس کی زندگی عہد ماضی کے بندھے ٹکے

اصولوں میں جکڑی ہے۔ جس میں فکر و شعور کے راستے گم ہوگئے ہیں۔ ۱

چنانچہ ہندوستانیوں کے لئے قدیم راہ کہنگی سے شکستہ اور مسدود تھی۔ لیکن جدید روش ابھی واضح نہ ہو پائی تھی جو نئی اور اجنبی بھی تھی۔ اس نئے سماج اور نئے ہندوستان کی تشکیل پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھرے اثرات مکمل انگریزی تسلط سے پہلے ہی مغربی علوم و سائنس اور انگریزی ادب کے ذریعہ اپنا نقش بنا چکے تھے "۱۸۱۸ء میں جب کہ مرہٹوں کی شوکت کا آفتاب مغرب کی طرف پونا میں غروب ہو رہا تھا نشاۃ ثانیہ کا سویرا اپنی جھلملاتی کرنوں کے ساتھ مشرق کی طرف کلکتہ میں رونما ہو رہا تھا"۔ ۲ جن حالات اور اسباب نے نئے زاویئے قائم کئے اور نئے ہندوستانی سماج کی تشکیل میں معاون ہوئے ان میں اولین انگریزوں کا سیاسی تسلط ہے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی انگریزوں کی وہ پہلی سیاسی جیت تھی جو بیک وقت ان کی تمام فتوحات کا پیش خیمہ، تخت مغلیہ کی بربادی کی پیشن گوئی، ہندوستان کی غلامی کا فیصلہ اور قدیم سماج کے منتشر ہونے کی داستان تھی، جس نے ہمارے تاریخی اوراق میں دردناک خونی افسانے بکھیر دیئے۔

انگریزوں کا سیاسی غلبہ مغرب کی فوقیت کے انکشاف کے ساتھ ہی انگریزوں کی شاطرانہ سازشوں اور عیاریوں کی مکمل کہانی بھی ہے۔ بنگال پر انگریزوں کے تسلط کی داستان انہیں میں سے ایک ہے۔ ایک انگریز مورخ زین لا ZEIN La لکھتا ہے۔" واٹس watts نے مرشدآباد میں جھوٹے وعدوں کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ نواب کے تمام افسروں یہاں تک کہ خواجہ سراؤں تک کو انگریزوں کا طرفدار بنا لیا تھا۔ میر جعفر کے ساتھ درلب رام، یار لطف خاں، جگت سیٹھ اور امی چند بھی غداری میں شریک تھے"۔ ۳ ان عیاریوں اور سازشوں میں ہندوستان کی عظیم دولت کو سمیٹنے کا لالچ بھی مضمر تھا، جو انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کی تکمیل کرتی ہیں۔ چنانچہ پلاسی کی جیت کے ساتھ کمپنی اور اس کے نوکروں پر دولت

۱۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر۔ از ڈاکٹر اعجاز حسین، ص ۲۶۱

2. History of Indian Social And Political Thoughts. By B. Majumdar. P.1

۳۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ از خورشید مصطفیٰ رضوی ص ۳۸-۳۹

کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اسی لاکھ روپیہ دریا کے راستے مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کیا گیا۔ چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوش حال ہو گیا تھا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ تجارت چمک اٹھی اور ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔" ۱۔ اس سیاسی جیت کے بعد انگریزوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ زرکشی کی انتہا نہ رہی۔ دولت کی اس ریل پیل نے حرص و آز کو ہوا دی۔ تجارت کا میدان ان کے لئے بالکل صاف ہو گیا اور یہ تنہا اس کے مالک کل ہو گئے۔ کمپنی کی زرکشی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ تقریباً بیس سال بعد مسٹر برک MR. BURK نے ہیسٹنگز Hastings کے مقدمہ کے دوران اس کل رقم کا جو اس وقت تک انگلستان پہنچ چکی تھی چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا۔ ۲

اس طرح انھوں نے سیاست کو تجارت کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ جیسے جیسے تجارت چمکی مقبوضات کی توسیع کی خواہش بڑھی اور جیوں جیوں مقبوضات کی توسیع ہوئی بے اندازہ دولت پر قبضہ ہوا نیز تجارت کی راہ کھلی۔ انہیں وجوہات سے انگریزوں کی نظر حریصانہ مقبوضات کی توسیع کے لئے مستقل طور پر جم گئی اور وہ یہاں کے زوال یافتہ اور خانہ جنگی کے دور میں اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستانی سیاست میں ایک اہم رول ادا کرنے لگے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ میسور، حیدرآباد، اودھ اور پنجاب سب ہی انگریزی سامراج کی سازشوں کا نشانہ بنے۔ ہر نئے قبضہ کے لئے وہ کوئی جائز و ناجائز شاطرانہ حیلے اور وسیلے نہیں چھوڑتے تھے جن کے بل بوتے پر بازی جیتتے جاتے تھے۔ ۱۷۷۹ء میں نانا فرنویس، حیدر علی، نظام اور دوسری مرہٹہ ریاستیں متحد ہو گئیں تو ہیسٹنگز Hastings نے جمنا جی اپا کو سوا لاکھ روپیہ دے کر معاہدہ سے الگ کر دیا۔ حیدر علی جب کئی کئی بار نہایت بہادری سے مقابلہ پر آمادہ رہا تو سازشوں کے یہ جال میر صادق اور پورنیا کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اس طرح میسور فتح کر کے انگریز جنرل خوشی سے چلا اٹھا کہ آج ہندوستان ہمارا ہے۔

۱۔ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، از طفیل احمد منگلوری ص ۵۳

۲۔ " " " " " " ص ۵۹

حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں تخت مغلیہ کا آخری ٹمٹماتا چراغ بھی گل ہو گیا۔

اس سے قبل کہ انگریزی فتوحات کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کی وسعت اور اسباب و ذرائع پر غور کیا جائے یہ ضروری ہے کہ انگریزی تسلط کے ساتھ مغلوں کے آخری زمانہ میں جو ہنگامی دور گزرا ہے اور اس کے رد عمل میں جو مخالف تحریکیں ابھریں ان کے رجحانات اور رخ کو سمجھ لیا جائے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں اٹھارہویں صدی میں ہی جو تحریک ابھری اس میں ایک بات قابل غور رہی ہے کہ اس کے اثرات صرف مسلمانوں تک محدود رہے۔ بنگال میں انگریزی ورود کے بعد ہی ہندوستان میں جو زبردست سیاسی اور مذہبی تحریک ملی جلی صورت میں رونما ہوئی وہ شاہ ولی اللہ کی تحریک تھی۔ یہ تحریک بنیادی طور پر بہت خصوصیتوں کی حامل تھی جس کے اثرات دو صدیوں تک مسلمانوں میں بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ سید احمد شہید بریلوی کی سیاسی تحریک بنگال کی باغی فرائضی تحریک، فرنٹیئر کی طرف ستھانا کے باغیانہ کیمپ اور ان کی شعلہ صفت سرگرمیاں، تمام باغیانہ فتوے اور مذہبی علماء کے تعلیمی مراکز انگریزوں کے خلاف زبردست اور سرگرم محاذ تھے جو دراصل ولی اللّٰہی تحریک کے زیر اثر ظہور میں آئے تھے۔

شاہ ولی اللہ نے نظام حکومت اور اقتصادیات کا جو خاکہ پیش کیا تھا وہ حیرت انگیز طور پر نیا اور جمہوری تھا۔ ان کا سیاسی مقصد بیرونی طاقت کے خلاف ہندوستانی مرکز کو مضبوط کرنا اور وطن کو آزاد رکھنا تھا، مگر طرز عمل خالص مذہبی رنگ کا تھا۔ وہ اسلامی نظریات کو ایسے تمام مسائل کا دائمی علاج تصور کرتے تھے۔ اس لئے اس تحریک کے تمام نظریات مذہب کے زیر اثر اور اس کی حدود میں تھے۔ اور اس کے زیر اثر تمام تحریکیں بھی اسی رنگ میں تھیں۔ ان تحریکوں کو ہم قدیم تحریکوں سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ قدیم سماج کا رشتہ مذہب سے اتنا گہرا تھا کہ ہر دو کو الگ کر کے دیکھنا اور برتنا ناممکن تھا۔

پھر ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید کے ذریعہ مسلمانوں میں وہ نئی تحریک ابھری جس میں نشاۃ ثانیہ اور مغرب کے اثرات بہت واضح تھے۔ یہ تحریک مغربی اثرات کو قبول کر کے نئی روش بنانے اور زمانے کی آواز پر ترقی کی نئی دوڑ میں تیزی سے آگے

بڑھنے کی زبردست کوشش تھی۔ اس وقت مسلمان سیاسی اور سماجی زوال کی پوری زد میں تھے۔ قدیم سیاسی حالات کے پیش نظر انگریزوں کی طرف سے ان کی تلخی عروج پر تھی۔ وہ مغرب کی لائی ہوئی ہر چیز سے نفرت اور گریز کرتے تھے۔ اس لئے نئی ترقی کی تمام راہیں ان پر بند ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں غدر میں مسلمانوں کی مکمل سیاسی و سماجی بربادی کے ساتھ اتنی مشکلات حائل ہو گئی تھیں اور ہندوستان کی سیاسی و سماجی فضا انگریزی دباؤ کے زیر اثر کچھ ایسی مخصوص صورت اختیار کر رہی تھی کہ سرسید کی اس نئی تحریک کو اپنی تمام خوبیوں، وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ پنپنے اور پھلنے پھولنے کے لئے یہ ہوا ناسازگار تھی۔ پھر بھی زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے میں اس نے بہت بڑا کام کیا۔

دوسری طرف دیکھیں تو اٹھارہویں صدی کے آخر میں بنگال میں نئے مغربی اثرات تیزی سے ظہور میں آ رہے تھے جس کے زیر اثر انیسویں صدی کی ابتدا میں وہ وسیع سوشل اور مذہبی ملی جلی تحریک رونما ہوئی جو راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں پھیلتی گئی۔ سوشل اصلاح کے ساتھ ہندو مذہب میں اصلاحی سلسلہ بھی مشترک صورت میں چلتا رہا۔ یہ تحریک نشاۃ ثانیہ کے مکمل اثرات کی حامل اور قدیم کے خلاف جدیدیت کی علمبردار تھی۔ نئی مغربی تعلیم کے ساتھ جیسے جیسے یہ تحریک مضبوط ہوتی گئی ویدوں اور اپنشدوں کی اصلی تعلیم اور مذہب کی روح کو اپنانے کی کوششیں اجاگر ہوئیں۔ باوجود مغرب پسندی کے مذہبی رسومات پر تنقیدیں ماضی کی عظیم روحانی شوکت کی نشاندہی کر کے ایک مضبوط قومی جذبہ بیدار کرنے میں معاون ہوئیں۔ گویا نئی تعلیم اور مذہب سے اس نئی جانکاری نے انہیں پیچھے نہیں کھینچا بلکہ آگے بڑھایا۔ چنانچہ برہمو سماج اور بعد کی رام کرشنا مشن اور آریہ سماج وغیرہ وہ مذہبی تحریکیں تھیں جنہوں نے مذہبی اصلاح کے ساتھ مذہب کے بنیادی اصولوں اور قدیم ہندو نظریات کی توضیح بھی کی اور اس طرح وہ قومی جذبہ بیدار کیا جو "نیو ہندوازم" کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ راجہ رام موہن رائے کی تحریک مغرب کی فوقیت کو مان کر اس کے متعارف کردہ تمام بنیادی اصولوں کو اپناتے ہوئے مکمل انگریز دوستی اور انگریز وفاداری کے ساتھ نئے سماج کی تشکیل میں کوشاں ہوئی اور یہی تحریک

ہندوستان میں جدیدیت اور مغربیت کی اولین علمبردار تھی۔

تقریباً نصف صدی کے اندر اس کا یہ اثر ہوا کہ نئی تعلیم اور مذہبی اصلاح کے قومی جذبہ کے ساتھ نئی سیاسی بیداری کا احساس نشو ونما پانے لگا۔ جس کے خدوخال مغربی اصولوں پر بنے تھے، یہ نئی سیاسی تحریک جسے انگریزوں کی مخالفت میں ہی اپنے سیاسی مفاد نظر آنے لگے، اس وقت ظہور میں آئی جب مسلمانوں میں مکمل تباہی و بربادی کے احساس کے ساتھ سرسید کے ذریعہ جدیدیت اور مغربیت کا چرچا شروع ہوا تھا، جسے اب انگریزوں سے مصالحانہ اور دوستانہ برتاؤ کے بغیر حاصل کرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کے سیاسی تسلط نے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مختلف صورتوں اور حالتوں کے ساتھ مختلف اثرات ڈالے جس سے مختلف نوعیت کے نتائج برآمد ہوئے۔ یقیناً نشاۃ ثانیہ کے اثرات نے ان کے درمیان مختلف زمانوں میں راہ بنائی۔ اس طرح انگریزوں کے ورود کے ساتھ ان کی سوجھ بوجھ اور سماجی صورت حال ایک ہی زمانے میں اتنی مختلف نظر آنے لگی جو پہلے کبھی نہ تھی۔ مشترکہ کلچر کے زیر اثر وہ قومی یکسانیت جو صدیوں کی تاریخی دوڑ میں تشکیل پاتے ہوئے تکمیل کی حدود میں قدم بڑھا رہی تھی انگریزوں کی آمد کے ساتھ ان کی مصلحت اندیشیوں اور تاریخی جبر و تشدد کا شکار ہو گئی۔ چونکہ بنگال کی یہ تحریکیں اور سرسید کی تحریک مغربی اثرات اور نئے زمانے سے وابستہ ہیں اس لئے ان کی تفصیل اگلے ابواب میں آئے گی۔ یہاں صرف حضرت شاہ ولی اللہ کی اس عظیم سیاسی و مذہبی تحریک کا ذکر مناسب ہے جس کے اپنے اقتصادی نظریات جدید اور سیاسی مقاصد اعلیٰ تھے۔ پھر بھی ہم اسے قدیم تحریک سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ تحریک قدیم ہندوستان میں قدیم طرز پر اور مذہبی رنگ میں پھلی پھولی۔

یہ زمانہ قدیم و جدید کی کشمکش کا زمانہ تھا جس میں دونوں کے اثرات مختلف روپ میں نظر آتے ہیں۔ لہٰذا سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہندوستان کی سوشل سماجی اور اقتصادی صورت حال میں جو عظیم تبدیلیاں وجود میں آنے والی تھیں اس کی نشاندہی شروع ہو چکی تھی اور عام ملکی و سماجی بے چینیوں اور کشمکش میں ان کا نمایاں ہاتھ تھا۔ جس زمانہ میں بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا، مسلمانوں میں حکومت کی زوال پذیری کے نتیجہ میں ایک بے چین جذبہ ابھر رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ

کی تحریک مغلیہ ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کی وہ اولین تحریک تھی جس نے تقریباً دو صدیوں تک اپنے گہرے اثرات دکھائے۔ اس تحریک کے نظریات میں بہت وسعت اور گہرائی تھی جو مذہبی اصلاح کے ساتھ سوشل تنظیم چاہتی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ جب تک سماج میں عام انسانی اور اعلیٰ روحانی جذبات نہ غالب ہوں جن سے ایثار و قربانی، محبت و خدمت، کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور انسانیت کی تشکیل کرتے ہیں، سماجی ترقی غیر ممکن ہے۔ تعلیم و تربیت اور روشن خیالی تمام ترقیوں کا مخزن ہے نیز اقتصادی خوشحالی، مضبوط حکومت اور عمدہ سماج کا اہم جز ہے۔ ایک اعلیٰ اور ترقی پذیر سماج کے لئے اس کے بغیر آزادی قائم رکھنا غیر ممکن ہے۔ اس طرح ان تمام چیزوں کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ یہ تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، معاشی بھی اور ادبی بھی، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں میں سچا مذہبی جذبہ باقی نہیں رہا ہے جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے۔ اس جذبہ کو وہ خدا پرستی اور تربیت نفس کے ذریعہ ابھارنا چاہتے تھے۔ اس کا سیاسی مقصد بھی تھا اور وہ یہ کہ ملک کو انگریزوں سے پاک کرکے ایک جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ وہ سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی نظام میں بھی تبدیلی چاہتے تھے۔ ۱

اس تحریک کی بے لوث قربانیوں اور آزادی کی جہد کا سب کو اعتراف ہے۔ مگر قدیم دور میں سیاست کو مذہب سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ مذہب کا غلبہ سوشل زندگی پر بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سیاسی تحریک مذہبی رنگ اور مذہبی طرز کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے رخ سے اگر مذہب کی نقاب اٹھادی جائے تو ابتدا ہی سے یہ غیر ملکی حکمرانوں کے معاشی استحصال کے خلاف بغاوت کا اظہار نظر آتی ہے۔ وہابیوں کی وحدانیت اور مساوات کی تعلیم کے زیر اثر بنگال کے مسلمان کسانوں اور کاریگروں میں مذہبی بیداری ہی نہیں سیاسی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ ۲

۱۔ کلاسکی ادب از خواجہ احمد فاروقی در مضمون " جنگ آزادی میں اردو کا حصہ " ص ۲۱

۲۔ حالی کا سیاسی شعور از معین احسن جذبی۔ ص ۴۴۔ ۴۵

شاہ ولی اللہ کی شخصیت ہندوستان کی بزرگ مذہبی ہستیوں میں سے تھی۔ ان کے پیروؤں میں زیادہ تر بڑے بڑے مذہبی علماء شامل تھے جن کی تمام عملی کارروائیاں خانقاہ کی گوشہ نشینی میں انجام پاتی تھیں۔ اسی سبب سے ان کے ہم عصر، غیر مذہب صحیح طور پر اس تحریک کے عظیم سیاسی مقاصد اور جدید ترین بنیادی خیالات سے بے خبر رہے۔

شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کی اساس کوئی اور ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی، وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ ان کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا۔ چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ لیکن ان کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں اس کی روح پر تھا۔" ۱ وہ مذہبی زوال پذیری کو سماجی اور سیاسی زوال کا ایک بڑا سبب جانتے تھے۔ لہذا اسکی اصلاح کے لئے انہوں نے مذہبی عقائد و خیالات کو ضروری سمجھا۔ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کی تصحیح قرآن کریم اور احادیث نبوی کی وضاحت سے کر کے اسلام کی روح پیش کرنے کی کوشش کی۔ قدیم طرز پر درس و تدریس کا سلسلہ اس امر کے لئے قائم جاری رکھا۔ مذہب کی توضیح و تشریح نئے طرز سے کرتے رہے اور صحت مند اور اعلیٰ مذہبی تصانیف کا ذخیرہ تیار کر لیا۔ ان کی تحریریں عام طور پر عربی و فارسی زبانوں میں تھیں کیونکہ اس زمانے کے مذہبی علماء انھیں زبانوں کو استعمال کرتے تھے۔ انھیں علماء اور امراء کی اصلاح خصوصی مقصود تھی کیونکہ عوام انھیں لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور گہرے مذہبی نکات خود سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ان کے خیالات و تصانیف عام لوگوں کی نظروں سے بہت کم گزرے۔

مذہبی اصلاح سے ان کا مطلب سماج میں اعلیٰ روحانی قدروں کو بیدار کرنا تھا۔ وہ مذاہب عالم کے بنیادی اور روحانی اصولوں کے ساتھ انسانیت کی تعمیر چاہتے تھے جس کا اندازہ ان اصولوں سے ہو سکتا ہے " دین اور سچائی ایک ہیں۔ داعیان

۱۔ مولانا محمد سرور بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی ص ۲۱

صداقت ہر ملک و قوم میں گزرے ہیں ان سب کا احترام لازمی ہے۔ سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں مثلاً خدا کی عبادت، صدقہ خیرات نذر و نیاز، روزہ و برت وغیرہ، یہ کام سب کے نزدیک اچھے ہیں البتہ علمی صورتوں میں فرق ہے۔ تمام اصول مذہب اور دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشا مقصد ایک ہے۔ جیسے اخلاقی جرائم ہر مذہب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ مردہ کی تذلیل تو ہیں سب کے نزدیک جرم ہے " ۱ ان کے مذہبی خیالات کی یہ وسعت ایک عظیم انسانی برادری اور اعلیٰ سماج کی تشکیل کی خواہاں ہے۔ (فٹ نوٹ نمبر ۲) - ۲

اس مذہبی دائرے سے قطع نظر ان کے سیاسی مقاصد پر غور کریں اور ان کے پیش کردہ سماجی خاکے کو دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ نظریات کتنے زیادہ ترقی پسندانہ ہیں جو اس جاگیردارانہ اور شاہی دور میں جمہوریت اور عوامی فلاح کی آواز اٹھاتے ہیں۔ نیز یہ محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر اس کا منشا سیاسی و سماجی اصلاح تھا اور یہ تحریک خالص مذہبی نہیں بلکہ ہمہ گیر ملکی و انقلابی تحریک بھی تھی۔ رتن لال بنسل نے لکھا ہے۔
بدیسی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندوستان کو بچانے کے لئے شاہ ولی اللہ زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے وارثوں، بیٹوں، ناتیوں اور ہزاروں شاگردوں کے دل میں ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انہوں نے مرجانا پسند کیا پر ہندوستان کی غلامی کو چپ چاپ برداشت نہیں کیا " ۳

حکومت مغلیہ کے زوال کا سبب وہ اقتصادی بدنظمی جانتے تھے۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہیں ہوتا اس میں ہر طرح کی خرابیاں پھیل جاتی ہیں۔ انصاف ختم ہو جاتا ہے اور مذہب بھی غیر مفید معلوم ہونے لگتا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کے خیال میں، مذہب سے غفلت اور علوم دینیہ سے لاعلمی تھی۔ اس سلسلہ میں اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

۱۔ بحوالہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود، غیر مطبوعہ مسودہ، ص ۱۳
اور علمائے ہند کا شاندار ماضی مصنفہ مولانا محمد میاں، جلد ۲۔ ص ۱۱-۱۲
۲۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۲ باب اول) ص ۳۰۹
۳۔ بحوالہ کلاسکی ادب از خواجہ احمد فاروقی ص ۲۲

"اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہی تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد حکمراں جماعت کا آرام و آسائش و زینت و تفاخر کا شعار کاریگر طبقہ پر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں۔ جب کہ کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو انسانیت کو نجات دلانے کے لئے قدرت الٰہیہ انقلابات کا سامان پیدا کر دیتی ہے"۔ا۔ یہ سیاسی و اقتصادی نظریات دراصل جمہوریت کی آواز تھے۔ شہنشاہیت کی خامیوں پر غور کر کے انھوں نے اسباب مرض بھی تلاش کئے اور اس کے لئے وہ نسخہ بھی تجویز کیا جو عوام کو جمہوریت کے سبق سے آشنا کرنا تھا۔

شاہ صاحب کی تصنیفات خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے انقلابی نظریات اسی اقتصادی نظام کی وضاحت کرتے ہیں جس کو آج سوشلزم کی بنیاد کہا جا سکتا ہے مگر بنیادی فرق یہ ہے کہ کمیونزم جن اقتصادی بنیادوں کا سماجی خاکہ پیش کرتا ہے وہ مذہب سے بیگانہ ہیں۔ شاہ ولی اللہ انھیں بنیادی خیالات کو مذہب اور اخلاق کی روح بتاتے ہیں۔ اور ان اصولوں کو انسانی سماج کی فلاح کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ جن اقتصادی نظریات پر سماج کا ڈھانچہ بنانا چاہتے ہیں اور محنت و سرمایہ کی جو تقسیم پیش کرتے ہیں اس میں وہ روحانی اور اخلاقی قدریں بھی اجاگر ہوتی ہیں جو انقلاب روس میں نظر نہیں آتیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ نے ۱۷۶۳ء میں وفات پائی اور کارل مارکس Karl Marx ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔

شاہ صاحب اس خاکہ کو اسلام و قرآن کریم سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ اقتصادی نظریات کے ساتھ نظام حکومت کے بنیادی اصول نیز ہر شہری کے بنیادی حقوق کی

ا۔ بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی ۔ ص ۱۱ اور شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک مصنفہ مولانا عبید اللہ سندھی ۔ ص ۲۲

تشریح کرتے ہیں۔ مثلاً "دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ محنت کش طبقہ دولت کا مستحق ہے۔ بغیر ملک کے لئے کام کئے ملک کی دولت میں کوئی حق و حصہ نہیں۔ جو نظام دولت کی تقسیم کو کسی خاص طبقہ میں محدود کر دے وہ تباہ کن ہے۔ زمین کا حقیقی مالک خدا ہے بظاہر اسٹیٹ۔ سب انسان برابر ہیں۔ روٹی، کپڑا، مکان اور اتنی استطاعت کہ خاندان کا بار اچھی طرح اٹھا سکے ہر انسان کا پیدائشی حق ہے!" یہ نہایت اہم اور اور قابل توجہ بات ہے کہ انقلاب فرانس سے بھی نصف صدی قبل شاہ ولی اللہ نے سیاست اور حکومت کا وہ خاکہ پیش کیا تھا جسے صحیح معنوں میں نئے زمانہ اور انقلابی روح سے وابستہ کہا جا سکتا ہے۔ آج فرانس کا انقلاب دور جدید کے لئے نشان راہ کہا جاتا ہے مگر شاہ ولی اللہ کا یہ اقتصادی اور سیاسی خاکہ ہمارے ملک نے صدیوں قبل پیش کیا جو حیرت انگیز طور پر قدیم دور میں نئے زمانہ کا چراغ نظر آتا ہے۔

یقیناً ہندوستان میں شہنشاہیت کے خلاف پہلی آواز حضرت شاہ ولی اللہ کی تھی مگر خالص مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کی اہمیت سے بے خبر رہے اور اسے عظیم ملکی اور انقلابی تحریک سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ لیکن مذہبی رنگ کے باوجود انھوں نے جس حصول مقصد کو اپنا مرکزی فکر و عمل بنایا وہ صرف مسلمانوں سے متعلق نہ تھا، بلکہ ملک وعوام کے فائدے کے لئے تھا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ شہنشاہیت کے خلاف انھوں نے آواز اٹھائی محنت اور سرمایہ کی یک طرفہ تقسیم کو ناجائز قرار دیا، مزدوروں اور محنت کش طبقہ کی مناسب اجرت اور سماج میں ان کے برابری کے حقوق پر زور دیا۔ تمام مذاہب کے احترام اور سب کی بنیادی یکسانیت پر توجہ دلائی۔ ان میں سے کوئی بھی چیز صرف مسلمانوں کے لئے نہیں تھی بلکہ ان سب سے عام ملکی اور قومی فائدہ منصور ہوتا تھا۔ یہی چیزیں آج کل جمہوریت کے لئے

۱۔ بحوالہ تحریک آزادیٔ ہند میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود غیر مطبوعہ مسودہ ص ۱ تا ۹ و ۱۳ اور علمائے ہند کا شاندار ماضی مصنفہ مولانا سید محمد میاں۔ جلد ۲۔ ص ۸ تا ۱۱

باعث فخر ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل یہ پیغام سنایا تھا اور اپنی تحریک میں ان اہم نظریات کو بنیادی اجزاء بنا کر شامل کیا تھا۔ اس روشنی میں ان کی عملی مصروفیات کو دیکھیں تو ان کی پرخلوص خدمت اور عزم اور اعلیٰ صلاحیت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا صحیح تجزیہ کیا اور اسی پس منظر میں ایسے اصول مرتب کئے جو صنعتی طبقے کی غلامانہ ذہنیت کو دور کر کے اسے جاگیرداروں کے مقابلے میں ابھار سکیں "[1] ان کے سامنے جو سیاسی اور مذہبی مسلک تھا اس کے دو حصے ہیں۔ ایک تو مسلمانوں میں مذہبی روح بیدار کر کے مذہب کی اصل بنیادوں کو اجاگر کر دینا۔ دوسرے سیاسی آزادی برقرار رکھنے کے لئے مرکز کو مضبوط کرنے کی کوشش۔ علاوہ ازیں ان اقتصادی نظریات کی اشاعت جو جمہوریت کا خاکہ بناتے اور ایک صحت مند سماج کی تعمیر کرتے ہیں۔ عملی اور نظری طور پر یہ دونوں چیزیں ان کے یہاں ایک دوسرے سے پیوستہ نظر آتی ہیں۔

مذہبی روح بیدار کرنے کے لئے انھوں نے نئے طرز سے پہلی بار قرآن شریف اور احادیث کی تشریح اور مذہب کے بنیادی اصولوں کی توضیح کا سلسلہ جاری کیا۔ درس و تدریس، تعلیم و تلقین، اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ تاعمر قائم رکھا۔ اس کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں سہیں مگر عملی کوششوں سے منہ نہ موڑا۔ وہ کہتے تھے کہ اسلام کی مکمل روح بین الاقوامیت اور انسانی برادری کی تشکیل میں ہے۔ جس میں سب کو مساویانہ حقوق حاصل ہوں نیز اتفاق و اتحاد اور محبت کی فضا کے ساتھ نفع بخش انسانی سماج کی تعمیر ہو۔ خود ان کا اولین سیاسی قدم مرکز کو مضبوط کرنے کی کوشش تھی۔ وہ حکام ریاست و امراء کو ان کی سیاسی کمزوریوں سے آگاہ کرتے اور اس کے دفعیہ کا علاج پیش کرتے۔ ملکی امن اور مرکز کی تنظیم کے لئے اتحاد و اتفاق اور بہادرانہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ شاہ صاحب کو مغلوں کی حکومت سے سنبھل جانے کی

۱۔ حالی کا سیاسی شعور از معین احسن جذبی۔ ص ۳۷

کوئی امید نہ تھی۔ نہ یہ ان کی خواہش تھی اور نہ وہ اسے پسند کرتے تھے۔ ہاں البتہ وہ اس کے زوال کو اس وقت تک کے لئے روک دینا چاہتے تھے جب تک اس کا کوئی نعم البدل نہ مل جائے۔ ان کے خیال میں نظام حکومت کا بہترین نمونہ خلافت راشدہ تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں میں اتحاد و اتفاق ہو اور وہ خوش حالی و فارغ البالی کی طرف قدم بڑھائیں۔" ۱ بادشاہ کے نام اپنے ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں۔" جاگیر کا علاقہ بڑھا دینے سے مرکزی حکومت کے استحکام میں فرق آجاتا ہے۔ سلطنت کے اجزا میں نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار قائم نہیں رہ سکتا۔ مرکزی حکومت جاگیرداروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔" ۲

غرض حتی الامکان وہ اس مقصد کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہے کہ دیسی طاقتیں متحد ہو کر بدیسی طاقت کو کمزور کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ساتھ ہی خانقاہ کی گوشہ نشینی میں تزکیۂ نفس اور تربیت ذہن کا وہ زبردست کام انجام دیا جس کا اثر بہت گہرا تھا۔ ان کے زیر تربیت ایسے بیدار ذہن، بے لوث خدام خلق اور باصلاحیت و اولوالعزم اشخاص پیدا ہو گئے جو ڈیڑھ صدی تک انگریزوں کے خلاف باغی سیاسی تحریکوں کی قیادت کرتے رہے۔ جنھوں نے عوام میں سچا مذہبی جذبہ بیدار کر کے ہزاروں کو باغی تحریکوں میں شامل کر لیا۔ یہ شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا اثر تھا کہ ایسی زبردست باغی تحریکیں وجود میں آئیں اور ایسا گروہ تیار ہو گیا جو ملک و قوم، مذہب و وطن کی بے لوث خدمت پر کمربستہ تھا جن میں آزادیٔ وطن کے لئے ہر ممکن قربانی کا جذبہ مشتعل تھا۔ یہی وہ گروہ ہے جس نے سرحد سے بنگال تک تمام شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف گویا آگ لگا دی۔ اس گروہ کے تمام سربرآوردہ اور خاص حضرات شاہ ولی اللہ اور ان کے شاگردان خاص کے تربیت یافتہ اور تعلیم کردہ

۱۔ در تقریب شیخ عبدالرشید بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ خلیق احمد نظامی۔

۲۔ مکتوب اول بنام بادشاہ و وزیر و امراء" از شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ خلیق احمد نظامی۔ ص ۹۲

تھے۔ ایسا مکمل اور ہمہ گیر انقلاب جو سماج کے معاشی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کو بدل دے فوجی سپاہیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ ان سرفروشان وطن کے ذریعہ عمل میں لایا جاسکتا تھا جو پہلے تحریک کے مقاصد کو سمجھ لیں اور پھر جان کی بازی لگا دینا ان کی زندگی کا مقصد ہو جائے۔ تحریک کے پہلے صد سالہ دور ۱۷۳۱ء تا ۱۸۳۱ء میں انھوں نے ایثار و قربانی کی لاجواب مثالیں قائم کیں۔ تحریک کے دوسرے دور ۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۱ء انھوں نے آزادی وطن کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کوئی بھی محب وطن گروہ کر سکتا تھا۔[۱]

انیسویں صدی کے پہلے پچیس سالوں میں تقریباً تمام چھوٹی بڑی طاقتیں انگریزی اقتدار کے نیچے دب چکی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر تسلط کے بعد بھی کمپنی نے بادشاہ کو باقی رکھا مگر اختیارات اپنے تسلیم کرا لئے۔ مشہور تھا کہ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، اور حکم کمپنی بہادر کا۔[۲] اس ہنگامی دور میں شاہ ولی اللہ کا تربیت یافتہ گروہ مستقل جنگ آزادی کے لئے برسرپیکار رہا، جس نے باغی بن کر جان کی بازی لگا دی اور مجرم کی حیثیت سے سیکڑوں سزائیں اور مصیبتیں جھیلیں مگر انگریزی سامراج کے سامنے سر نہ جھکایا۔ ان تحریکوں نے وہ خطرناک انقلابی روح بیدار کر دی جو انگریزوں کو مستقل کھٹکنے لگی اور جس کے لئے ہنٹر HUNTER کو کہنا پڑا "مسلمانان ہند ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے لئے سالہا سال سے ایک مستقل خطرہ تھے اور ہیں"[۳] چنانچہ مایوسیوں اور زوال کے بعد اس دور میں شاہ ولی اللہ کے شاگرد خاص شاہ عبدالعزیز نے جو بوڑھے اور نابینا تھے انقلاب کا مکمل عملی پروگرام بنایا۔" او میلے کے بقول ان کا اثر سب سے زیادہ گہرا اور دیرپا تھا اور آج تک قائم ہے۔[۴]

سید احمد شہید کی تربیت خود شاہ عبدالعزیز نے کی تھی انھوں نے سید احمد

۱۔ تحریک آزادی ہند میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود، غیر مطبوعہ مسودہ ص ۴۴

۲۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی از محمد میاں ص ۸۴ (جلد ۲)

3. The Indian Musalmans — By W.W. Hunter P. 11

4. Modern India And The West — By O'Malley P. 394

شہید کو امیر خاں نواب ٹونک کے یہاں بھیجا جہاں وہ لشکر میں چھ سال تک رہے۔ امیر خاں نے جب انگریزوں سے صلح کرنی چاہی تو سید صاحب نے اس کی مخالفت کی۔ صلح کے بعد انہوں نے شاہ عبدالعزیز کو ایک خط لکھا۔ "خاکسار اب قدمبوسی کو حاضر ہوتا ہے لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ نواب انگریزوں سے مل گئے اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔" ا سید احمد شہید کی جماعت نے تمام ہندوستان اور بیرون ملک کے دورے کئے۔ یہ لوگ جگہ جگہ قیام کرتے تقریر و مواعظ سے بیداری اور جذبۂ سرفروشی پیدا کرتے، حتیٰ کہ ہزاروں کی تعداد میں سرفروشان وطن اپنے گھر بار چھوڑ کر اس لشکر میں شامل ہوتے گئے۔ جو ساتھ نہ ہوئے وہ بھی اس تحریک کے ہمدرد بن گئے۔ اور اس کی ہر ممکن مدد میں حصہ لینے لگے۔ ہنٹر لکھتا ہے "ان لوگوں نے ایک ایسی جماعت تیار کی ہے جو باقاعدہ روپیہ اور فوج بنگال سے جمع کر کے منزل بہ منزل ہماری شاہراہ سے باغی کیمپ میں دو ہزار میل کی دوری پر مستقل طور سے بھیجتی رہتی ہے بہت ہی ذہین اور صاحب استطاعت لوگ اس سازشی مہم میں مشغول ہیں اور ان کے ہنرمندانہ طریقۂ ترسیل نے ایک بہت ہی خطرناک سازشی مہم کو نہایت محفوظ طریقۂ پلاننگ میں تبدیل کر دیا ہے۔" ۲

ان مجاہدان وطن کو نہ تو حکومت کی خواہش تھی نہ زر و آسائش کی تمنا وہ جو کچھ کر رہے تھے صرف آزادی وطن کی خاطر۔ چنانچہ سید احمد شہید بریلوی نے ہندوراؤ، وزیر گوالیار کو جو خط لکھا تھا وہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے۔

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ بیگانے اور اجنبی جو وطن عزیز سے بہت دور کے رہنے والے ہیں دنیا جہان کے بادشاہ بن گئے ہیں۔ اور سودا بیچنے والے دوکاندار بادشاہت کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کے لئے کھڑی ہو گئی ہے یہ لوگ جاہ طلب اور دنیادار

۱۔ تحریک آزادی ہند میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود، غیر مطبوعہ مسودہ ص ۱۶
اور سید احمد شہید از غلام رسول مہر۔ ص ۱۱۱ (جلد اول)

2. The Indian Musalmans —— By W.W. Hunter P. 9

نہیں ہیں۔ بلکہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کے لئے اٹھے ہیں۔ مال و دولت کا کوئی لالچ نہیں۔ جس وقت ہندوستان کا کارزار غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائیگا اور ہماری کوششوں کا تیر، مراد کے نشانے کو پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے۔ مسند حکومت ان کو مبارک ہو۔" ۱ نیز گوالیار کے ایک عہدہ دار غلام حیدر خاں کو لکھتے ہیں۔ "آپ ہندوراؤ کو یہ بات سمجھائیں کہ ہندوستان کا بہت بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں پہنچ گیا ہے۔ ان لوگوں نے ہر جگہ ظلم و جبر کی بنیاد قائم کر دی ہے۔ فی الحال ان کمزور فداکاروں کی امداد میں پوری کوشش کریں اور اس کو خود اپنی حکومت کی مضبوطی کا ذریعہ سمجھیں۔" ۲ ان اقتباسات کے ہر جملے سے صاف ظاہر ہے کہ ان مجاہدین وطن کو اقتدار کی خواہش نہیں ہے صرف آزادی وطن ان کا مقصود ہے۔

یہ لوگ سرحد کو اپنا مرکز بنا کر سرحدی پٹھانوں اور افغانوں کو ملا کر انگریزوں کے خلاف مضبوط محاذ بنانا چاہتے تھے۔ اس مرکز کے لئے درمیان میں سکھ حکومت تھی جو انگریزوں کو دوست تھی چنانچہ اسے راہ سے ہٹانا لازی تھا۔ (نوٹ) ۳ ہنٹر Hunter لکھتا ہے "خود باغیوں سے ہم کو وہ خطرہ نہیں جتنا ان بغاوت انگیز عوام سے جو ہماری سلطنت کے اندر موجود ہیں اور ان سرحد کے توہم پرست قبائل سے جنھیں متعصب باغی بار بار ایک مذہبی جوش میں ہمارے خلاف متحد کرتے ہیں۔" ۴ اس مقصد میں انھیں عارضی کامیابی بھی ہوئی مگر انگریزی سازشوں اور ملکی خانہ جنگیوں نے کامیاب ہونے کا موقع نہ دیا۔

انگریزوں نے اس تحریک کو کچھ اس ڈھنگ سے مشہور کیا جس میں جہاد و قتال اور دوسروں سے نفرت کے علاوہ کچھ نہ ہو وہ اس مبالغہ آمیزی میں پوری طرح کامیاب

۱۔ بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی از محمد میاں۔ ص ۲۲۸ تا ۲۲۰ (جلد ۲)

۲۔ " " " " " " ص ۲۲۰ تا ۲۲۱ (" ")

۳۔ نوٹ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں علمائے ہند کا شاندار ماضی از محمد میاں۔

4. The Indian Musalmans — By W.W. Hunter. P. 43

ہوئے۔ انہوں نے اس کی وہابیت پر اس قدر زور دیا کہ سرحد کے قبائلی پٹھان بھی ان لوگوں کے خلاف ہو گئے اور آخر کار بالاکوٹ اور ستھانا کے محاذوں میں خود پٹھانوں کے ذریعہ شب خون مار کر تقریباً سارے لشکر کا خاتمہ کر دیا گیا۔ بالاکوٹ میں پٹھانوں کے ہاتھوں غداری کے ساتھ یہ قتل عام ہوا۔ کیونکہ کاٹن cotton نے عثمان زئی کے پٹھانوں کو مجاہدین سے الگ کر لیا تھا۔ راجہ رام راجپوت اسی جنگ میں مجاہدین کے توپ خانہ کا سردار تھا اور عثمان زئی کی جنگ میں اس نے بڑے کارنامے دکھلائے تھے۔"[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ مجاہدین کی جنگ دراصل انگریزوں کے خلاف تھی۔" یہ تحریک دراصل غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تھی۔ اور اسی بنا پر شاہ عبدالعزیز اور مولوی عبدالحئی اپنے فتوؤں میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ اس کے لئے ایک دلیل یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ بالاکوٹ کی لڑائی پر اس کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ اپنے اصل حریف کے مقابل آ گئی۔"[2]

مولوی عنایت علی صادق پوری (جو اس تحریک کی اہم شخصیتوں میں سے تھے) کی مثنوی کا ایک مصرعہ ہے۔

کہ آن جنگ ما با فرنگی بود[3]

اس وقت کی سکھ حکومت میں مسلمانوں پر زیادتیاں ہو رہی تھیں لہٰذا اسی کو بہانہ بنا کر اصل مقصد کی کاربرآری کے لئے آگے قدم بڑھایا گیا تھا۔ اس تحریک کے سربرآوردہ حضرات کی دوربینی اور سیاسی پوزیشن کی صحیح سوجھ بوجھ کے ساتھ پنجاب کی طرف ان کے اقدام کے منشاء کا صحیح اندازہ سر جان لارنس Sir John Lawrance کے خط کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸۵۸ء میں اس کے تقریباً بیس سال بعد سر فریڈرک کیومرے Sir Fredric Currey کو لکھا تھا۔ "خدا کا شکر ہے کہ پنجابیوں کی وفاداری اور رضامندی نے ہندوستان کو بچا لیا ہے۔ اگر پنجاب ختم ہو جاتا تو ہم لوگ تباہ ہو جاتے۔"[4] مگر اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ بظاہر یہ خانہ

۱۔ تحریک آزادی ہند میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود، غیر مطبوعہ مسودہ ص ۲۵ اور ۴۴

۲۔ حالی کا سیاسی شعور از معین احسن جذبی۔ ص ۴۱ - ۴۲۔

۳۔ تحریک آزادی ہند میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود، غیر مطبوعہ مسودہ ص ۱۷۔
(یہ مصرعہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سن کر لکھا تھا۔)

4. Rise Of Christian Power In India — By B. D. Basu P. 958

جنگیوں کی صورت معلوم ہونے لگی۔ اس سے انگریزوں کو مزید تفرقہ انگیزی کا موقع ملا۔ شاید یہ وجہ بھی یہاں ان کی ناکامی کی ہوئی۔

سکھوں سے ان کی ٹکر میں دو تخریبی رخ تھے۔ ایک تو یہ خانہ جنگی کی صورت ہو گئی، دوسرے مسلمان اور سکھ دو مذہبی فرقوں کی جنگ متصور ہونے لگی۔ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر سید احمد شہید بریلوی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کیونکہ پنجاب کی سکھ ریاست انگریز دوست تھی اور ان کی جنگی منصوبہ بندی میں حائل تھی۔ مرکز شاہی بیکار ہو چکا تھا۔ تمام والیان ریاست کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنے کی صورت ممکن نہ تھی، مرکز کو پھر سے مضبوط کرنے کی کوشش کرنا مردہ میں جان ڈالنے کے مترادف تھا۔ مشرق میں انگریز اچھی طرح مضبوط ہو چکے تھے مگر سرحد اور پنجاب کے مغربی علاقے ان کی مکمل دسترس سے باہر تھے۔ لہٰذا وہ سرحد کے قریب کے مغربی علاقے کو انگریزوں کے خلاف مضبوط محاذ کے طور پر استعمال کرنا اور وہاں ایک منظم حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہاں وہ فرنٹیر کے جنگ جو پٹھانوں، پنجابیوں اور دلی کے قرب وجوار کے مسلمانوں کو مجاہدین سے ملا کر ایک متحدہ محاذ کا قیام ممکن سمجھتے تھے۔ یہاں پر وہ کابل، افغانستان اور کشمیریوں سے بھی پوری مدد باآسانی حاصل کر سکتے تھے۔ کیونکہ سب سرحدیں ملی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ پہاڑی اور دشوار گزار علاقے مقابلے کے لئے موزوں اور اچھے تھے جہاں پر باوجود نئی طرز کے بہتر ہتھیاروں کے انگریزوں کے لئے دشمنوں کو زیر کرنا مشکل کام تھا۔ یہ منصوبہ اس لئے ناکام نہیں ہوا کہ غلط تھا بلکہ سازشوں اور غداریوں نے اسے ناکام بنایا جیسا کہ شروع ہی سے انگریزوں کا طرز عمل تھا۔

بالاکوٹ میں ناکامی کے بعد ستھانا میں مقابلہ کی کوششیں ہوتی رہیں۔ یہ مغربی محاذ جاہل پٹھانوں کی غداری کے باعث کمزور پڑ رہا تھا۔ ادھر مشرق کی طرف پٹنہ کے مرکز میں بڑی ہمت اور جوش سے کام ہونے لگا۔ یہ لوگ انگریزوں کے خلاف باغیوں کے لئے ہر طرح کی مدد کا سامان فراہم کرتے اور مذہبی جوش کے ساتھ باغیانہ جذبے پیدا کرتے تھے۔ بنگال کی باغی تحریکیں اس عظیم تحریک کا آخری نشان تھیں۔ یہ مشرقی محاذ ۱۸۰۲ء سے انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہا، جب کہ مولوی شریعت اللہ نے علم بغاوت بلند کیا اور مشرقی علاقوں میں اس تحریک کے لیڈر رہے جو فرائضی تحریک کے

نام سے موسوم ہے۔ "یہ تحریک کچھ مذہبی اور کچھ زرعی تھی جو حاجی شریعت اللہ فریدپوری کی قائم کردہ تھی۔ انھوں نے ۱۸۲۰ء میں جب وہابی تحریک نمودار ہو رہی تھی حج کیا۔ بنگال کی واپسی پر انھوں نے عقائد اور عادات و اطوار میں اصلاح کی تبلیغ شروع کر دی۔ اور کسانوں کی بھی تائید حاصل کی۔ انھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔" ۱

فریضی تحریک کے بارے میں پادری ٹائی ٹس Father Tytus لکھتے ہیں کہ انھوں نے بہادر پور کو صدر مقام قرار دے کر بالخصوص کاشتکاروں میں تبلیغ کی۔ ان کا منشا مذہبی تبلیغ کے علاوہ غربا میں باہمی امداد کی روح پیدا کرنا اور انھیں زمینداروں کی دسترس سے بچانا تھا۔" ۲

ادھر سید احمد شہید بریلوی نے پشاور فتح کیا ادھر نثار علی اور مسکین شاہ نے بنگال میں علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۸۳۱ء میں سید نثار علی انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مسکین شاہ نے گوریلا لڑائی شروع کر دی۔ نیپال کی ترائی کو پورے طور پر منظم کیا۔ اس سے انگریزوں کو کافی زک پہنچی مگر ایک طرف سے مہاراجہ نیپال اور دوسری طرف انگریزوں کا مقابلہ حتیٰ کہ یہاں بھی انگریزوں کی شاطرانہ چالوں نے نیپال دوستی کے پردہ میں اسے ختم کر دیا۔ اس گروہ کی اولوالعزمی جانبازی اعلیٰ کردار اور بے غرض خدمات میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ یہ تمام تحریکیں دراصل ولی اللٰہی تحریک کی مختلف شاخیں کہی جا سکتی ہیں۔ اس عظیم تحریک کے آثار غدر کے بعد تک پائے جاتے ہیں۔ ہنٹر Hunter لکھتا ہے۔ "یہ تین دفعہ انگریزی فوجوں کے ہاتھ سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں لیکن باوجود اس کے ابھی (۱۸۷۱ء) تک زندہ ہیں۔" ۳

مولانا محمد جعفر فرماتے ہیں۔ "یہ ایسا وقت تھا کہ اگر کوئی شخص ہمارے

---

1. *Modern India And The West — By O'Malley P. 395*

۲۔ بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی از محمد میاں۔ حاشیہ ص ۱۵۲ (جلد ۲)

3. *The Indian Musalmans — By W. W. Hunter P. 66*

بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی از محمد میاں ص ۱۰۲ (جلد ۳)

واسطے ذرا بھی کلمہ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ پشاور سے لیکر مشرقی اور شمالی کنارہ بنگال تک شاید کوئی مالدار مسلمان یا مولوی و غازی باقی رہا ہو جس کو ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر مٹھی نہ گرم کی ہو"۱ مولانا یحییٰ صاحب اور مولانا احمد اللہ صادق پوری کی گرفتاریاں ۱۸۶۵ء میں عمل میں آئیں اور جبس دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں۔ اسی پٹنہ کے مرکز کے متعلق ہنٹر Hunter لکھتا ہے کہ "سازشوں کا سب سے خطرناک کام پٹنہ کے دارالاشاعت سے جس کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام کہتے تھے مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جسے وہ بڑا مال گودام کہتے ہیں رنگروٹوں کا پہنچانا تھا" ۲

مختصر یہ کہ یہ ساری تحریکیں اپنے مقصد میں ایک ہی ڈھنگ سے بندھی تھیں اور ولی اللہی تحریک ہی ان کا بنیادی مرکز تھی۔ ابتداء میں انکی کوششیں درس و تدریس کے ذریعہ مذہبی اصلاح، اپنے خیالات کی اشاعت اور ایک مضبوط دینی و سیاسی مرکز قائم کرنے کی رہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی تمام عمر انھیں مشاغل میں صرف کی۔ ان کے سیاسی خطوط سے بھی یہ امر واضح ہوتے ہیں مگر جاگیرداری اور خانہ جنگی کے اس زوال پذیر اور ہنگامی دور میں یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ بعد کو سید احمد شہید بریلوی اور ان کے بعد کے زمانے میں جنگی تیاریاں، باغیانہ جوش پیدا کرنا اور انگریزوں کے خلاف سازشیں اور ٹکریں اس کا عملی مرکوز رہے "یہ لوگ اور ان کے ساتھی انگریزوں سے ترک موالات و عدم تعاون کا وعظ کہتے اور متوازی گورنمنٹ قائم کرنے کی تلقین کرتے۔ یہی حربے کانگریس نے ۱۹۲۰ء میں استعمال کئے۔ اس تحریک کے بانیوں اور پیروؤں نے شروع سے انگریزوں کا بائی کاٹ کیا۔ تعلیم گاہوں سے پرہیز انگریزی عدالتوں سے گریز، انگریزی ملازمتوں سے بے تعلقی، یہ ان کے باغی جذبات کا خاص طریقۂ کار رہا" ۳ یہ ساری چیزیں مسلمانوں میں اسی تحریک کے اثر سے پائی جاتی تھیں۔

تحریک کے اس مختصر جائزے کے بعد ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس جماعت میں سرفروشی اور قربانی کا انتہائے خوف جذبہ ہونے کے باوجود اسے سیاسی ناکامی سے کیوں دوچار ہونا

۱۔ بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی از محمد میاں ص ۱۲۶ (جلد ۳)

۲۔ " " " " " " ص ۱۱۰ (")

۳۔ تحریک آزادئ ہند میں مسلمانوں کا حصہ از ڈاکٹر سید محمود۔ ص ۲۴ (غیر مطبوعہ نسخہ)

پڑا؛ اس کے کئی اہم وجوہ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی جگہ کیا اور کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

خالص مذہبی رنگ میں ہونے کے باعث مکمل ہمہ گیری اور سارے ملک کا اتحاد اس مرکز پر ممکن نہ ہوا۔ جنگ انگریزوں کے خلاف بھی اور اس کی تشریحیں جہاد فی سبیل اللہ مجاہد، دار الحرب، جیسی اصطلاحوں میں ہوتی تھیں۔ فتوؤں میں یہ بحث ہوتی کہ نماز جمعہ و عید اس زمین پر حرام ہے یا نہیں۔ لہذا یہ شدید مذہبی اصطلاحیں غیر مذہب والوں کے لئے بالکل اجنبی تھیں۔ ان اصطلاحوں میں انھیں کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی نصب العین کے ساتھ چونکہ مذہبی اصلاح بھی اس تحریک کا منشا تھا لہذا درس و تدریس و مواعظ کے سلسلے جو خالص اسلام سے متعلق تھے جاری رہے۔ دراصل یہ لوگ مذہبی جوش و جذبہ بیدار کرکے اور پھر اس جذبہ کو مذہبی اشاروں پر جہاد و ثواب وغیرہ کے ذریعہ جنگ آزادی کی طرف مائل کرتے، اسلئے یہ تحریک مسلمانوں کے نام سے موسوم ہوکر رہ گئی اور اس کے عظیم مقاصد اور جنگ آزادی کی کاوشوں میں دوسرے مذہب کے لوگ پورے طور پر شریک نہ ہوسکے جس سے ایک ہمہ گیر ملکی اتحاد قائم ہوسکتا تھا۔

شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کی تصانیف اور تحریریں قلمی نسخوں تک محدود تھیں۔ جن کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہوسکی۔ اس وقت اشاعت کا ذریعہ مواعظ تھے یا درس و تدریس، مواعظ کا اثر فوری اور بہت تیز بھی ہوسکتا ہے پھر بھی وہ الفاظ و خیالات جو واعظ آتش بیان پیش کرتا ہے ذہن سے محو ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریروں میں تصنیف کا ایک تھوڑا سا جزہی پیش کیا جاسکتا ہے۔ پریس جس نے نئے دور میں اشاعت کا ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا وہ مغرب کا عطیہ تھا۔ اور اس دور میں اس کا پورا استعمال ہندوستان میں عام نہیں ہوا تھا۔ یقیناً اس ہنگامی دور میں نئی قدروں کے درمیان یہ تحریک کے لئے بڑی کمی تھی۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا زمانہ ہندوؤں کے لئے نئی ترقیوں اور نئے دور کی اہمیت کو سمجھنے اس کی رفاقت میں آگے بڑھتے رہنے کا زمانہ تھا۔ "نو ہندو ازم" کی تعمیر کا دور تھا، جب کہ وہ انگریزی تعلیم، مغربی علوم اور سائنس سے آشنا ہوکر اسے اپنا رہے تھے اور قدیم قدروں کو تیزی سے مسمار کر رہے تھے۔ نئی قدروں کی تعمیر اور نئی ترقیوں میں مشغول تھے۔ اس دور میں ناممکن تھا کہ وہ جس قوت کے ذریعے نئی قدروں کی تعمیر کرکے نئے دور کی شمع روشن کر رہے تھے اسی قوت کو ختم کرنے میں کسی کے شریک ہوجاتے یا وہ بھی ایسی جماعت

کے ساتھ جو قدیم اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور بظاہر خالص مذہبی جماعت معلوم ہوتی تھی۔ لہذا مسلمانوں کے علاوہ عام ہندوستانیوں کی عدم شرکت اس تحریک کی سب سے بڑی کمی تھی۔

نئے سماج کی تعمیر جدید مغربی اصولوں اور بنیادوں پر منحصر تھی اس کے مقابل یہ ولی اللّٰہی تحریک اور اس کی تمام شاخیں اپنے علمی اصولوں کی اساس مذہب سے وابستہ اور قدیم سے پیوستہ کئے ہوئے تھیں۔ لہذا اصولوں اور طریقہ کار کا یہ فرق بھی ہندوستانی عوام کو اس وقت ایک متحد طاقت بننے میں حائل رہا۔ ولی اللّٰہی تحریک کے بنیادی جدید اور اہم مقاصد، قدیم طرز اور طریقۂ کار کے باعث قدیم ہی کی پکار معلوم ہوئے اور دیگر مذہب والوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔

ولی اللّٰہی تحریک کے مقاصد، ان کے خیالات بے شک جدید بنیادوں پر تھے مگر یہ اس وقت صرف ذہنوں میں ایک نئے خاکہ کی مانند ابھرے تھے۔ تحریک کی کاوشیں عملی طور پر پرانے ڈھانچوں کی اصلاحات میں ایک نئی رنگ آمیزی تک کے لئے مجبور تھیں۔ کیونکہ اس وقت کا دور قدیم ماضی سے پیوست تھا۔ قدیم قدریں اور نظام سماج میں قائم تھے۔ جدیدیت کی حدود صاف اور متعین نہیں ہوئی تھیں۔ ایسے ناہموار دور میں مستقبل سے ان مقاصد اور بنیادوں کا سیدھا رشتہ جوڑ دینا مشکل تھا۔

اس تحریک نے زوال پذیر دور میں جنم لیا۔ ایک ایسے زوال پذیر سماج کو سنبھالنے کے لئے قدم بڑھایا جو سماجی، اقتصادی اور علمی میدان میں مغرب سے ٹکر کھانے اور اس کے آگے سپر رکھنے پر مجبور تھا۔ یہ تحریک ملک کی آزادی کے لئے اس دور میں وجود میں آئی جب ملک خانہ جنگیوں کی آگ میں جل رہا تھا اور کوئی منظم اتحاد ممکن نہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام شمع سحری بن چکا تھا۔ یہی وجوہات ہیں کہ اس تحریک کے اعلیٰ مقاصد اور جدید خاکوں کی تکمیل ادھوری تعبیر بن کر رہ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ایثار و قربانی، سچائی اور بے خوفی، کا جو مظاہرہ اس تحریک نے آخری دم تک کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یقیناً اس تحریک کی کاوشیں اور جانبازیاں جنگ آزادی ہند کی اولین اور باعزم کوششیں تھیں اسے ہم قدیم کاوشوں کی آخری منزل یا جدید کا پیش خیمہ بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس تحریک کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے

لائق ہے کہ اس کے گہرے اثرات اپنے قدیم طرز، علمی صورتوں اور مذہبی رنگ میں غدر کے قبل و بعد مسلم عوام اور ان کی سماجی زندگی پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ یعنی مذہب سے گہری وابستگی اور انگریزوں سے عدم تعاون و نفرت۔ اس کا ایک پہلو وہ ہے جو مذہب کو علم و عقل کی روشنی میں جانچتا ہے۔ یہ غدر کے بعد جدید خیالات کے مسلمانوں میں مقبول ہوا اور ان کے لئے شمع راہ بنا۔

سرسید خود ولی اللّٰہی تحریک کے اس پہلو سے مکمل طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ سرسید کے خاندان کا شاہ عبدالعزیز سے تعلق اور لگاؤ اور سرسید کے ان کی تعلیم سے تاثر کا ذکر، ان کے حالات زندگی کے باب میں آئے گا۔ اس مختصر جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی اللّٰہی تحریک کے اثرات ہمہ گیر طور پر مسلم سوسائٹی میں غدر سے پہلے آگ کے شعلے کے مانند اور غدر کے بعد دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر یہ بات اہم اور قابل غور ہے کہ باوجود ایک اعلیٰ اور صاف سیاسی مسلک کے اس کے مستقل اثرات مذہبی زیادہ ہیں اور سیاسی کم کیونکہ اس تحریک نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے مذہبی ذرائع استعمال کئے اور مذہب کے نام پر سیاسی جوش اور انگریزوں کی مخالفت کو ابھارا۔ لہذا بڑے بڑے مذہبی علماء اور مسلم عوام اس میں شریک ہوئے مگر دیگر مذہب والے شامل نہ ہوسکے، یہی وجہ ہے کہ اس کے مذہبی اثرات زیادہ دیرپا اور مستقل بن گئے۔ مگر سیاسی اثرات سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ بگولے کی سی تیزی سے نمایاں ہوئے اور جلتے جلاتے بالاکوٹ کی قربانیوں کے بعد ستھانا کے مغربی محاذ اور بنگال اور بہار کی تنظیموں اور سازشی اسکیموں میں جلوہ گر ہوئے اور آخر کار غدر کی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ ختم ہو گئے۔ یہ سیاسی اثرات اس تحریک کے پیروؤں اور رضاکاروں میں بہت زیادہ مستحکم اور پائندہ نظر آتے ہیں۔ مگر یہ جماعت کتنی ہی بے خوف اور جانباز سہی عوام کی مجموعی اور منظم طاقت کچھ اور ہوتی ہے مسلم عوام میں ان سیاسی اثرات کے تحت جو عام جوش ملتا ہے وہ دراصل سیاسی سوجھ بوجھ کی بناء پر نہیں بلکہ مذہبی جوش کی بناء پر تھا۔ یہ ایک

بڑا سبب تھا کہ باوجود اپنے روشن مقاصد اور اعلیٰ نظریات، بے لوث کاوشوں اور بیخوف قربانیوں کے اس تحریک کو سیاسی مسلک میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پورے ہندوستان کی لگام بلا شرکت غیرے انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ مگر اس سیاسی جدت کے ساتھ چند جدید اور غیر محسوس وسائل ایسے بھی تھے جو اس زمانے میں مستقل طور پر نئے نقوش بنانے میں اور مغربی اثرات کو مستقل اور پائندہ کرنے میں تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عیسائی مشنریاں تھیں جو پندرہویں صدی سے ہی دکن کے ساحلی علاقوں میں جاری و ساری تھیں۔ بنگال پر انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ان کے لئے راہیں کھل گئیں انھوں نے زور شور سے اپنا تبلیغی کام جاری کیا۔ حکومت کی کھلی اعانت انھیں حاصل ہو گئی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے انگریزی سے بنگالی، اردو اور دیگر دیسی زبانوں میں بائیبل کے ترجمے کرائے۔ وہ ہندوستان کے دیگر مذاہب پر اعتراض اور حملے بھی کرتے تھے۔ ان مشنریوں کے مقاصد گو تبلیغی تھے مگر انہوں نے سوشل اصلاح کی طرف توجہ دلائی، چھوت چھات کے خلاف اظہار خیال کیا۔ ستی کی رسم ختم کرانے کی کوشش کی۔ کرسچین مشنریز ۱۸۰۲ء سے اس ستی کو ختم کرنے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست کرتی رہی ہیں"۔[1] ظاہر ہے ان نئے نظریات کی اشاعت سے ان کے مشن میں بہت مدد ملتی تھی۔ اس کے علاوہ قصبوں اور شہروں کے میلوں اور اجتماعات میں پادری تبلیغ کے لئے جاتے اور مذہبی علماء سے ان کے بڑے مباحثے اور مناظرے ہوتے۔ اس سے انھیں جو فائدہ یا نقصان پہنچا ہو وہ الگ بات ہے مگر اس چیز نے ہندوستانی عوام کو جو قدیم سے صرف مذہب کے نام پر گردن جھکا دینے کے

1. History Of Social And Political Ideas.
— By B. Majumdar P. 7, 16

عادی تھے، مذہب کے متعلق عقلی دلائل استعمال کرنے اور سوچنے کی طرف مائل کیا۔

انگریز افسران و تجار کے مستقل قیام سے ہندوستانیوں کو نئی طرز معاشرت سے واسطہ ہوا۔ نئے مغربی سماج میں شدید سماجی بندھنوں کو نہ پاکر عام ہندوستانیوں میں آزادی اور آزاد خیالی پیدا ہونے لگی۔ انھیں خوش حالی اور ترقی کی راہ میں قدیم رسوم ورواج کے بندھن حائل نظر آنے لگے۔ انگریزوں کی نئی طرز معاشرت میں انھیں فرد کی آزادی اور حقوق محسوس ہونے لگے۔ باہر کی دنیا خصوصًا یورپ سے مستقل رابطے پیدا ہوئے اور مغربی سائنس کی معلومات کے ساتھ تجارت اور نظام سرمایہ داری کے نئے راستے دکھائی دینے لگے۔ انگریزوں کے سیاسی غلبہ کے ساتھ ان کی تجارت بھی خوب چمکی اور اس کی انتظامی کارروائیوں کے لئے بھی یوروپین افسروں اور تجار کو مختلف مقامات پر سکونت اختیار کرنی پڑی۔ بغیر ہندوستانی اہلکاروں کے اس کارخانہ تجارت کو چلانا ان کے لئے اس اجنبی سرزمین پر ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے ہندو بنیئے اور دیوان ان کے خاص مشیر کار رہے۔ مسٹر برک Mr. Burk لکھتے ہیں "بنیا یا دیوان انگریزوں کے گھر کا منتظم ہوتا تھا وہ تمام عیاریوں سے واقف ہوتا تھا جو مظالم سے بچنے کے لئے ایک غلام کرتا ہے ان بنیوں نے بڑے بڑے گھرانے الٹ دئے، اور سرکاری مالگزاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے" ۱

طفیل احمد صاحب لکھتے ہیں انگریز ٹھیکہ داروں کی بدولت پرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمینداریوں سے جبرًا اور ملک کے دستور کے خلاف بے دخل اور محروم کر دئے گئے تھے۔ اس وقت کے قانون کی رو سے کسی ایک شخص کو ایک لاکھ سے زائد مالگزاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا مگر انگریزوں

۱۔ از برک مقدمہ ہسٹنگز بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۶۴-۶۵

کے بنئے اس قانون سے آزاد تھے، خود وارن ہسٹنگز Warren Hastings کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکہ دار تھا۔" ۱ ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند سنگھ بھی ہسٹنگز کا آلۂ کار تھا جس کے متعلق دارالعوام میں جولائی ۱۷۸۵ء کو ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رُو سے اس کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ کے قریب پہنچی تھی۔" ۲ گورنر کے دیوان رام چندر کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ساٹھ روپیہ ماہوار کا ملازم تھا مگر بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایجنٹ روپ کشور کے پاس اتنی دولت تھی کہ ماں کے مرنے پر نوے لاکھ صرف کیا۔ یہی وہ بنئے تھے جنھیں خاک سے اٹھا کر انگریزوں نے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پہلے ٹھیکوں کے ذریعہ یہ بڑی بڑی جائدادوں پر قابض ہو گئے پھر دوامی بندوبست کے مالک بن گئے۔" ۳

فاتح و مفتوح کے مابین اس تجارتی شرکت نے دونوں کو منافع کا شریک بنا دیا، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد یہی لوگ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کے نئے تجارتی اصولوں سے واقف نظر آنے لگے جو شروع سے انگریزوں کے شریک کار رہ چکے تھے اور ہندوستان کی بڑی تجارتوں میں ان کا کچھ نہ کچھ دخل ہونے لگا۔ اس کے علاوہ انگریزی طرز معاشرت مغربی خیالات اور نئے اصول فکر و عمل نے ان لوگوں پر گہرا اثر ڈالا کیونکہ ان لوگوں کا انگریزوں سے ہر وقت کا ساتھ اور سابقہ رہتا تھا۔

انگریز افسران اور عہدہ داروں کو انتظامی کارروائیوں کے لیے دیسی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ دیسی زبان سیکھنے کے لئے فوٹ ولیم کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں عمل میں آیا۔ جہاں مشہور زمانہ اساتذان ادب جمع کئے گئے اور جان

۱۔ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۶۴ - ۶۵

۲۔ " " " " " " " " " " "

۳۔ " " " " " " " " " " "

گل کرسٹ John Gilchrist کی سرکردگی میں اردو زبان میں درسی مقصد سے کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا، فورٹ ولیم میں ہندوستانی زبانوں کی سرپرستی تو کی گئی مگر اردو ہندی کے دو خانوں میں تقسیم کے ساتھ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد مختلف مقامی زبانوں خصوصاً بنگالی کو بڑی تیز ترقی حاصل ہوئی۔ زبان اور قومیت اور اپنے کلچر کے ایک مدھم اور لاشعوری احساس کے تحت بھی یہ ادبی ترقیاں ہوئیں مگر اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ پریس کا جاری ہونا اور اخبارات و رسائل کی کثرت بھی تھی۔ قدیم و جدید تحریری بحثیں اور جدید وسائل کے تقاضے بھی اس کا سبب تھے۔ انگریزوں کے ساتھ انگریزی زبان و ادب سے بھی تعارف ہوا لہذا مغربی خیالات اپنا اثر کرنے لگے۔

انگریزی تعلیم کے ساتھ جدید علوم اور سائنس کے نئے انکشافات نے مغرب کی عقلیت پسندی اور مادیت کو عام کیا۔ تعلیم کا مطلب اب صرف مذہبی اور اخلاقی تعلیم نہ رہا جو زمانہ قدیم کی تعلیم کا بنیادی جز تھے بلکہ نئے علوم کے تحت مضامین کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہوگیا جس میں سائنس اور مادیت کا پورا غلبہ تھا۔ ان علوم کی جانکاری سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ مذہبی و سماجی خیالات و نظریات میں گہری تبدیلی اور زبان و ادب کی ترقی نیز مغرب پسندی اور نئی تہذیب سے وابستگی ہیں۔ اس کے علاوہ پریس کا استعمال شروع ہوگیا۔ شروع میں مشنریوں نے اسے اپنے تبلیغی مقصد کے لئے بھی استعمال کیا مگر پریس کے استعمال کے ساتھ تمام دیسی زبانوں میں کتابوں، رسالوں اخباروں کی اشاعت کا سلسلہ تیز ہوا۔ ساتھ ہی انگریزی اخبارات و رسائل بھی منظر عام پر آنے لگے۔ جن کے ذریعے عام معلومات میں اضافے ہوئے۔ کلکتہ گزٹ، مدراس ان ٹیلی جینس، امن، دسمبر ۱۷۸۵ء مدراس کوریر فروری ۱۷۸۶ء، انڈین گزٹ آف کلکتہ جون ۱۷۸۹ء، بمبئی گزٹ ۱۷۹۱ء، بمبئی کوریر نومبر ۱۷۹۱ء، لاہور نیوز پیپر ۱۸۱۴ء، اخبارات از ہلکر کیمپ ۱۸۱۴ء،

دہلی کے اخبارات وغیرہ "[1] اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے اخبارات کی اشاعت عام ہوئی جن میں خبروں کے علاوہ ہر طرح کے جدید خیالات کے حامل مضامین اور تراجم شایع ہوتے۔ سوشل اور سماجی حالات پر تنقیدی نظریات ہوتے۔ علاوہ ازیں یورپ اور امریکہ کی خبریں اور حالات ہندوستان میں تیزی سے پہنچنے لگے۔ چنانچہ مغرب کے نظریات اور انقلابات کے اثر سے ہندوستان میں بھی نئی نظریاتی تشکیل عام ہونے لگی۔

ملک کی مختلف سوشل اور مذہبی تحریکات نے بھی پریس ورسائل کو اپنا آلۂ کار بنایا اور ان ہی حالات نے ایک عام بیداری کے ساتھ سیاسی نظریات کی تشکیل کی اور قوم و وطن کا نیا جذبہ بیدار کیا۔ یہ احساس بیداری اور یہ جذبۂ قوم و وطن نئے خیالات اور نئے اسباب کے تحت وجود میں آئے۔ جادو ناتھ سرکار انگریزوں کی لائی ہوئی برکتوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں: "انگریزوں کا پہلا تحفہ ہندوستان کو مکمل اندرونی امن اور باہری حملوں سے نجات تھا۔ انھوں نے تمام دنیا سے ہمارا مسلسل اور وسیع رابطہ قائم کر دیا۔ انھوں نے تمام ہندوستانی ذاتوں اور نسلوں کو ایک یکساں عوام میں ڈھال دیا، جس سے سوشل برابری اور خیالات و معاشرت میں یکسانیت پیدا ہوئی اس تبدیلی کی ابھی صرف ابتدا ہوئی اس کی تکمیل کو ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔ انگریزی حکومت کا اثر براہ راست اور ان کے تمدن کا نمونہ غیر محسوس طور پر ہندوستانیوں میں ترقی کی روح بیدار کرنے میں معاون ہوئے۔ ہمارے اعلیٰ ذہن اب قدیم روایات کی عظمت سے مرعوب اور مطمئن نہ تھے، بلکہ مذہب، خیالات، تعلیم، سماج اور زندگی کو بہتر بنانے پر ان کی نظریں جم گئیں۔"[2]

مختصر یہ کہ یہی ذرایع و وسائل تھے جو اٹھارہویں صدی سے مستقل ہندوستانی

۱۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ از عبداللہ یوسف علی۔ ص ۱۲۱

2. India Through The Ages — By Jaddu Nath Sarkar P. 55 to 57

سماج پر اثر انداز ہو رہے تھے اور غدر کے قبل ولی اللّٰہی تحریک کے تقریباً متوازی چل رہے تھے ان تمام سیاسی الٹ پھیر کے درمیان ان کے اثرات دھیمے سہی مگر بہت گہرے تھے۔ جنہوں نے پورے ہندوستان کے سماجی ڈھانچوں میں نئی بنیادیں قائم کیں اور نئے رنگ بھرے، حتیٰ کہ ایک نیا سماج نئے نظام کی پکار بن کر وجود میں آ گیا۔ اس دور میں ہمیں دو مختلف طبقے نظر آتے ہیں ایک تو مغرب سے ناآشنا قدیم روایات پر مر مٹنے والا قدیم طبقہ جس میں جاگیردار، امراء، نواب، مذہبی علماء، پنڈت اور قدامت پرست عوام بلاتخصیص ہندو و مسلمان سب شامل تھے، دوسرا انگریزی تعلیم سے آشنا، مغرب سے آگاہ وہ متوسط طبقہ جو اس دور میں جنم لے رہا تھا۔ یہ طبقہ نہ تو امیروں اور جاگیرداروں کا تھا نہ مفلس اور جاہل عوام کا بلکہ مغربی تعلیم سے آشنا ایک متوسط طبقہ تھا۔ جو نئے دور کے تقاضوں کو سمجھنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس متوسط طبقے میں تنہا و یکہ ساحلی علاقوں خصوصاً بنگال کے ہندو شامل تھے کیونکہ یہی علاقہ سب سے زیادہ انگریزوں کے تسلط و اثر میں تھا۔ یہی وہ طبقہ ہے جس پر نشاۃ ثانیہ کے اثرات پہلے نمایاں ہوئے اور جس کے متعلق بی۔ جی گوکھلے لکھتے ہیں۔ "ہندو نشاۃ ثانیہ ایک طرف اور انگریزی تعلیم کے اثرات دوسری طرف، ایک جنگجو قومیت کی نمود کے لئے معاون ثابت ہوئے"۔[1] یہاں ہندو نشاۃ ثانیہ سے وہی اثرات مراد ہیں جنہوں نے ایک متوسط طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ طبقہ جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا جا چکا ہے صرف ہندو خصوصاً بنگالی ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ یہ طبقہ گو مغربی تعلیم کے زیر اثر مغرب کا مقلد تھا اور اس کی نگاہیں مغرب کی روشنی سے خیرہ تھیں مگر ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے ذہن نئی تعلیم کے اثر سے غور و فکر کرنے اور اسباب و وسائل کے نتائج پر سوچنے کے عادی ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس روشنی میں وہ قدیم مذہبی عقائد پر غور و خوض کے ساتھ قدیم مشرقی روحانیت

---

1. The Making Of The Indian Nation
—— By B. G. Gokhale P. 188

کے حامی ہوئے۔ ماضی کی عظمت و شوکت کو اپنی قومی اساس بنا کر ایک متحدہ قومیت کے احساس کے ساتھ بیداری پیدا کی۔ مشرق و مغرب کے اس امتزاج نے ایک نئی کیفیت بیداری پیدا کر دی تھی۔ قدیم و جدید کی کشمکش سے ہیجانی بے چینی رونما ہو گئی تھی۔ جذبہ و عقل کی اسی کشمکش کے درمیان ایک نئے سماج کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ ایک نیا ہندوستان ابھر رہا تھا جس نے وہ مصلحان قوم و وطن پیدا کئے جن کی خدمات نئے دور کی تشکیل و تعمیر اور ہندوستان کی سیاسی بیداری میں نمایاں ہیں۔

اس عظیم دور تغیر میں ہندوستانی زندگی کے قدیم و جدید پہلوؤں کا یہ جائزہ نامکمل رہے گا۔ اگر ہم اس زمانہ کے قدیم اقتصادی ذرائع اور معاشیات کے جدید اصولوں کی کشمکش اور ہندوستان کی اقتصادی حالت پر بھی روشنی نہ ڈالیں کیونکہ اقتصادیات سماجی زندگی پر اپنا گہرا اثر رکھتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ابتداہی سے ایک طرح کے شاہی نظام کی حلقہ بگوش رہی ہے جہاں ہر دور شاہی جاگیردارانہ بنیادوں پر قائم تھا۔ نتیجتاً ہندوستان میں ہزاروں سال تک ایک ہی قسم کا معاشی نظام قائم رہا، جاگیردارانہ نظام میں ملکیت اور مملکت کے جو بنیادی اصول ہیں وہی قدیم ہندوستانی سماج کے معاشی نظام میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ابھرتے رہے۔ جاگیردارانہ نظام میں زمین ہی اصل دولت ہے اور یہی معاشیات کے تمام ذرائع کا مرکز و محور ہوتی ہے۔ اس قدیم نظام میں ملک بادشاہ کا مقصود ہوتا ہے مگر عملی طور پر زمین کاشتکار کی ملکیت ہوتی ہے۔ جاگیرداروں اور بادشاہوں کو خراج دینے کے بعد وہی نسلاً بعد نسلاً اس کے وارث ہوتے ہیں۔ محاصل کی کمی و بیشی زیادہ تر حکمرانوں کے شخصی مزاج پر منحصر ہوتی تھی۔ لہٰذا حکمرانوں کی تبدیلی سے کاشتکار کی ملکیت پر کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ حکمران بدل جاتے تو بھی زمین پر کاشتکار کا حق بدستور رہتا تھا۔ جس کے سبب سے تاریخی لڑائیوں اور حکمران خاندان کے عروج و زوال کے ساتھ دیہی زندگی کی عام قدروں میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی یہی وجہ

ہے کہ صدہا سال تک یہ معاشی نظام بغیر کسی تغیر کے یکساں طور پر قائم رہا۔ لہٰذا زمین اور اس کی پیداوار پر ہی ملک کی خوشحالی کا انحصار اور عوام کی معاش کا خاص دارو مدار تھا۔

زمین کے بعد دوسرا درجہ قدیم دور میں صنعت و حرفت اور تجارت کو حاصل تھا۔ یہ دستی صنعتیں آج کل کی مشینی پیداوار سے مختلف نوعیت رکھتی تھیں۔ جن کی ترقی کا انحصار زیادہ تر حکمران طبقے اور امراء کے مزاج و رہائش پر ہوتا تھا۔ ان کی ترقی میں اجتماعی کوششوں کو کم اور انفرادی کاوشوں اور اختراعات کو زیادہ دخل تھا۔ ہر صنعت نسل در نسل باپ سے بیٹے کو ورثہ میں پیشے کے طور پر ملتی تھی۔ ملازمت میں سپہ گری اہم مقام رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ امراء و بادشاہ کی سرکاری ملازمتیں تھیں جو محدود اور سب سے زیادہ مشکوک ہوتی تھیں۔ قدیم دور میں یہی معاشی نظام صدیوں سے بدستور چلا آرہا تھا اور مغلیہ زوال کے اس دور میں بھی پلاسی کی لڑائی تک جب بنگال کی قسمت انگریزی اقتدار کے ہاتھ میں آگئی قدیم صنعتیں پھلی پھولی نظر آتی تھیں۔ زراعت پیشہ ہو یا مالک زمین، تاجر ہو یا حرفت پیشہ، مزدور ہو یا سپاہی یا شاہی ملازم اس اقتصادی نظام میں ہندو اور مسلمان یکساں شریک تھے۔ بقول بینی پرشاد جی "اپنے اپنے طبقہ میں لباس، مکان، طور طریقوں اور آداب میں شہر ہو یا دیہات پہچانے نہ جاسکتے تھے۔"[1]

یہ معاشی اشتراک بھی مشترکہ تہذیب کے جنم دینے میں معاون ہوا تھا جو قدیم دور کا بہترین ورثہ تھی۔ یہی اشتراک عمل اور تہذیبی اتحاد قدیم اقتصادی خوشحالی کا بڑا سبب تھا۔ جس کے بارے میں ولیم ڈگبے William Digbe لکھتا ہے "قبل اس کے کہ جنگ پلاسی فتح ہوئی اور ہندوستان کے خزانے بہہ بہہ کر انگلستان آنے شروع ہوئے ہمارے ملک انگلستان کا جو اربھاٹا نہایت نیچا تھا۔ خود انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال

---

1. Hindu Muslim Questions — By Beni Prasad P. 12

کے بے شمار دولت کے ذخیروں اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی "۔۱ ایک اور انگریز ڈو Dove رقم طراز ہے "سراج الدولہ کے بعد جن لوگوں نے بنگال سے ہوکر کوچ کیا ہم ان سے اس بات کی تصدیق کرانا چاہتے ہیں کہ اس وقت یہ سلطنت دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند، آباد اور کاشت کے اعتبار سے بہترین تھی۔ یہاں کے شرفاء اور تاجر دولت اور عیش و عشرت میں لوٹ لگاتے تھے اور ادنیٰ درجے کے کسانوں اور کاریگروں پر خوش حالی اور آسائش کی برکتیں نازل ہوتی تھیں "۔ ۲

لیکن تصویر کے اس خوبصورت رخ کے ساتھ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ قدیم معیشت جاگیردارانہ نظام کے سانچے کی ڈھلی ہوئی تھی لہٰذا حکمرانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ اور اس سے بھی زیادہ اس شاہی نظام کے دم توڑتے ہوئے دور میں معاشیات کی ان قدروں کا زوال بھی لازمی تھا۔ لہٰذا سیاسی ہار اور تباہی کے ساتھ ملک میں انتصادی انقلاب بھی جن ہولناک صورتوں میں رونما ہونے لگا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مختصر حوالوں اور خاکوں سے ہوگا۔ میر قاسم حکام کمپنی سے فریاد کرتا ہے۔ "ہر پرگنہ اور گاؤں اور منڈی میں انگریزی گماشتے نمک، چھالیہ، گھی، چاول، بھس بانس، مچھلی اور تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ رعایا کا مال زبردستی لیجاتے ہیں اور چوتھائی قیمت بھی نہیں دیتے۔ ان کے ظلم و جبر کا طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے مال کے بدلے ایک کی جگہ پانچ زبردستی لے لیتے ہیں "۔ ۳ اس طرح بنگال جو ہندوستان کے سب سے زرخیز اور خوش حال علاقوں میں سے تھا اور جو دراصل ہندوستان

۱۔ بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از خورشید مصطفیٰ رضوی ص ۵۶

۲۔ " " " " " " ص ۵۶

۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۵۸

کی پیداوار کا ذخیرہ متصور ہوتا تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے مفلس اور غیر آباد ہو گیا۔

کپڑے کی بنائی جو کاشتکاری کے بعد سب سے اہم پیشہ تھا تباہ ہونے لگی۔

(نوٹ) ۱ ولیم بولٹس William Bolts لکھتا ہے "غریب ہندوستانی دستکاروں پر ایسے ایسے مظالم توڑے گئے جس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ غریب کمپنی کے غلام بنا دئے گئے۔ جرمانے، قید، جبری معاہدے اور بید زنی کی سزا نے نوربافوں کی نسل معدوم کر دی۔ نورباف جب کمپنی کے سخت جابرانہ معاہدے منظور کرنے سے انکار کرتے تو کمپنی کے ایجنٹ ان کا سامان نیلام کر دیتے اور قیمت ضبط کر لیتے۔ باریک ریشم کاتنے والوں پر بھی ظلم کیا جاتا۔ ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ لوگوں کے انگوٹھے اس لئے کاٹ دئے گئے کہ وہ مہین دھاگہ نہ بنا سکیں۔ جس سے ٹیلر Taylor کے الفاظ میں صنعت و حرفت اور تجارت کے تنزل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکہ کی آبادی تقریباً برباد ہو گئی۔ ۱۸۰۰ء میں دو لاکھ سے ۱۸۳۸ء میں سترہ ہزار رہ گئی۔ جتنی تیزی سے آبادی گھٹی اس سے کہیں زیادہ سرعت سے افلاس بڑھ گیا۔" ۲ نمک اور کچے ریشم کی پیداوار جو بہت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی بالکل ختم ہو گئی۔ ۱۷۶۵ء میں گورنر جنرل کے فیصلے کے مطابق اعلان ہوا کہ انگریز تاجروں کی ایک سوسائٹی کو تمام تر حقوق نمک، چھالیہ اور تمباکو کی تجارت کے دے دئے جائیں۔ اور کوئی دوسرا شخص جو آنریبل کمپنی کے تابع نہ ہو مجاز نہیں کہ اس تجارت میں حصہ لے سکے۔"۳

۱۔ نوٹ۔ ایسی جابرانہ اور غیر منصفانہ تجارتی داستانوں کی تفصیل کے لئے دیکھیں

2. Rise of Christian Power In India — By B. D. Basu Chapter 3-4

۲۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از خورشید مصطفیٰ رضوی ص ۴۹ - ۵۰

۳۔ " " " " " " " ص ۸۵ - ۸۶

ان سب وجوہات سے بے روزگاری بڑھی اور معاش کا سارا بوجھ کاشتکاری پر رہ گیا نتیجتاً بے زمین بے روزگار قلاشوں کی تعداد بے انتہا ہوگئی۔ لارڈ کارنوالس lord cornwallice اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں۔ "میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کا ایک تہائی حصہ بالکل جنگل اور ویران ہوگیا ہے جواب وحشی درندوں کا مسکن ہے۔"۱ بقول شری این۔ ایس۔ بوس "پلاسی کی جنگ ہندوستان کی اقتصادی تباہی کا مکمل نشان تھی اور اس تباہی کے اسباب یہ ہیں۔ بنگال کی دیوانی کا کمپنی کے اختیار میں ہوجانا، کمپنی کے ملازمین کا تجارتی سلسلے میں جابرانہ اور نامنصفانہ رویہ دستک کی لعنت، کمپنی کا غیر ملکی تجارت کے لئے پرمٹ اور ان سب پر طرہ یہ کہ انگلش قوانین اور پابندی جنھوں نے انگریزی سامراج کے سرمایہ دارانہ مفاد میں انھیں بہت مدد دی۔"۲ چنانچہ دیوانی کے حقوق حاصل ہونے کے پہلے ہی سال ۱۷۴۰۰۰۰ کا اضافہ کردیا گیا جو اس سے قبل صرف ۱۱۰۰۰۰ تھا۔ ایک سرسری اندازہ کے مطابق جنگ پلاسی سے جنگ واٹرلو تک ہندوستان سے پندرہ ارب روپیہ انگلستان جاچکا تھا۔"۳ ٹیکس کی عدم ادائیگی کی صورت میں زمین کی قرقی اور نیلام کا حق دے دیا گیا۔ بقول جیمس ٹیلر James Taylor کمپنی کے ملازموں نے انسانی نعشوں پر کھڑے ہوکر محاصل اور مالیہ کا مطالبہ کیا دوران قحط بہ بریت کی تاریخ میں اس سے زیادہ خوں چکاں حوادث کا ملنا امر محال ہے کمپنی کے فلک بوس گوداموں کے سائے میں لوگ دانے دانے کو تڑپ

۱۔ انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ از عبداللہ یوسف علی۔ ص ۲

2. The Indian Awakening And Bengal — By N.S. Bose P. 3

۳۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از خورشید مصطفےٰ رضوی ص ۴۷

کر مر گئے لیکن کمپنی کے گودام بدستور بند و ہے ۔" ا

اس کے بعد دوامی بندوبست نے زمین اور اس پر حق کی تمام نوعیت بدل ڈالی۔ یہ نیا انتظام کاشتکاروں کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ سرکاری محصولات کی یقینی وصولیابی کے لئے تھا جس میں نئے زمینداروں کے اختیارات بڑھا دئے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے رعیت کی حالت اور زیادہ ابتر ہو گئی۔ لہذا یہ نئے مالکان اراضیات اور انگریزی گماشتے تو اراضی کے مالک بن گئے اور قدیم رجواڑوں اور نوابین کی اولاد نیز ہندو مسلمان زمیندار دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ علاوہ دیگر ذرائع تجارت کے چائے اور نیل کی کاشت کمپنی اور انگریزی تجار کی خاص توجہ کا مرکز بنی کیونکہ اس سے ان کے لئے کثیر منافع کے در کھل گئے۔ اس کے لئے تمام ملک میں کارخانے اور کوٹھیاں قائم ہوئیں۔ مگر کسانوں کو اس سے فائدہ پہنچنے کے بجائے خسارے کا سامنا کرنا ہوتا تھا، لہذا جبر و تشدد سے کام لیا جانے لگا۔ نیل کی تجارت کامیاب طور پر پھیل گئی مگر چائے اور نیل کے کاشتکاروں کی حالت غلاموں سے بدتر ہو گئی اور کاشتکاری بھی تباہ ہونے لگی۔" ۲

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا چند حوالہ جات میں ہمیں قدیم ہندوستانی معاشیات کے عروج و زوال کی داستان بکھری ہوئی ملتی ہے جس سے ہمیں اس زمانے کے معاشی اور اقتصادی حالات کا اندازہ ہوتا ہے مگر اسی زوال کی غضبناک کہانیوں میں ہم ان حقائق کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو نئے دور کی آمد کے لئے اسباب و علل اور نئے وسائل پیدا

ا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از خورشید مصطفٰی رضوی ص ۵۰

۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از سید طفیل احمد منگلوری ص ۷۱

کر رہے تھے ۔ مگر اول اول کمپنی اور پرائیوٹ یورپین تجار کی پالیسی اور عمل نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا ۔ بد انتظامی بے عنوانیاں اور مظالم جاری رہے ۔ تجارت بری طرح تباہ ہو گئی ۔ صنعت اور دستکاریوں کو کھوکھلا بنا دیا گیا ۔ دولت کی ہندوستان سے برآمد نے ملک کو پیداوار اور روپیہ دونوں سے محروم کر دیا ۔ ۱ جب سارا سماجی نظام ہی الٹ پلٹ ہو جائے تو اقتصادی حالت میں مذکورہ بالا تبدیلیاں کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ لازمی تھیں ۔ رفتہ رفتہ حالات سدھرنے لگے مگر اقتصادی حالت بہت سست رفتاری سے سنبھل رہی تھی ۔ لہذا ان حالات اور کمپنی کی حکومت کے نتیجے میں بنگال میں ایک نیا تجارتی طبقہ پیدا ہو گیا جو کمپنی کے ایجنٹوں، ساہوکاروں اور بنیوں نیز نئے مالکان اراضی پر مشتمل تھا ۔ گو کمپنی کے ابتدائی زمانہ حکومت میں ان کا رول عوامی مفاد کے خلاف تھا مگر زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ یہ طبقہ ایک نئی صورت میں ڈھل گیا ۔ انگریزوں سے مسلسل اور براہ راست تعلق ہونے کے باعث مغربی نظریات اور نئے حالات سے آشنا ہونے لگا ۔ ان میں سے جو نئے ذرائع تجارت سے دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے نئے سرمایہ دارانہ نظام میں اپنی جگہ بنانی شروع کر دی ۔ ظاہر ہے نئے اسباب و ذرائع اور تجارتی وسائل پر ان کی نگاہ اور معلومات پوری تھیں جن سے قدیم امراء و زمیندار بالکل بیگانہ تھے ۔

اس طرح انیسویں صدی کے آخر تک ہم ہندوستان کی اقتصادیات کو نئے نظام کے تحت ڈھلتے ہوئے پاتے ہیں ۔ جس میں مذکورہ طبقہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ہماری اقتصادیات کی باگ ڈور رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ میں آ رہی تھی ۔ یہ نئے دور میں سرمایہ دار طبقہ کی حیثیت سے پرانے امراء اور زمینداروں کا بدل تھا ۔ یہی نہیں بلکہ " بعد کے زمانہ میں اسی طبقہ کی اولاد نے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں اہم رول ادا کئے ۔ " ۲

---

1. Modern India And The West — By O'Malley P. 265
2. The Indian Awakening And Bengal — By N.S. Bose P.

جذبی لکھتے ہیں " انیسویں صدی کے نصف اول میں صنعتی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی پالیسی کے باوجود ہندوستان میں برطانوی حکومت کا کردار بعض اعتبار سے ترقی پسند تھا" ۱ اس میں شک نہیں کہ مسلسل سماجی اصلاح کے در کھل گئے۔ ستی، غلامی، بچہ کشی، بچپن کی شادی، عورتوں کی جہالت و پستی اور مظلومیت کے ختم کرنے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر کوششیں ہونے لگیں۔ پریس، اخبارات اور رسائل کے عام ہونے کے ساتھ سماجی اور سیاسی شعور بیدار ہونے لگا۔ نئی تعلیم اور مغرب آشنائی نے زندگی، سماج اور مذہب کو نئے تصورات سے وابستہ کرکے ان پر مختلف زاویوں سے نئی روشنی ڈالی۔ یقیناً ان تمام کاوشوں میں مکمل ہاتھ اسی درمیانی طبقہ کا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انگریزی حکومت کا ان سب میں اتنا ہی رول ہوتا تھا جہاں تک ان کا مفاد اور مصلحت ساتھ دیں۔

اس کے علاوہ انیسویں صدی میں ریلوے، تاربرقی، ٹیلی فون اور بجلی نے زندگی کا ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا۔ گو یہ ساری چیزیں انگریزوں کے ذریعہ ان کی ملکی ضروریات اور تجارتی مفاد کے لئے ہندوستان میں لائی گئیں مگر ان کے عام وسیع فائدوں پر پابندی ناممکن تھی۔ ان سے ملک کے ہر حصہ میں رابطہ بہت بڑھ گیا۔ تبادلۂ خیالات کے ذرایع تیز ہو گئے۔ بجلی کے ساتھ بڑی بڑی بجلی کی مشینیں اور کارخانے بھی وجود میں آنے لگے۔ یہ سب گو بہت دھیرے دھیرے ہوا پھر بھی ملکی اقتصادیات کا نیا روپ تیار ہوا۔ بے روزگار اور بے زمین طبقہ کی امیدوں کا مرکز یہی کارخانہ جات بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح دیہی آبادی کا بڑا حصہ مزدوروں کی حیثیت سے بڑے بڑے شہروں میں منتقل ہونے لگا۔

۱۔ حالی کا سیاسی شعور از معین الدین احسن جذبی ص ۲۱

۱۲۲۸۱

مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو مغرب کا لایا ہوا نیا سرمایہ دارانہ نظام جاگیرداری کو ختم کر کے اپنی جگہ بنا رہا تھا دوسری طرف انگریزی حکومت اپنے مفاد اور سہولتوں کے پیش نظر نوابوں اور راجاؤں کے ایک طبقہ کی سرپرستی کرتے ہوئے ان کی جاگیروں اور ریاستوں کو برقرار رکھ کر ہندوستان کے اس تیزی سے بدلتے ہوئے نئے معاشی نظام میں اس پیوند سے قدیم معاشی تصورات اور ان کے خاکوں کو بھی شامل اور زندہ رہنے کا موقع دے رہی تھی۔ یہاں ہمیں اس کے فائدے یا نقصان سے بحث نہیں البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ابتدا میں نئے متوسط طبقہ کا مفاد اور ہمدردیاں انگریزوں اور مغرب سے تھیں اسی طرح یہ جاگیردار طبقہ بھی اپنی سلامتی اور بقا کے لئے وفاداری کی سند کا حصول لازمی جانتا تھا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کا یورپ سے واسطہ ایسے دور میں ہوا جب یورپ میں فرانسیسی انقلاب کا دور نئی قومی وحدت اور طاقت پیدا کر رہا تھا۔ جب ترقی پسندی اور خیالات کی آزادی عروج پر تھی۔ اسباب وعلل کی تلاش عقیدت کی جگہ لے چکی تھی۔ سائنس اور اس کے عینی مشاہدات مادیت پسندی کو روحانیت پر غلبہ دے چکے تھے۔ اسی سبب سے مذہب کے مقابل سماج میں تنقیدی روایات ابھریں۔ اس کے نتیجہ میں بقول آر۔ سی مجمدار

"ہندوستان کے یورپ سے رابطہ کا سب سے اہم نتیجہ قدیم روایات، رسم و رواج اور خیالات سے اندھی عقیدت کا خاتمہ تھا۔ جو عہد وسطیٰ کا خاصہ تھا ساتھ ہی ایک آزاد اسپرٹ بیدار ہو گئی جو کسی چیز کو قبول کرنے سے پہلے تحقیق اور مباحثہ سے کام لیتی تھی۔" [1] ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کے ظہور اور اس کے اثرات کی وضاحت

---

1. Glimpses Of Bengal In 19th Century —By R. C. Majumdar P. 52

سے ہم کو اس عظیم تغیر کی اہمیت اور نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس تغیر میں بربادی کی دل سوز کہانیاں بھی شامل ہیں اور ترقی کی نئی روشن راہیں بھی تعمیر ہوتی نظر آتی ہیں۔ یہی وہ دور تغیر ہے جس کو ہماری تاریخ میں قدیم کی آخری منزل اور جدید دور کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ یہی وہ دور تغیر ہے جس نے ہمارے قدیم سماج کو نئی نظر اور نئی سمجھ نئے ذہن اور نئے وسائل دے کر جدید دور کے دامن سے وابستہ کر دیا اور اسی کے عظیم اثرات نے نیا ہندوستان پیدا کر دیا۔

لیکن یہ نئی قدریں مغرب کے فاتحوں کی لائی ہوئی تھیں جو ہمارے ملک اور یہاں کے باشندوں کے لئے نئی اور اجنبی تھیں۔ ان یوروپین فاتحوں کو ہر قیمت پر اپنا مفاد اور اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کی ضرورت اور خواہش تھی۔ اس لئے ان نئی قدروں نے کچھ ایسے زاویئے بھی بنائے جو ملک و قوم کے لئے زہریلا اثر رکھتے تھے۔ ہماری مشترکہ تہذیب جو ہندوستانی اتحاد کی صدیوں کی تاریخی داستان تھی اب منتشر ہونے لگی۔ قدیم تہذیبی اتحاد ٹوٹنے لگا۔ اقتصادی مفاد مختلف ہو گئے۔ تعلیم کے شدید فرق سے ذہنی و فکری اختلافات برآمد ہوئے۔ سوشل یگانگت تحلیل ہونے لگی تو محبت اور اتحاد کی راہیں بھی منتشر ہونے لگیں۔ گو ولی اللٰہی تحریک سے لے کر بنگال کی تمام سوشل اور مذہبی تحریکوں نے اور غدر کے بعد سرسید کی سوشل تحریک نے نئے اور پرانے ڈھنگ سے اپنے اپنے طور پر خوب کام کئے مگر ان سب کے ساتھ یہ تاریخی المیہ پس پردہ مضبوط تر ہوتا جاتا تھا۔ انگریزوں کا سیاسی مفاد پس پردہ اپنا کام کر رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ نئے دور میں بھی باوجود اپنے اپنے اعلیٰ کارناموں کے ان میں سے کوئی بھی تحریک وہ تہذیبی اتحاد قائم نہ رکھ سکی جو مغلیہ دور کا تاریخی تحفہ تھا۔ یہاں سرسید سے پہلے ہمیں بنگال کی اولین اور نئی تحریکوں کا جائزہ لینا ضروری ہے جو پہلے سوشل اور مذہبی اور پھر سیاسی قدروں کو لے کر ابھریں۔ یقیناً" یہ تحریکیں اپنی جگہ بہت اہم تھیں اور ان کے کارنامے مفید اور بہت افزا تھے مگر سب نے ہندوستان کو مذہب اور سیاست کے ذریعہ اشتراک عمل کی دعوت دی جبکہ ہندوستان میں کئی مذاہب کی رنگا رنگی دلچسپی نظر

آتی ہے۔ مگر اقتصادی و تعلیمی حالت کے شدید فرق اور سوشل انتشار نے اشتراک عمل کا موقع نہ چھوڑا تھا۔ اسی لئے سرسید نے تہذیبی بنیادوں پر اشتراک عمل ممکن اور ضروری سمجھا۔ اس نظریے کے ساتھ ہمیشہ تعلیمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور اردو ادب کو مرکز فکر و عمل بنایا۔ ان کے تمام اصلاحی مشاغل تعلیمی سرگرمیوں اور ادبی کاوشوں میں یہ نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کی وضاحت تاریخی پس منظر میں ان کی کاوشوں کو دیکھنے اور سمجھنے سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ابھی ہمیں راجہ رام موہن رائے کی تحریک پہ نظر ڈالنی ضروری ہے جو بنگال کی اہم اور نئے دور کی اولین تحریک تھی۔

باب دوم

نشاۃ ثانیہ کے عظیم اثرات

انیسویں صدی ہندوستانیوں کی تہذیبی تبدیلیوں کے لئے ایک نشان راہ ہے جس نے انھیں قدیم سے جدید میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔"[1] شاعرانہ زبان میں اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔

اک سلسلہ بننے کا، اک دور بگڑنے کا —!
اس ہستیٔ فانی کی بیدؔل یہ حقیقت ہے

انیسویں صدی کا زمانہ تاریخی اور سماجی کشمکش سے پُر، وہ اہم دور ہے جب کہ نشاۃ ثانیہ کے اثرات نمایاں طور پر ہندوستان کی سماجی زندگی میں اپنے نقوش بنانے لگے اور سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی اور اقتصادی زندگی میں ان طاقتوں اور تحریکوں کو ابھارا جس نے نئے ہندوستان کو جنم دیا۔ اس دور نے مغرب سے ہر چیز مستعار لے کر اپنی سماجی بنیادوں میں پیوست کر دینے کی کوشش کی اور اس طرح خیال و عمل کی دنیا میں ایک ہلچل مچادی

۱۔ جادوناتھ سرکار بحوالہ آر۔ سی مجمدار

پرانی قدروں کو توڑ ڈالا اور نئے مصالحہ سے اس سماجی عمارت کی بنیاد رکھی جو نئے سماج نئے دماغ اور نئے اصولوں کا حسن اپنے اندر رکھتی تھی۔

اٹھارہویں صدی کی تحریکوں کے جائزے سے ہمیں یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ گو یہ تحریکیں جدید خیالات کے بنیادی عناصر اپنے اندر رکھتی تھیں مگر عملی طور پر وہ مذہب سے اس قدر پیوست تھیں کہ ان کا پورا ڈھانچہ صرف اسلام سے وابستہ اور مسلمانوں کے مفاد سے منسلک نظر آتا تھا۔ ان تحریکوں کے گہرے سیاسی نقوش ہندوستانی مسلمانوں کی عام زندگی پر غدر کے بعد تک صاف اور نمایاں ملتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ غدر کے بعد مقابلہ کی راہیں مسدود اور سکت مفقود ہو چکی تھی۔ انگریزوں سے شدید نفرت اور ان کی لائی ہوئی ہر چیز سے گریز، اسی مخالف جوش و جذبہ کا اظہار تھا جو ان قدیم تحریکوں کی سیاسی سرگرمیوں سے وابستہ تھا۔ یہ قدیم تحریکیں عام ہندوستانیوں کو ایک سیاسی وحدت میں نہ پرو سکیں۔ "قدیم دور میں اسی سیاسی وحدت کی غیر موجودگی اور عوام میں سیاسی احساسات کی کمی سب سے اہم اسباب ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت کے قیام میں مدد دی۔"[1] اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم جاگیردارانہ نظام میں وہ ہندوستانی قومیت فروغ نہیں پا سکتی تھی جو نئے دور کی دین ہے۔ یہ بات اسی سے واضح ہوتی ہے کہ "جب انگریز مرہٹوں، گورکھوں اور دوسری طاقتوں سے جنگ آزما تھے کیوں بنگال کے باعزت اور خوشحال لوگ انگریزوں کی فتح مندی کی دعا کرتے تھے۔"[2] اس کے علاوہ جاگیرداروں کے شخصی مفادات، آپس کی مخالفتیں اور ہماری سماجی زندگی میں ذات پات کے شدید بندھن، اسی سیاسی وحدت کی تشکیل میں سد راہ تھے۔ لہذا

---

1. The Indian Awakening In Bengal By N.S. Basu P.2
2. Glimpses of Bengal In 19th Century By R.C. Majumdar P.18

قدیم سماجی و مذہبی روایات سے وابستہ ہونے کے باعث تمام سرگرمیوں اور کاوشوں کے باوجود انیسویں صدی کے آغاز ہی میں ان تحریکوں کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ تیزی سے بدلتا ہوا دور نئے وسائل اور ذرائع چاہتا تھا جن کے خد و خال اس وقت تک واضح اور صاف نہیں ہو پائے تھے۔ لہذا قدیم دور کی روایات کے ساتھ ان تحریکوں کی حکایات بھی دفتر پارینہ بن کر دفن ہو گئیں اور محبان وطن کی سرفروشیاں مذہبی سرگرمیوں کی کہانیاں بن کر رہ گئیں مگر ——

خاک میں ملتا ہے جب دانہ کوئی
پھر جنم لیتا ہے گل خانہ کوئی

لہذا حب الوطنی اور سرفروشی کا یہ بیج خاک میں مل کر اس خاکی بستر میں بظاہر کچھ دنوں آرام لیتا ہے مگر پھر نئے پیرہن کے ساتھ اس نئے روپ میں جنم لیتا ہے جسے گلستان نو کہیں یا نئے ہندوستان سے تعبیر کریں۔ ہماری تاریخ کا یہ عجیب اور دل چسپ رخ ہے کہ غیر ملکی اقتدار کی عمارت جو ہمارے سماج کی بنیادی کمزوریوں اور محبان وطن کی خاک آلودہ لاشوں پر تعمیر ہوئی تھی اور جو ہندوستان کی غلامی کا پروانہ تھی، خود اپنے اندر نشاۃ ثانیہ کے وہ واضح نقوش رکھتی تھی جس نے ہماری زندگی کے ہر پہلو میں نئے وسائل سے کام لے کر نئے چراغ روشن کئے اور آج ہماری قومی اور سماجی زندگی کی اساس ہے۔ نشاۃ ثانیہ دراصل مغربی تعلیم کے بہترین حقائق اور فراموش شدہ ہندوستانی تہذیب کی عظمت کی تجدید سے مل کر وجود میں آیا تھا۔ اس دور نے ہندوستانی **قومیت** کو مذہبی اور سیاسی روپ میں نکھارا۔ سیاسی جذبات میں جدید وسائل سے کام لیا۔ اسی دور نے وہ وسیع تحریکیں ابھاریں جو نئے زمانے کی ہمنوا تھیں اور جنہوں نے ہمارے لئے اصلاحات کا نیا سلسلہ کھول کر نئی منزلوں کا پتہ لگایا اور سوشل، ادبی، مذہبی اور سیاسی میدانوں میں نئی راہیں متعین کر دیں۔

اسباب وعلل ہزار ہوں مگر جب تک انھیں سمجھنے والی نظر اور تربیت دینے والا ذہن موجود نہ ہو کوئی نکھار راہ نہیں کھل سکتی اور نہ کسی منزل کا تعین ہو سکتا ہے یہاں پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مغربی بیداری ہندوؤں اور مسلمانوں میں الگ الگ اور مختلف زمانوں میں وجود میں آئی۔ چنانچہ غدر کے سو سال پہلے سے غدر تک جب کہ بنگال میں نئی بیداری سرعت سے پھیل رہی تھی مسلمان اس سے بالکل بے بہرہ اور بے خبر تھے بلکہ مغرب کی ہر چیز سے الگ رہنے اور بچنے کی کوشش کرتے تھے حتیٰ کہ غدر کے بعد سرسید نے اس کمی کو پورا کرنے اور مسلمانوں میں مغربی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک مسلمانوں میں قدیم ولی اللّٰہی تحریک کے اثرات سے سید احمد شہید بریلوی کی سیاسی تحریک قدیم عملی سرگرمیوں کے ساتھ نہایت مقبول ہو رہی تھی اور ان کے اثر سے دیگر باغی تحریکیں مذہبی رنگ میں جاری وساری تھیں۔

انھیں تحریکوں کے متوازی اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک ہندوؤں میں خصوصاً بنگال کے علاقے میں مغربی اثرات بہت تیزی سے مقبول ہوتے جاتے تھے اور ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مغربی اقدار کا علمبردار تھا۔ اب ہمیں ان نئی تحریکوں کا جائزہ لینا ہے جو مغربی تعلیم کے سبب ظہور میں آئیں۔ ہندوستان کی مغربی بیداری میں اولین اور اہم ترین رول بنگال کا ہے۔ بنگال جو قدیم دور میں قدیم تہذیبی مراکز سے دور اس حیثیت سے غیر اہم مقام تھا انگریزوں کے ورود وقیام کے ساتھ ہندوستان میں مغربی تہذیب کا مرکز . . . . . . اور مغربیت کا دل بن گیا۔ جس کی تیز حرکت ہندوستانی سماج میں محسوس کی جانے لگی۔ اس کی پکار پر ہزاروں لاکھوں نے نئے زمانے کی آواز سنی اور سمجھی مگر جن لوگوں نے سنی اور سمجھی ان میں مسلمان بالکل نہ تھے۔ بنگال میں نشاۃ ثانیہ نے جو تحریکیں ابھاریں ان میں مذہبی اور سوشل ملی جلی تحریکیں

شامل تھیں جن میں بعد کو سیاست نے اہم جگہ بنالی یہی وہ تحریکیں ہیں جنھوں نے مغربی علوم کو اپنانے اور مذہبی، سوشل اور سیاسی رجحانات میں نئی راہیں متعین کر کے اولیت حاصل کی۔ انھیں تحریکوں کے ذریعہ انیسویں صدی کے آخر تک بنگال نے پورے ہندوستان کا نیا مزاج بنانے میں کامل رہبری کی۔ "ان تحریکوں نے مغربی علوم اور تہذیب کو مکمل طور پر خوش آمدید کہہ کر اپنایا مگر ساتھ ہی ایک خالص ہندوستانی اور قومی جذبہ کا احساس ہوا اور نئے وسائل کے ذریعے انھوں نے ایک نئی ہندوستانی قومیت اور قدیم عظمت کو بیک وقت ابھارا۔ بغیر ایک قومی شعور اور فخر کے اصلی نشاۃ ثانیہ کا وجود ممکن بھی نہ تھا۔" ۱

انیسویں صدی کے آغاز سے ان تحریکوں کا بڑھتا ہوا زور اور بنگالی عوام میں نئے مغربی تصورات کا غلبہ نمایاں ہوتا رہا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ان منشیوں اور پنڈتوں کا ایک خاصا گروہ بن گیا جو سنسکرت اور ہندی کی تعلیم اور ترجمے کے لئے رکھے گئے تھے۔ ان لوگوں کو انگریزی زبان سے کم وبیش واقفیت ہونے لگی۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کا وہ گروہ جو کمپنی اور انگریز تجار کی ملازمت میں آتا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے سابقہ سے ان کے خیالات سے متاثر ہونے لگا تھا مگر "علمی سرگرمیوں کی اولین نشان دہی ہمیں راجہ رام موہن رائے کی شخصیت میں ملتی ہے۔" جن کی ہندو مذہب اور سماج کی اصلاح کی ان تھک کوششوں نے بنگال میں نشاۃ ثانیہ کے لئے راہ صاف کر دی اور اس طرح نئے بنگال کی بنا قائم کی۔" ۲ ۱۸۱۷ء میں جب راجہ رام موہن رائے نے بڑی کوششوں سے جس میں گورنمنٹ کی اعانت بھی شامل تھی ہندو کالج قائم کیا تو ایسے لوگوں کی ہمدردی اور مدد بھی انھیں ملی جو پہلے سے کچھ نہ کچھ

1. Studies In Bengal Renaissance — By A. C. Gupta P. 513

2. Ibid P. 512

انگلش سے واقفیت رکھتے تھے اور اس کی اہمیت کو سمجھنے لگے تھے اس کالج کے ساتھ سائنس اور نئے علوم مغربی کا دروازہ بنگال پر کھل گیا۔ ہندو کالج کے طلبا میں پروفیسر ڈیروزیو Prof. Derozio کے اثر سے ہر مسئلہ پر آزادانہ طور سے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ مقبول ہوا۔ یہ پروفیسر طلبا میں بہت پسندیدہ تھا۔ کالج کے طلباء میں ڈیروزیو Derozio کے اثر سے آزادی کی شدید تمنا اور حب الوطنی کا پرجوش شعور پیدا ہوا" ۱ ان طلبا میں یہ احساس ہونے لگا کہ قدیم بنیادوں کو ہلائے بغیر ترقی یافتہ اور نئے سماج کی تعمیر ناممکن ہے مگر یہ احساس اپنے اندر ایک باغیانہ رجحان رکھتا تھا۔ ان کے نزدیک ہر قدیم چیز ٹھکرا دینے کے لائق تھی۔ چنانچہ ہندو کالج کے اولین اور ذہین ترین طلباء میں سب سے پہلے ہندو سماج کی مذہبی اور سوشل روایات کے خلاف بغاوت کا مادہ پیدا ہو گیا۔ اسی رجحان نے نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا جو قدیم ہندوستانی سماج کے خلاف باغیانہ اور منافرت کے جذبات رکھتا تھا۔ اس گروہ کو ینگ بنگال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن کی باغیانہ پکار لال بہاری ڈے کے الفاظ میں "ہندو ازم مردہ باد۔ قدامت پسندی مردہ باد تھی۔" ۲

اس رجحان کے اثر سے قدامت پسند طبقہ میں ہیجان پیدا ہو گیا اور مذہب کی حمایت میں عقائد اور رد میات کی صحت پر مباحثے ہونے لگے۔ یہ قدامت پسند گروہ ہر نئی چیز اور اصلاح کے خلاف احتجاج کرتا تھا اور مروجہ روایات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر وقت کا تقاضہ کچھ اور تھا جوان کی آواز کو گنبد کی گونج کی مانند انھیں تک محدود کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اسی دور کا پیدا کردہ ایک وہ طبقہ بھی تھا جو مغربی

---

1. Glimpses of Bengal In 19th Century — By R.C. Majumdar P. 40
2. Indian Awakening And Bengal — By N.S. Bose P. 40

تعلیم کے اثر سے ہر چیز کو علم و عقل کی روشنی میں دیکھنے لگا تھا۔ وہ اسباب و علل پر غور کرنے اور خیال و عمل کی آزادی کا حامی تھا مگر مغرب پسندی کے باوجود وہ ویدوں کی تعلیم کے بنیادی اصولوں پر زور دیتے ہوئے مذہب کی روحانی عظمت کی تجدید چاہتا تھا۔ ساتھ ہی غلط روایتی بندھنوں کی اصلاح کر کے قدیم کو جدیدیت و مغربیت سے آشنا کرنے اور ہندوستانی بیداری کا ایک نیا نشان راہ قائم کرنے میں کوشاں تھا۔ لہٰذا بنگال کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پہلی نسل آزاد خیال نکلی جس نے اس راہ پر شدت پسندی سے کام لیا ان کی دوسری نسل میں قومیت کا احساس و شعور بیدار رہوا۔ انھیں قدیم عظمت کو جگانے میں فخر محسوس ہونے لگا۔ اس گروہ کی اولین اور اہم ترین رہبری راجہ رام موہن رائے نے کی۔

راجہ رام موہن رائے نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا برہمنی اقتدار ساری سوسائٹی پر چھایا ہوا تھا۔ مذہب کے نام پر ان گنت بندشیں افراد کی آزادی کو سلب کرتی تھیں۔ اور ہندو سماج کلی طور پر اس بوجھ کے نیچے دب گیا تھا۔ مشترکہ ہندو مسلم کلچر جو پچھلی کئی صدیوں میں کچھ نئے زاویے بنانے میں کامیاب ہوا تھا اور کچھ زیادہ ترقی یافتہ بھی تھا اب مغلیہ زوال کے دامن سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اسی مشترکہ کلچر کی سب سے اہم نشانی ہندوستانی زبان تھی۔ "مغلوں کے زمانے تک مسلمانوں میں زیادہ تر ہندوستانیت آچکی تھی۔ اب ان کی حکومت غیر ملکی حکومت نہیں تھی بلکہ مشترکہ تہذیب و خیال کا ایک خاص طبقہ تشکیل پا چکا تھا۔"[1] مگر اس مشترکہ کلچر کا اثر اس وقت تک ہندوستانی سماج میں اس درجہ تکمیل کو نہیں پہنچ پایا تھا جو تمام ہندوستانیوں کو ایک تہذیبی وحدت میں سمیٹ چکا ہوتا۔ یہ عملی تبدیلی ابھی تشکیل کے حدود میں تھی کہ انگریزی اقتدار اس پر مسلط ہونے لگا۔ گو قدیم عظمت کا چراغ اب گل تھا مگر اس

---

1. Modern India And The West — By O'Malley P.8,9

اندھیرے میں مغرب اور اس کے لائے ہوئے وسائل نئے زمانہ کی پکار بن کر چھائے جا رہے تھے۔ انگریزی اقتدار مغرب کی فوقیت کو غالب تر بنا رہا تھا۔ چنانچہ اس تغیر پذیر دور میں ہر طرف ایک کشمکش جاری تھی۔ ایسے نازک وقت میں راجہ رام موہن رائے نے صحیح طور پر یہ محسوس کیا کہ ہمارا سارا نظام اس مضبوط چٹان کی مانند ہے جو بہت سخت ہے مگر سربفلک چوٹی کے ایسے کنارے پر اٹکی ہے جہاں سے بہتے پانی کی ایک نرم دھار بھی اسے اتھاہ گہرائیوں میں بہاکر چور کر دینے کے لئے کافی ہے اور مغربی غلبہ وہی دھارے ہے جو اسے بہا کر رہے گی۔ چنانچہ اپنی بقا کے لئے پائندہ تر اور ٹھوس سماجی بنیادوں کی تعمیر لازمی ہے۔ انھوں نے خیال و عمل کی آزادی کو اس کام کے لئے بنیادی اور مرکزی اہمیت دی اور ویدوں کی اصلی تعلیم کو پیش کر کے قدیم تاریخی عظمت کا احساس پیدا کیا۔

لہذا اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں اولین ہاتھ راجہ رام موہن رائے کا ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور ان کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔ "وہ بیسویں صدی کے عظیم معمار تھے جنھوں نے نئی راہ متعین کر دی اور اس راہ سے تمام کٹھن رکاوٹوں کو دور کیا جو ہماری ترقی میں ہر قدم پر سد راہ تھیں۔ انھوں نے موجودہ دنیا میں ہمیں انسانی وحدت اور بین الاقوامی ملت سے قریب تر کر دیا۔" ۲

راجہ رام موہن رائے نئے دور کے نقیب تھے اور اس کی قدر و قیمت نہایت اچھی طرح پہچانتے تھے مگر اس کے باوجود ان کی زندگی اور خیالات کا خاصہ یہ تھا کہ وہ مغربی اور مشرقی تہذیب کی حقیقتوں کو دونوں کی اصلیت اور ان کے حسن کے امتزاج سے واضح کرنا چاہتے تھے۔ مغرب پسندی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کیا بلکہ اس میں

---

1. Studies In Bengal Renaissance — By A.C. Gupta P. 8

ہندوستانی عظمت سمو دینے کی کوشش کی۔ اسی چیز نے انھیں کامیاب کیا۔

راجہ رام موہن رائے نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی مکمل تعلیم کے ساتھ وسیع النظری حاصل کر لی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب کی روح در اصل عقائد کی بنیاد ہے جو ہر مذہب میں یکساں ہے۔ باقی فرق ظاہری لوازمات میں ہے۔ انھوں نے تکمیل تعلیم بڑی لگن سے کی عربی اور فارسی پر عبور اور مذہب اسلام سے واقفیت خاص طور پر پٹنہ میں قیام کر کے اسلامی مدرسہ سے حاصل کی۔ پھر تبت گئے اور بودھ مذہب کی تعلیمات سے آشنا ہوئے۔ تبت سے واپسی پر سنسکرت اور ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم بنارس سنسکرت کالج میں مکمل کی جو ۱۷۹۲ء میں وہاں کے انگریز ریزیڈنٹ بانتھن ڈنکن Bonthon Duncon کے ذریعہ قائم ہوا تھا۔ یہاں ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ موجودہ مذہبی روایات اور سماجی ڈھانچہ سے ویدوں کا تعلق کم اور خود ساختہ بندھنوں کا غلبہ زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے انھیں ہندو مذہب کے اصلی اور خالص اصولوں سے گہری عقیدت تھی۔"[1]

انگریزوں سے مستقل رابطہ اور انگریزی سیکھنے کا موقع انھیں اس وقت ہوا جب ۱۸۰۳ء میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریوینو ڈیپارٹمنٹ (محکمہ مالگذاری) میں ٹامس وڈفورڈ کے دیوان کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۹ء میں ڈگبے Digbe کی ماتحتی میں ان کے ساتھ رنگپور میں قیام کیا اور اسی کے اثر سے انھیں مغرب سے دلچسپی اور آگاہی پیدا ہوئی انھوں نے انگریزی سیکھنی شروع کی اور بہت جلد اس پر عبور پا لیا۔ وہ تمام انگریزی رسائل اور اخبارات کا مطالعہ کرتے جو ڈگبے Digbe کے پاس آتے تھے۔ اس طرح مغربی خیالات اور تصورات پر ان کی نظر گہری اور وسیع ہو گئی۔ یہی ان کی زندگی کا وہ اہم زمانہ تھا جب کہ وہ اپنی آئندہ خدمات کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

---

1. Studies In Bengal Renaissance — By A.C. Gupta P. 9

اسی زمانے میں انھوں نے مختلف مذاہب کے علماء سے تبادلہ خیالات کر کے اپنی معلومات اور علمی لیاقت میں اضافہ کیا۔ ۱۸۱۴ء میں ڈبگے کی انگلینڈ واپسی کے بعد ترک ملازمت کر کے کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں سے ان کی وسیع اصلاحات کا دور شروع ہوتا ہے، جس میں مذہبی اصلاحات کو زبردست دخل حاصل ہے۔

راجہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے ہندو مذہب کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔ اس سلسلے میں ان کا مقصد خالص ویدوں کی تعلیم توحید تھا۔ چنانچہ سب سے اول انھوں نے مذہبی عقائد سے بحث شروع کی۔ آر۔ سی مجمدار اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں۔ "رام موہن رائے مذہبی اور سماجی بنیادوں میں عقلیت پسندی کے سب سے بڑے اور اولین نمائندہ تھے۔ انھوں نے مروجہ عقائد اور سماجی روایات پر اعتراض کیا کہ یہ ان کی اپنی مذہبی کتاب کے موافق نہیں ہے اور مورتی پوجا کا طریقہ جو مذہب کا جزو خاص بن گیا ہے وید کی تعلیم کے خلاف ہے۔"[1] مذہبی روایات پر اس کا کتنا اثر ہوا اس سے قطع نظر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کھلے احتجاج نے ایک اندھی تقلید کا رخ موڑ دیا۔ برہمنی اقتدار کا اثر کم ہونے لگا اور خیال و عمل کی آزادی کے راستے کھلنے لگے" انھوں نے محسوس کیا کہ وید کو بہت موثر طریقہ سے رسوم پرستی اور اوہام کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔"[2] ۱۸۱۵ء میں انھوں نے آتمیہ سبھا قائم کی جس کے ہفتہ وار جلسوں میں متوسط طبقے کے باحیثیت اور بااثر لوگ شریک ہوتے اور مذہبی موضوعات پر بحثیں ہوتیں۔ اسی دوران اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت کے لئے انھوں نے مختلف کتابیں اور مضامین لکھے۔ انھوں نے ویدوں اور اپنشدوں کا پہلی بار

---

1. Glimpses of Bengal In 19th Century — By R. C. Majumdar P. 53

2. Modern Indian Thought — By V. S. Narvane P. 28

بنگالی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کو یقین تھا کہ ان کے مقاصد کی کامیابی میں یہ ترجمے معاون ہوں گے۔ وہ مورتی پوجا کے خلاف تھے مگر ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ کم مذہبی صلاحیت رکھنے والوں کے لئے جاری کیا گیا تھا۔

راجہ رام موہن رائے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے بھی بہت متاثر تھے اور عیسائیوں کے یونیٹیرین Uniterian گروہ سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی اور مسٹر آدم کی متحدہ کوششوں سے ۱۸۲۰ء میں یونیٹرین سوسائٹی قائم ہوئی جس میں عبادت کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ بائبل کے مختلف حصے بھی پڑھے جاتے تھے۔ لہذا انگریز افسران اور سوسائٹی کے عیسائی ممبران کی مکمل ہمدردی اور امداد تمام سوشل اور تعلیمی کاموں میں انھیں حاصل ہوتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر اس امید میں تھے کہ راجہ رام موہن رائے بہت جلد اپنی عیسائیت کا اعلان کر دیں گے۔ ادھر قدیم حلقوں میں اس کی وجہ سے ان کے خلاف نفرت تھی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ راجہ رام موہن رائے نے خود کو سوائے ہندو کے اور کچھ نہیں کہا اور انھوں نے ہندوازم کو مشنریوں کے سخت حملوں سے بچانے کی کوشش کی ۔[1] راجہ رام موہن رائے نے عہد نامہ قدیم و جدید Testaments کے گہرے مطالعے کے بعد مسیحی تعلیمات پر ایک کتاب لکھی جس کے ساتھ ہی تثلیث کے مسئلہ پر مشنریز سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ سیرام پور مشنری نے اس پر سخت اعتراض کیا اور مباحثوں کے ساتھ ہندو مذہب پر شدید حملے شروع کئے۔

چنانچہ راجہ رام موہن رائے نے ویدک مذہب کی توضیح کے لئے برہمنیکل میگزین جاری کیا اور ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۳۰ء میں اس کی ایک الگ

---

1. The Indian Awakening And Bengal
— By N.S. Bose P. 28

عبادت گاہ تعمیر ہوئی جہاں اس کے قانون کے مطابق ہر ذات کے لوگ عبادت میں شریک ہو سکتے تھے۔ پھر بھی شدید مخالفت کے خیال سے اس پر عمل نہ ہو سکا اور شدروں کی وہاں رسائی نہ تھی۔ "راجہ رام موہن رائے نے جنیو قائم رکھا اور عملی طور پر مقدس گائتری کی پوجا کرتے تھے۔"[۱] وہ خود کو ہمیشہ ہندو کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اصلاحی کاموں میں زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں۔ "راجہ رام موہن رائے کا خیال تھا کہ ویدوں کی تعلیم کی تجدید ہندوستانی سماج کی اصلاح اور نئے ہندوستان کی تعمیر میں گہرا اثر ڈالے گی۔ انھوں نے سچے مذہب کی اشاعت جیسا کہ ویدوں میں دی گئی ہے برہمو سماج کے مقصد کے طور پر شروع کر دی۔"[۲] وہ مسیحی تعلیم کے بڑے مداح تھے مگر اس کی وجہ سے ویدوں سے ان کی عقیدت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انھوں نے عیسائیت کے اخلاقی اصولوں کو سمجھنے کے بعد ہندو مذہب سے انحراف نہیں کیا بلکہ اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کی اصلاح کو اپنا مقصد بنا لیا۔ اس مقصد کے لئے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔[۳] برہمو سماج صرف مذہبی عقائد سے متعلق تحریک نہ تھی بلکہ اس کا کردار بنگال کی اولین اور پر اثر تحریک کا ہے۔

راجہ رام موہن رائے صرف مذہبی مصلح نہیں تھے بلکہ ایک بڑے سوشل ریفارمر بھی تھے۔ جنھوں نے سماجی اصلاح میں اپنی عمر صرف کر دی چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "ہندوؤں کی موجودہ مذہبی روایات ان کے سیاسی مقاصد کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ ذات پات کی تفریق اور پھر اس میں بھی مختلف گروہوں کی تقسیم انھیں سیاسی شعور

۱۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ از عبد اللہ یوسف علی۔ ص ۱۸۵

2. History of Indian Social and Political Ideas — By B. B. Majumdar P. 249

3. Modern India And The West — By O'Malley P. 67

سے بالکل محروم کر دیتی ہے۔ اس لئے کم از کم ان کے سیاسی اور سوشل فوائد کے لئے مذہبی روایات میں تبدیلی لازمی ہے۔"[1] انھوں نے سماجی اور سیاسی بیداری نئے مذہبی ذرائع سے پیدا کی مگر اس کے بنیادی عناصر میں قدیم عظمت شامل کر دی۔ صوفیا ڈابسن کالٹ Sophia Dobson Collet لکھتی ہیں۔ "ان کے جاری کردہ ویدانت کالج اور ویدوں کے تراجم نے یکساں کام کیا اور اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کو ترقی یافتہ مستقبل سے جوڑنے اور اس کی تعمیر کے لئے مسلسل جہد کی۔"[2]

اس زمانے میں قدیم نامنصفانہ رواجوں کا خاص شکار عورتیں تھیں۔ راجہ رام موہن رائے نے عورتوں کی بھلائی کے لئے خاص کام کیا۔ سماجی اصلاح کے سلسلے میں ان کا سب سے اہم کارنامہ رسم ستی کے خلاف جنگ تھی۔ اس کے لئے انھوں نے مضامین لکھے، گورنمنٹ میں درخواستیں اور عرضداشتیں پیش کیں کہ اسے قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ انھوں نے مردوں کی کئی کئی شادیوں اور بچپن کی شادی کی سخت مخالفت کی۔ ذات پات کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی ذات پات کی تفریق ہمارے سماج کو ٹکڑوں میں تقسیم کئے ہوئے ہے۔ یہ ہمارے اتحاد اور حب الوطنی کے احساس نیز سماجی ترقی میں حائل ہے۔ انگریزی تعلیم جو بلاشبہہ ہماری نئی بیداری کا خاص سبب بنی۔ راجہ رام موہن رائے اس کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہمیشہ اسے عام کرنے میں کوشاں رہے۔

---

1. History of Indian Social And Political Ideas — By B.B. Majumdar P. 24

2. The Life And Letters of Raja Ram Mohan Roy — By S.D. Collet P. 192

ہندو کالج کے قیام میں انھوں نے خاص کوشش اور مدد کی جس میں انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دئے جانے کا خیال تھا۔ یہ کالج ۱۸۱۷ء میں کلکتہ میں قائم ہوا۔ قدامت پسندوں کی مخالفت کے باعث انھیں کالج کمیٹی سے الگ ہونا پڑا کیونکہ وہ لوگ ان کے عقائد اور خیالات کو نفرت اور شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ راجہ رام موہن رائے نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور ہمیشہ کالج کی ترقی کے خواہاں رہے۔

انھوں نے اینگلو ہندو اسکول کے نام سے ایک انگلش اسکول بھی قائم کیا۔ جہاں تعلیم ہوتی تھی اور جو خاص طور پر راجہ رام موہن رائے اور ان کے چند دوستوں کی امداد پر چلتا تھا۔ یہ اسکول ۱۸۲۹ء میں انڈین اکیڈمی Indian Academy کے نام سے مشہور ہوا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اہم کام یہ کیا کہ عیسائی مشنریوں کو انگریزی تعلیم کی خصوصی اشاعت پر آمادہ اور متوجہ کیا۔ مشہور مشنری ماہر تعلیم ڈاکٹر ایلکزینڈر ڈف Dr. Alexender Duff ہندوستان آیا تو رام موہن رائے نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور ایک انگلش اسکول قائم کرنے میں اس کی مدد کی۔ تعلیمی سلسلہ میں ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ جب گورنمنٹ نے سنسکرت کالج قائم کرنا چاہا تو ۱۸۲۳ء میں راجہ رام موہن رائے نے لارڈ ایمہرسٹ Lord Amherst کو خط لکھا اور بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی اور انگریزی تعلیم کی اشاعت اور انگلش اسکول کے قیام کے لئے پر زور مطالبہ کیا (فٹ نوٹ نمبر ۱) ا حالانکہ یہ بات قدیم حلقوں میں بہت ناپسند کی گئی مگر انھوں نے اس کی ضرورت اور اہمیت محسوس کرتے ہوئے اپنی کوششوں سے مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم کے لئے راہ ہموار کر دی۔ آخر کار گورنمنٹ نے ان کی تجویز اور مطالبے کو قبول کر لیا۔

۱۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر (۱) باب دوئم)۔ ص ۳۱۲

راجہ رام موہن رائے نے اپنے خیالات کی اشاعت کا خاص ذریعہ صحافت کو بنایا۔ سمبد کومودی بنگالی زبان میں ان کا ہفتہ وار رسالہ تھا جو ۱۸۲۱ء میں جاری کیا گیا۔ اس میں ہر طرح کے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی مضامین نکلتے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی خبریں شایع ہوتی تھیں جس کے بارے میں صوفیا ڈوبسن کالیٹ Sophia Dobson Collet راجہ رام موہن رائے کی سوانح عمری میں لکھتی ہیں۔ "ایک اخبار جو خصوصی طور پر ملکی باشندوں کا چلایا ہوا اور ملکی زبان میں ہے۔ ہم لوگ اسے اخبار نویسی کی ابتدا اور راجہ رام موہن رائے کو ملکی صحافت کا موجد کہہ سکتے ہیں"۔ ۱ سیرت الاخبار ان کا فارسی ہفتہ وار رسالہ تھا۔ یہ دونوں رسالے بلند پایہ صحافت کی مثال تھے۔ راجہ رام موہن رائے اور ان کے اصلاحی خیالات نے صحافت ہی کو فروغ نہیں دیا بلکہ ۱۸۲۳ء میں پریس کی آزادی کے لئے کوشش کی اور ہائی کورٹ میں پریس آرڈی ننس کے خلاف ایک عرضداشت بھیجی پھر پریوی کونسل میں بھی ایک یادداشت بھیجی۔ ان کا یہ احتجاج ایک اولین سیاسی بیداری کا پتہ دیتا ہے ۱۸۲۷ء میں انھوں نے جیوری ایکٹ کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۸۳۰ء میں انھوں نے معافی کی زمینوں پر ٹیکس عائد کرنے کے خلاف آواز اٹھائی اور کمپنی چارٹر کی تجدید کے موقع پر پھر اس کے لئے احتجاج کیا۔ اس طرح انھوں نے ایک تنظیمی اتحاد اور سیاسی بیداری کو پروان چڑھایا۔ بورڈ آف کنٹرول سے اپنی خط و کتابت میں انھوں نے رعیت کی مفلسی اور بری حالت کو واضح کیا۔ ٹیکس بڑھائے جانے کی مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ زمینوں کا ٹیکس کم کیا جائے تاکہ رعیت پر بھی یہ بوجھ کم ہو۔ انھوں نے تجویز کی کہ اس کی آمدنی کو تکلفات کی اشیاء پر ٹیکس بڑھا کر پورا کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی گرتی ہوئی اقتصادی حالت کے پیش نظر جبکہ ہر سال ہندوستان کی دولت یورپین سوداگروں کے ذریعہ ملک کے باہر جاتی رہتی تھی اور اس کے بدلے کچھ واپس نہیں ملتا تھا

The Life And Letters of Raja Ram Mohan Roy
— By S.D. Collet P. 169

راجہ رام موہن رائے نے اس چیز کو روکنے کے لئے یہ تجویز کی کہ یورپین امیر سوداگروں کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ مع اپنے خاندان کے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرلیں ان کا خیال تھا کہ اس سے ہندوستان کی سوشل حالت بہتر ہو جائے گی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ راجہ رام موہن رائے نے تعلیمی اور سماجی اصلاحات .... کے سلسلے میں تاعمر کاوشیں کیں۔ انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی اشاعت میں پورا حصہ لیا۔ صحافت کو فروغ دیا بنگالی ادب کی ترقی میں بھی کوشش کی مذہب کی بنیادی روح پر زور دیا اور ویدوں کی روحانی تعلیم کی تشریح کی۔ مذہب میں تمام رواجی چیزوں کی ایک سرے سے تردید کی۔ سیاست میں دلچسپی لی اور اس سلسلے میں عوامی بھلائی کے لئے گورنمنٹ سے دوستانہ مطالبے کئے۔ ان سب خدمات کے ساتھ بنگال میں مغربی بیداری پیدا کردی۔

یقیناً راجہ رام موہن رائے کی تحریک بنگال کی تمام سوشل، سیاسی، مذہبی اور ادبی تحریکات کا نقطۂ آغاز تھی۔ گو مغرب سے رابطہ نے اسباب و وسائل پیدا کر دئے تھے۔ مگر اس تحریک نے ایک طرف تو تمام مروجہ مذہبی روایات اور سوشل اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ دوسری طرف ان عظیم دماغوں کی نشوونما میں خاص حصہ لیا جو انیسویں صدی اور اس کے بعد کے ہندوستان کی قومی تشکیل و رہبری کرتے رہے۔ اور تمام سیاسی سماجی اور ادبی ترقیوں میں مسلسل کوشاں رہے۔ یہی راجہ رام موہن رائے کی کامیابی کی سند ہے۔ انیسویں صدی کی تمام تحریکیں سوشل ہوں یا مذہبی، تعلیمی ہوں یا سیاسی، یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ نئے بنگال میں برہمو سماج کی سوشل اور مذہبی سرگرمیاں اپنی اولیت اور گہرے اثرات کے باعث اہم ہیں۔ اس نے ویدک تعلیم کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ ذات پات کے فرق کے خلاف آواز اٹھائی۔ بہلی بار بتی، بچپن کی شادی، بیوہ کی بری حالت وغیرہ سماجی خامیوں کی اصلاح کی مسلسل کوششیں شروع کیں۔

برہمو سماج کی سرگرمیوں اور راجہ رام موہن رائے کی خدمات کے گہرے اثرات اور نقوش ہمیں بنگال کی تمام تحریکوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ اسی کے اثرات تھے کہ ہر طرح کی تحریکات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۳۹ء میں دیبندر ناتھ ٹیگور نے تتو بودھنی سبھا قائم کی " اس سوسائٹی نے اس وقت کے بے غرض روشن خیال اور

عالم اشخاص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس نے ہندوستان کی مذہبی میراث کے بہت اعلیٰ اور شاندار رخ کو دوسرے ممالک میں پھیلانے میں بہت اہم حصہ لیا۔" ۱ تتوبودھنی پتریکا میں مہابھارت کے بنگالی ترجمے شایع ہوئے۔ دوسرے ہی سال تتوبودھنی پاٹھ شالہ قائم کیا۔ جس کا مقصد انگریزی علوم اور سائنس و ادب کی تعلیم بنگالی ورنیکیولر کے ذریعے دینا تھا۔ اس سبھا کے بارے میں اتول چندر گپتا اظہار خیال کرتے ہیں۔" اس نے فوری طور پر اپنی کوششوں کے ذریعہ دو اہم سیاسی نتائج حاصل کئے۔ ایک تو اس نے ہندو قومیت کو بیدار کیا دوسرے ایک متحدہ ہندوستان کے نظریئے کے ساتھ زمینداری ایسوسی ایشن بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی جیسے ادارے وجود میں لائی۔ ۱۸۵۱ء میں یہ دونوں برٹش انڈین ایسوسی ایشن میں ملادی گئیں۔" ۲

غرض ان تحریکات کے ساتھ بے شمار ادبی اور سوشل ادارے وجود میں آنے لگے ان کے قیام کے ساتھ بنگالی زبان و ادب کی ترقی، بنگلہ میں تعلیم کا سلسلہ، تعلیم نسواں اور ترقی نسواں کے لئے کوششیں، عام تعلیمی ترقی، اسکول اور کالجوں کا قیام جس میں لڑکیوں کے اسکول بھی شامل تھے۔ سائنس کی تعلیم کی طرف بڑھتا ہوا رجحان اور سوشل و کلچر ترقیوں کی مسلسل کوششیں ہونے لگیں۔" ۱۸۴۳ء میں کلکتہ کے ایک کروڑپتی منی لال نے ایک نیا کالج قائم کیا جس میں پانچ سو طلبا کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اور جس کا مقصد اس کے ایک اجلاس میں یوں بیان کیا گیا کہ ہندوؤں میں تعلیم کی اشاعت، تاکہ وہ لوگ قابل اعتماد اور اچھے سرکاری عہدے اپنے ملک میں حاصل کر سکیں۔" ۳

۱۸۵۶ء میں فیملی لٹریری کلب کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم ہوا جس میں لال بہاری ڈے، دیبندرناتھ ٹیگور اور کے ایم بنرجی وغیرہ شامل تھے۔ ۱۸۵۱ء میں بیتھون سوسائٹی قائم ہوئی۔ بیتھون Bathovin کا نام بنگال میں تعلیم نسواں کے بہت بڑے مربی کی حیثیت سے یاد رکھنے کے لائق ہے۔ ہندو گرلز کالج جو بعد میں

---

1. Modern Indian Thoughts — By V.S. Narvane P. 33
2. Studies In Bengal Renaissance — By A.C. Gupta P. 44
3. Glimpses of Bengal in 19th Century By R.C. Majumdar P. 47

بیتھون کالج مشہور ہوا اُن کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ بیتھون Bathovin کا کہنا تھا کہ جب تک اونچے گھرانوں کے حضرات اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں نہ بھیجیں گے تعلیم نسواں ناممکن ہے۔ بنگال میں تعلیم نسواں کا یہ سب سے اہم ادارہ تھا بیتھون Bathovin نے ۱۸۵۰ء میں ایشور چندر ودیا ساگر کو اس کالج کا سکریٹری بنایا تھا۔ وہ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے اور ان کی کوششوں سے گورنمنٹ کی سرپرستی میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء کے ایک سال کے قلیل عرصے میں لڑکیوں کے تیس اسکول کھولے گئے۔" ۱ یہ سوسائٹی ۱۸۵۹ء میں الکزینڈر ڈف Alexender Duff کی صدارت میں بہت ترقی کر گئی۔ اس کے چھ شعبے بنائے گئے، جس میں ادب، آرٹ، سائنس، صحت، ادبیات، سوشیولوجی اور ترقی نسواں پر الگ الگ شعبے میں بانٹ کر کام شروع کئے گئے۔

ودی وت ساہنی سبھا ۱۸۵۳ء میں کالی پرو سننا سنہا کے ذریعے قائم ہوئی جس کا مقصد بنگالی زبان و ادب کی ترقی اور مصنفوں کی ہمت افزائی تھی۔ بیتھون سوسائٹی کے تمام ممبران اس کے ممبر تھے۔ بدھیانتی سہد ید سمیتی ۱۸۵۴ء میں کشور چندر مترا نے قائم کی جس کے پہلے صدر دیبندر ناتھ ٹیگور تھے۔ یہ ایک سوشل ادارہ تھا، جس میں ہر قسم کے سوشل مسائل پر آواز اٹھائی گئی۔ اترپارا ہتکاری سبھا جس کے اخراجات کے لئے پیارے موہن بنرجی نے اپنی ساری جائداد دے دی تھی۔ میری کارپنٹر Mary carpenter نے جو ۱۸۶۶ء میں ہندوستان آئی تھی اس سبھا کے بارے میں لکھا ہے۔" اس کا مقصد غریبوں کو تعلیم دینا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا، مفلسوں کو کپڑے پہنانا، غریب بیماروں کو دوا دینا، غریب بیواؤں اور یتیموں کی امداد کرنا اور بنگال ٹیمرنس سوسائٹی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کے مقاصد پورا کرنا تھا۔" ۲

اس طرح ہیر پرائز فنڈ کمیٹی ڈیوڈ ہیر David Hare کی یادگار کے طور پر

---

1. Glimpses Of Bengal In 19th Century — By R.C. Majumdar P. 67
2. Indian Awakening And Bengal — By N.S. Bose P. 227

قائم کی گئی جس میں ایک ہیر پرائز فنڈ ۱۸۴۲ء سے شروع ہوا۔ ان سماجی اصلاحوں کے باعث بنگال پورے طور پر نئے مغربی سماج کو جذب کرنے لگا۔ اس کا اثر ہندوستان کے دیگر حصوں پر بھی تیزی سے ہوا اور جن کے باعث بنگال جلد بیدار ہو گیا۔ حتی کہ دیکھتے ہی دیکھتے مغربی بیداری میں سارے ہندوستان کی قیادت کرنے لگا۔ ان بے شمار سوشل اداروں اور اہم تحریکات کے ذریعہ نئے سماج کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ اس سلسلہ کی اولین کڑی راجہ رام موہن رائے کی تحریک ہے۔ جس کو دبندر ناتھ ٹیگور، ایشور چندر ودیا ساگر، ہریش چندر مکرجی، راج نرائن بوس اور دوسرے قومی و سماجی، سیاسی اور ادبی رہنماؤں کے ذریعہ فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اس کی ایک اہم کڑی رام کرشن پرم ہنس اور سوامی دویکانند کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ رام کرشنا مشن وہ تحریک تھی جس نے ایک نئے جذبہ بیداری کے ساتھ ہلچل مچادی اور نیو ہندوازم کے تصورات میں قدیم مذہبی روایات کو سمو کر ہندو مذہب کی روحانی عظمت پر زور دیا۔ "راجہ رام موہن رائے نے اپنے پیچھے صرف فلاسفیکل اور مذہبی خیالات کے اسکول ہی نہیں چھوڑے بلکہ سیاست دانوں کا ایک ایسا اسکول بھی چھوڑا جنھوں نے حتی الامکان نئے ہندوستان کے پہلے بڑے مسئلے کے سیاسی پروگرام کو جاری رکھا۔" ۱

یہی نہیں کہ راجہ رام موہن رائے کی تحریک کے وسیع اثرات سے مختلف نوعیت کی تحریکات ابھریں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان تحریکوں کے ذریعے براہ راست اور بالواسطہ طور پر ایسے روشن خیال، آزاد طبع اور باصلاحیت اشخاص بڑی تعداد میں پیدا ہو گئے جنھوں نے آئندہ ہندو سماج کو برہمنی اقتدار کے پنجے سے نکال کر اسے نئی مغربی بنیادوں پر تعمیر کیا۔ بقول صوفیا ڈابسن کالٹ Sophia Dobson Collet "ان شاگردوں کے ذریعے اس بڑے مصلح (راجہ رام موہن رائے) کا مشن مستقل طور پر کامیابی سے جاری رہا اور یہ لوگ وہ

---

1. *History of Indian Social And Political Ideas By B. B. Majumdar P. 75*

زندہ پتھر تھے جنہیں اس نے زندہ جاوید عمارت کی شکل دیدی تھی۔" ۱

مسلمان اس وقت تک مغربی بیداری اور اس کی اہمیت سے بالکل بے خبر اور مغربی تعلیم سے متنفر اور الگ تھلگ تھے۔ نیشنلزم کا یہ نیا تصور صرف مغرب آشنا طبقہ میں وجود پا رہا تھا۔" اسی وجہ سے بعض حضرات کا خیال ہے کہ نیشنلزم کے معنی اتحاد کے ہیں اور ہندوستان میں نیشنل اتحاد کی بنیاد صرف ہندو مذہب پر رکھی جا سکتی ہے۔" ۲ بپن چندر پال کا خیال ہے کہ انگریزوں کی مانند عیسائی اور مسلمان بھی ہندوستان میں غیر ملکی متصور ہوئے۔" مسلمانوں میں قومی بیداری کا شعور اب تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور وہ اس نئے ہندوستانی نیشنلزم میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ نئے نیشنل شعور کا خاص اور واحد ذریعہ صرف انگریزی تعلیم ہی تھی۔" ۳ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے بنگال نے ان عظیم ادبی اور سیاسی شخصیات کو جنم دیا جن کے کارنامے ہماری تاریخ کا نشان راہ بنے۔ رابندر ناتھ ٹیگور، بنکم چندر چٹرجی، اربندو گھوش، آنند موہن بوس، بپن چندر پال اور سر سیندر ناتھ بنرجی کے نام اس سلسلے میں محتاج تعارف نہیں۔ ان حضرات نے نئے سماج کی وہ عمارت قائم کر دی جو نئے ہندوستان کی بنیاد ہے۔

نشاۃ ثانیہ اور اس کے اثرات کے ساتھ تمام قدیم و جدید تحریکات کے بیان سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کی مذہبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حالت کی دو اہم حقیقتیں ہم پر واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ باوجود مخالفتوں کے تمام نئے مغربی اثرات بہت تیزی سے ہندوستانی سماج اور دماغوں پر اپنا گہرا نقش بٹھا رہے تھے۔ اس کا اندازہ راجہ رام موہن رائے کی ۱۵ دسمبر ۱۸۲۹ء کی اس تقریر سے ہوتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ "ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جتنا زیادہ ہمارا میل جول انگریزوں سے ہوگا اتنا ہی زیادہ ہمیں ادبی، سوشل اور سیاسی معاملات میں

---

1. *Life And Letters of Raja Ram Mohan Roy* — By S. D. Collet P. 227
2. *The Indian Awakening And Bengal* — By N. S. Bose P. 171
3. *Ibid* P. 172

ترقی ہوگی ۔"۱ دوسرے یہ کہ ان اثرات کی پہنچ مسلمانوں میں بالکل نہیں پائی جاتی تھی ۔ اگر اتفاقیہ کہیں نظر آتی تھی تو انفرادی اور برائے نام جس سے ہماری مشترکہ سماجی زندگی میں بہت جلد ایک فرق محسوس ہونے لگا۔

ان دونوں باتوں کے پیش نظر انیسویں صدی کے تیزی سے بدلتے ہوئے دور میں ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ پر سرسری نظر ڈالنے سے اس کی اصلیت اور اہمیت نمایاں ہوجاتی ہے۔ مذہب کو دیکھیں تو ایک گروہ قدامت پسندوں کا نظر آتا ہے جو مذہب کی قدیم روایات اور ظاہری لوازمات کو بدستور قائم رکھنا اور اس سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ دوسرا گروہ مغربی اثرات سے عقلیت پسندوں کا تھا جو عقیدت کے ساتھ مذہب میں عقلیت کو جگہ دیتا تھا۔ مذہب کی بنیادی تعلیمات اور اس کی تشریح کرتے ہوئے غلط مذہبی روایات کے بندھن توڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مذہب میں جامد تقلید کے بجائے سوچنے اور غور کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا تھا۔ اس طرح ہندوؤں کا ایک طبقہ جدید دور کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ مگر مسلمان علماء کا یہ حال تھا کہ وہ ایسا کوئی خیال بھی دل میں لانے کو تیار نہیں تھے بلکہ ایسے ہر امکان سے شدید اجتناب کرتے تھے ۔

سیاست جس پر قدیم دور میں مذہب کا گہرا رنگ اور اس کا پورا تسلط تھا جس کی وسعت جاگیرداروں اور بادشاہوں کے مقبوضات اور ان کی تبدیلیوں کے ساتھ منقسم اور محدود ہوتی رہتی تھی، اب مغربی ذرائع سے نئے اسباب و علل کے ساتھ نیا شعور بیدار کرکے مغربی تصورات کا نیا چولا بدل رہی تھی۔ اب سیاست میں نیشنلزم کا وہ نیا شعور ابھر رہا تھا جو انیسویں صدی کی پیداوار کہا جاسکتا ہے اور جس میں ایک قومی وحدت کی مضبوطی محسوس کی جانے لگی تھی۔ اب حب الوطنی کا نیا شعور میدان جنگ میں زور آزمائی نہیں بلکہ تمام سوشل اور مذہبی تحریکات میں اپنی صلاحیت دکھلانے اور تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ بنگال کی تمام تحریکات میں جن

۱

کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ یہ نیا سیاسی شعور صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان سب کا اجتماعی اثر آر۔سی۔مجمدار کے الفاظ میں "ایک نئے قومی شعور کا وجود اور حب الوطنی کا وہ نیا احساس تھا جو ہندوستان میں پہلے موجود نہ تھا"۔ ۱

غدر سے پہلے تک اقتصادی حالت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ گھریلو صنعتیں بہت تیزی سے برباد ہوگئی تھیں اور تمام صنعت کار اب صرف کاشتکار رہ گئے تھے۔ کاشتکاری پر یہ بار بہت گراں تھا۔ اقتصادیات کا قدیم ڈھانچہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور اب ہندوستانی اقتصادیات نئے موڑ پر تھی۔ اس تبدیلی کے ساتھ کاشتکاری کی اہمیت نئے سرمایہ دارانہ نظام میں کم ہو رہی تھی۔ مشینی صنعتیں متعارف ہو رہی تھیں، جس سے بین الاقوامی تجارت اور تجارت کی اہمیت کے نقوش واضح ہو رہے تھے۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام اس وقت تک اپنی حدود وضع نہ کر سکا تھا مگر پرانی صنعتوں کے برباد ہونے سے مزدور طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو دیہی علاقوں کو خیرباد کہہ کر شہری آبادی میں اضافہ کر رہا تھا۔ انگریز تجار نے سرمایہ دار طبقہ کی حیثیت لے لی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی اقتصادی پستی کے متعلق اتول چندر گپتا لکھتے ہیں :" انیسویں صدی کی مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی، بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے ہندوستانی تاریخ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ انگریزی حکومت کے اقتدار و قیام کے پہلے مسلمان حکمراں طبقہ تھے اور اب وہ سب سے پست طبقہ ہوگئے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس کے انگریزی مراکز اودھ، دہلی اور لاہور کے مسلم مراکز سے دور تھے۔ جب تک کہ ان مقامات میں انگریزی عملداری مکمل جگہ بنائے مسلمان اس نئے نظام میں کوئی اہم حصہ بلکہ عام جگہ بھی نہ پا سکتے تھے۔ اس کے برعکس نوکریوں پیشوں اور ملکی تجارت میں بھی ہندو متوسط طبقہ بہت اچھی طرح اپنی جگہ بنا چکا تھا"۔ ۲

اقتصادی حالت میں اس نمایاں فرق کے سبب تعصب جب تو بہت گہرا اثر کر گیا۔ گورنمنٹ کی سیاسی مصلحت اندیشی " لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی تیزی سے جاری ہوگئی۔ اقتصادی حالات اس کے لئے معاون ثابت ہوئے۔ تعصب صرف ایک بار وجود پا جائے تو پھر اس کے

---

1. Glimpses of Bengal In 19th Century
— By R.C. Majumdar P.4

2. Studies In Bengal Renaissance — By A.C. Gupta P.7

خود بخود بڑھنے اور پھیلنے میں دیر نہیں لگتی۔" ۱

دراصل یہ فرق صرف اقتصادی نہیں بلکہ علمی اور سوشل زندگی کی تمام وسعتوں میں پھیلا ہوا تھا اور انگریزوں کی تفرقہ اندازی کی پالیسی ان کی جنگ اقتدار کے اولین زمانہ ہی سے جاری و ساری تھی جیسا کہ آئندہ صفحات سے واضح ہو گا۔ تعلیمی حالات پر نظر کریں تو معلوم ہو گا کہ قدیم تعلیمی نظام بکھر چکا تھا۔ وہ مدرسے اور پاٹھ شالے جو گاؤں گاؤں میں قائم تھے اب ناپید تھے۔ "انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔" ۲ اس طرح قدیم تعلیمی ذرائع مسدود ہو چکے تھے جہاں مذہب کی تعلیم کے ساتھ ہندوستانی زبانوں میں تعلیم ہوا کرتی تھی۔ اس کے بجائے اب کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے ساحلی علاقوں خصوصاً بنگال میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کا خیر مقدم نہایت جوش سے ہو رہا تھا۔

ایک طرف عوام میں جہالت پھیل گئی تھی کیونکہ ان پر قدیم ذرائع تعلیم جو بستے اور گاؤں گاؤں میں تھے بند ہو چلے تھے اور نئی تعلیم کے لئے کوئی ذریعہ اور ضرورت ان کو نہ تھی۔ دوسری طرف متوسط طبقہ میں انگریزی کی ترقی تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ سیکڑوں انگریزی اسکول اور بہت سے کالج سرکار کی طرف سے غیر سرکاری ذرائع سے قائم ہوتے جاتے تھے۔ ۱۸۳۳ء میں دفتر کی زبان انگریزی ہو جانے سے اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی بڑھ گئی۔ سر چارلس گرانٹ Sir Charles Grant ڈائرکٹر کمپنی نے ۱۷۹۲ء میں اجرائے تعلیم کی تائید میں ایک رسالہ لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی جاری کرنے سے ان کا منشا کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "جس طرح مسلمانوں نے دفتر کی زبان فارسی کر دی تھی اسی طرح انگریزی جاری کرنے سے عدالتوں اور دفاتر کے کام میں آسانی ہو گی اور ہندو اس سے خوشی حاصل کریں گے۔ کیونکہ اس سے ان کی وقعت اور اہمیت بڑھے گی۔" ۳

---

1. *Studies In Bengal Renaissance*
— *By A. C. Gupta P. 7*

۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۱۳۴
۳۔ " " " " " " ص ۱۳۶

مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم سے ایک آزاد خیالی کی روچل نکلی تھی۔ بنگال اُن نئے اثرات کی پذیرائی میں پیش پیش تھا۔

یہاں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمان ان تمام نئے اور مغربی اثرات سے بالکل بے بہرہ اور بے خبر تھے۔ بنگال میں جہاں مغرب کا سب سے زیادہ اثر تھا وہاں مسلم امراء اور نوابین کا طبقہ بالکل تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ لہٰذا ان میں نئے اثرات کی پہنچ ممکن نہ تھی۔ غریب کاشتکار طبقہ کے لئے انگریزوں کا نیا نظام تباہی کا پیغام لایا۔ قدیم دور میں یہ لوگ تہذیبی مراکز سے دوری کے باعث تہذیبی حیثیت سے کمتر ہی شمار ہوتے تھے۔ پھر بھی قدیم بنگال میں کاشتکار خوش حال تھے اور کاشتکاری کا عروج تھا ایک انگریز بشپ ہیبر Bishop Habber ۱۸۳۰ء میں اپنی یاد داشت میں لکھتا ہے کہ انگریزی مقبوضات کے کاشتکار بہ نسبت دیسی ریاستوں کے انتہائی محتاج اور مفلسی و دل شکستگی کی حالت میں ہیں۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ کوئی دیسی نواب یا راجہ وہ لگان اور کرایہ نہیں لیتا جو ہم لیتے ہیں"[۱] نئے انگریزی قوانین بندوبست استمراری اور معافی کی زمینوں پر ٹیکس نے ان پر بہت بوجھ ڈالا۔ ادھر محصولوں کی وصولیابی میں انگریز ایجنٹوں نے ظلم کی انتہا کر دی۔ جس کے باعث کاشتکاری تباہ ہونے لگی اور کاشتکار زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ان کاشتکاروں میں ہندو مسلمان سب شامل تھے اور سب اس مصیبت میں یکساں گرفتار تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مغربی اثر سے جو نیا طبقہ ابھرا تھا اس میں وہ لوگ تھے جنھیں انگریزوں سے ملازمت یا تجارت یا پھر کسی وسیلہ سے کوئی نہ کوئی واسطہ رہتا تھا۔ اس طبقہ میں وہ ہندو حضرات تھے جو نئے سماج میں اچھی جگہ بنا چکے تھے اور اسکی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ ادھر دہلی میں مغل حکومت اب صرف قلعہ کی عملداری تک محدود ہو چکی تھی مگر اب بھی مسلمانوں میں قدیم تہذیب کا گہرا رنگ نمایاں تھا۔ چنانچہ دہلی اور اس کے قرب و جوار اور اودھ کے مسلمان مراکز اب تک اپنی قدیم دنیا آباد کئے ہوئے تھے۔ ادھر بنگال کی تحریکات کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی بنگال میں سیکڑوں اسکول انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم کے لئے کھل گئے تھے۔ چنانچہ ہندو کالج

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری۔ ص ۸۹

اور پریزیڈنسی کالج اس وقت تک کلکتہ میں قائم ہو چکے تھے۔

مغربی علوم اور سائنس کا ہر طرف چرچا تھا۔ سماچار درپن سے معلوم ہوتا ہے کہ "۱۸۲۶ء میں چار سو لڑکے ہندو کالج اور ایک ہزار دوسرے اداروں میں تعلیم پا رہے تھے"۱ سوشل اور تعلیمی مقاصد کے سیکڑوں ادارے قائم ہو چکے تھے جن میں سماجی اصلاحات کا سلسلہ جوش و خروش سے جاری تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کامیاب جدو جہد ہو رہی تھی۔ لڑکیوں کے لئے بھی عام طور پر اسکول کھلتے جا رہے تھے۔ سماج میں عورتوں کی پست حالت کے خلاف ہر طرف غلغلے بلند تھے" "۱۸۱۵ء میں باشندگان بمبئی نے ایک انجمن ناداروں کی تعلیم کے لئے قائم کی اس سوسائٹی نے بمبئی میں ایک سینٹرل اسکول کھولا اور ۱۸۱۹ء تک چار اور دیسی مدرسے بمبئی میں قائم کئے۔ ۱۸۲۱ء میں پونا میں ہندو کالج کے قیام پر کمیٹی نے پندرہ ہزار گرانٹ منظور کی جس میں باقاعدہ انگریزی تعلیم کا آغاز ۱۸۲۳ء میں ہو گیا۔ مدراس میں ۱۸۲۶ء میں کمیٹی برائے تعلیم عامہ قائم ہو گئی تھی۔ اور ۱۸۳۰ء میں اسے سرکار کی طرف سے انگریزی تعلیم کے فروغ کے لئے خاص مدد ملی"۲ اس وقت مسلمانوں کے مراکز مغرب کے مقابلے میں صدیوں قبل کی دنیا معلوم ہوتے تھے۔ دیگر مقامات کے مسلمان بھی انھیں مراکز کی تقلید اپنا فرض عین جانتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب "۱۸۲۴ء میں سرکار نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لئے سنسکرت کالج کھولنا چاہا تو ان لوگوں نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ انھیں سنسکرت نہیں بلکہ انگریزی کالجوں کی ضرورت ہے۔ اس کے گیارہ سال بعد ۱۸۳۵ء میں جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ سرکار اسکولوں میں انگریزی تعلیم دے گی تو انھوں نے اس کی مخالفت میں ایک درخواست بھیجی جس پر آٹھ ہزار مولویوں کے دستخط تھے یہی وجہ تھی کہ انگریزی اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد ایک فی صدی بھی نہ تھی"۳ مسلمان

---

1. Glimpses of Bengal In 19th Century
— By R.C. Majumdar P. 28

۲۔ مضمون سرسید کی مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڈھ میں، از رشید احمد صدیقی، مطبوعہ رسالہ فکر و نظر، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۱۸-۱۹

۳۔ سرسید تاریخی و سیاسی آئینے میں، از ڈاکٹر شان محمد - ص ۴۰

مغرب اور اس کے اثرات اور مغربی علوم سے جتنا کہ ناواقف تھے اتنا ہی ان سے نفرت بھی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کی یہ دلچسپ تحریر دیکھنے کے لائق ہے کہ "دہلی کالج میں جب ایک اعلیٰ انگریز حاکم آیا اور اس نے مولوی مملوک علی سے ہاتھ ملایا تو مولوی صاحب نے وہ ہاتھ الگ تھلگ رکھا اور اس کے جاتے ہی رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھو ڈالا۔ ہمارے اس وقت کے ایک لغت نویس نے فرنگی کی یہ تعریف کی ہے۔ "یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود۔ . . . . . ." ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ انگریز کاریگر اچھا ہے بندوق توپ اچھی بنا لیتا ہے رہا علم سو اس سے بے بہرہ ہے نئے مدرسوں اور کالجوں کو مجہلے کہتے تھے۔ اسی لئے انھیں انگریزی تعلیم سے نفرت تھی وہ کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کو مذہب سے منحرف کرنے اور عیسائی بنانے کی ترکیب ہے۔" ۱

اس نفرت کے کئی وجوہ تھے۔ مسلمان اپنے علم و تہذیب کے اس تاریخی دور پر اب بھی نازاں تھے جس نے حکومت اندلس (اسپین) کے ذریعہ یورپ کے تاریک دور میں صدیوں قبل علم و تہذیب کے نئے چراغ روشن کئے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ مغرب ترقی کی دوڑ میں اب ان سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ دوسرے ہندوستان میں انگریزوں سے ان کی سیاسی ہار نے بھی ان کے خلاف مسلمانوں میں ایک نفرت بھڑکا دی تھی "حکومت چھننے والوں سے نفرت کا جذبہ اتنا تھا کہ ان کی ہر بات سے اختلاف کرتے تھے۔ اپنے علوم اور بزرگان سلف کے کارناموں کی عظمت سے اتنا مرعوب و متاثر تھے کہ یہ سوچنا ان کے لئے مشکل تھا کہ ان علوم اور کارناموں پر کوئی اضافہ بھی ممکن ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے تصورات میں تصوف کی رنگ آمیزی بھی تھی اس لئے موجودہ بدحالی میں انھوں نے کاہلی کو قناعت اور مفلسی کو انبیاء کی وراثت کہہ کر بے حسی کو فروغ دیا۔" ۲ اس کے علاوہ خود انگریز اپنے حریف مقابل کو اندھیرے میں رکھنا چاہتے تھے اور ان کی نئی تعلیم اور اقتصادی بھلائی کے سدراہ تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ بنگال میں جو متوسط طبقہ ابھرا تھا اس میں کچھ نہ کچھ مسلمان ضرور ہوتے، مگر انگریزوں کی حریفانہ اور حریصانہ مصلحت اندیشیاں اس راہ میں حائل رہیں۔

۱- چند ہم عصر از مولوی عبدالحق۔ ص ۲۱۵

۲- اردو شاعری کا سماجی پس منظر از ڈاکٹر اعجاز حسین۔ ص ۳۸۰

آر۔سی مجمدار اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں کہ "بنگال میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلمان اس سے دور اس کے زیر اثر ایک عام شعور سے بالکل الگ رہے۔"[1] مسلمانوں میں جو رجحان غدر اور اس کے بعد تک نظر آتا ہے اس پر مذہبی روایات اور قدامت پسند علماء کا پورا پورا تسلط تھا۔ وہ قدیم مذہبی روایات کو سختی سے اپنانے میں ہی عروج و ترقی جانتے تھے اور عقلیت پسندی پر اندھی تقلید کو فوقیت دیتے تھے۔ گو ہندوؤں میں بھی قدامت پسند طبقہ تھا مگر عام طور پر ایک قومی بیداری بھی پیدا ہو گئی تھی۔ نئے وسائل سے مستفید ہونے کی خواہش اور کوشش ان میں عام ہوتی جا رہی تھی۔ یہی گروہ مضبوط تر اور غالب تر ہو گیا تھا۔

در اصل انیسویں صدی کا زمانہ ہندو مذہب اور سماج میں ایک انقلابی دور تھا جس میں مغربی علوم کے حصول کے ساتھ نئے سماجی اصولوں کو اپنا کر انھیں ذرائع سے قدیم عظمت کے نئے گل تراشے گئے تھے۔ جدید تعلیم کی جد و جہد جب کامیاب جھلکیاں دکھانے لگی تو اس وقت ایک نیا شعور بیداری اپنی حدود قائم کرنے لگا جس کی جہد میں ہر طرف قومی فخر کا احساس نظر آنے لگا۔ ان تعلیمی اور سماجی کاوشوں میں مذہبی عناصر بھی شامل تھے۔ لہٰذا "نیو ہندوازم" نے ویدوں کی اصلی تعلیم کو پیش کر کے نئی نیشنلزم کے لئے مذہب اور سیاست تعلیم و سماجی تصورات کا ایک نیا اور ترقی یافتہ مرکب تیار کر دیا۔ اس جد و جہد میں چونکہ مذہبی حیثیت سے ایک ہی طبقہ تھا اس لئے قومیت کا نیا تصور اس دور میں صرف ہندو قوم سے کیا جانے لگا۔ مسلمانوں میں نئے مغربی وسائل اور اثر سے سماجی اور مذہبی اصلاحات کا کوئی تصور بھی اس وقت تک نہیں ملتا جسے ہم مغرب کے دامن سے وابستہ کر سکیں۔ انگریزی تعلیم اور مغربی علوم ان میں ناپید تھے۔

دلی کالج واحد ادارہ تھا جو ان لوازمات کے ساتھ مسلم مرکز دہلی میں غدر سے پہلے قائم کیا گیا تھا۔ یہاں مغربی علوم ہندوستانی زبان ہی میں پڑھائے

---

1. *Glimpses of Bengal in 19th Century*
— *By R. C. Majumdar P. 50*

جاتے تھے۔ مسلم طلباء یہاں بھی انگریزی زبان کے شعبے میں کم اور عربی اور فارسی و دیگر شعبہ جات میں زیادہ نظر آتے تھے۔ پھر بھی اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ دلی کالج کے مسلم طلباء کو انگریزی داں پروفیسروں اور انگریز حضرات سے واسطہ ہونے لگا نیز ان کی قربت و صحبت ملی۔ یہ ادارہ غدر کے ساتھ ہی تباہ ہو گیا۔ اس لئے اس کے تعلیمی فوائد مسلمانوں میں وہ وسعت نہ پاسکے جو کہ بنگال میں نمایاں تھے۔ سی، ایف، اینڈ روز C.F. Andrews جو مولوی ذکاء اللہ کے نہایت قریبی دوست تھے اور جنھوں نے مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی حالت اور خیالات کو بہت نزدیک سے دیکھا اور سمجھا تھا، مولوی ذکاء اللہ کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں۔" دہلی میں نئی مغربی تعلیم ذمہ دار اور مہذب انگریزوں کے ذریعے جاری ہوئی لیکن شروع ہی میں راجہ رام موہن رائے کی مانند کوئی ایسی نمایاں اور ذہین شخصیت نہیں نظر آتی جو ان کا نصف بھی مغربی اثرات کا جواب ہوتی۔ جبکہ کلکتہ میں قدامت پسندوں کی طاقت صرف برہمنوں اور پنڈتوں تک محدود تھی دہلی کے مسلمان رہنما ہر جگہ اس کے شدید مخالف تھے"۔[1] غدر کے ساتھ مسلمان اقتصادی طور پر بالکل تباہ ہو گئے تعلیمی حالت پست تر ہو گئی، نئے سرکاری دروازے عرصہ دراز تک ان پر بند رہے۔ نئے علوم اور انگریزی زبان سے ناواقفیت نے اور بھی انھیں کسی سرکاری کام کے لائق نہ رکھا۔

چنانچہ اس کشمکش کے دور میں مندرجہ بالا باتوں کے پیش نظر دو نئے گروہ بن گئے ایک جدیدیت سے آگاہ ترقی یافتہ اور خوش حال، دوسرا قدامت پرست زوال یافتہ مفلس اور تباہ حال مگر اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ ان دونوں میں مذہبی اعتبار سے ملے جلے لوگ نہ تھے۔ بلکہ یہ گروہ کچھ اس طرح تشکیل پائے کہ اول الذکر میں صرف ہندو اور آخر الذکر میں صرف مسلمان تھے۔ اس کی وجہ سے ایک افسوسناک تفریق قائم ہو گئی۔ اس تفریق نے ایک خلیج کا کام کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں ہمارے سماج اور سیاست کا اہم جزبن گئی۔ ان دونوں طبقوں کے سماجی مرتبہ Status میں

---

1. Zaka Ullah of Delhi — By C.F. Andrews P. 35

اتنا فرق ہو گیا کہ ان کے خیالات اور ضروریات بھی مختلف ہو گئیں۔ اس طرح یہ طبقے دو مختلف المحال اور مختلف الخیال ہندوستانی طبقوں کے بجائے مذہبی تفریق کے ساتھ ہندو اور مسلمان گروہ کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ اگر ان دونوں گروہوں میں ہندو اور مسلمان ملے جلے ہوتے تو یہ تفریق کبھی نہ پیدا ہوتی۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے اس کو استعمال بھی کیا اور اس کی تشکیل میں حصہ بھی لیا۔ ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت میں شکست کھانے کے بعد مسلمان ناامیدی کے اندھیروں میں گھر کر رہ گئے۔ ہندوؤں نے بہت شوق سے انگریزی تعلیم کو اپنا رکھا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر انیسویں صدی کے موڑ پر انھوں نے مسلمانوں کو اقتصادی اور تعلیمی ترقی میں بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ انگریزوں نے ہندوؤں سے دوستانہ روش قائم رکھی۔ اور جب ان میں نیشنلزم کے خیالات پیدا ہوئے تو دوستانہ روش کی یہ انگریزی پالیسی مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گئی ۔ خاص کر مسلمانوں کی تعلیمی کوششوں میں ہمدردی کے اظہار کے ساتھ ۔[1] چنانچہ انگریزوں کی لائی ہوئی تمام برکتوں کے ساتھ ان کی ہوا دی ہوئی یہ لعنت بھی شامل ہے ۔ جہاں مغرب کے اثر سے تعلیمی، تہذیبی اور سماجی بنیادوں میں نئے خمیر ملائے گئے وہیں یہ نئی خلیج بھی بنی یہ کچھ تو تاریخی حالات کے زیر اثر از خود ظہور میں آئی اور کچھ انگریزوں کی سیاسی مصلحت اندیشیوں سے اس کو تقویت پہنچی ۔

اس کے مقابل جب ہم ان علاقوں پر نظر کرتے ہیں جہاں انگریزوں کا براہ راست تسلط نہیں تھا تو ایسی کوئی تفریق غدر تک نظر نہیں آتی۔ بلکہ زوال و تباہی کے اس ہنگامی دور میں بھی محبت، یگانگت اور اتحاد کا رشتہ صاف نظر آتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ زبان، مذہبی روایات، رسوم درواج اور رہن سہن میں مغلیہ دور اس ہندوستانی معاشرت کی تشکیل کر چکا تھا جسے ہندو مسلم مشترکہ کلچر یا ہندوستانی کلچر کہہ سکتے ہیں۔ مسلمان خالص ہندوستانیت میں رنگ چکے تھے۔ (نوٹ)۲ یہ تشکیلی دور بدقسمتی سے درجہ تکمیل کو نہ پہنچا تھا کہ مغلوں کا قطعی زوال اور انگریزوں کا اقتدار ظہور میں آگیا۔ اس وقت قدیم ہندوستانی سماج کا شیرازہ بکھر رہا تھا حکومت زوال پذیر تھی، خانہ جنگیوں کے اس زمانے

---

1. *The Making of Indian Nation* — By B. G. Gokhale P. 151

۲۔ نوٹ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں اردو شاعری کا سماجی پس منظر از ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔

میں جب کہ راجے، نوابین امراء ایک دوسرے سے اپنے اقتدار کے لئے برسرِ پیکار تھے ہندو مسلم تفریق کہیں نظر نہیں آتی بلکہ سب جنگوں اور دوستیوں میں ملے جلے نظر آتے ہیں۔

پنڈت سندر لال جی لکھتے ہیں: "اورنگ زیب کے عہد میں بھی بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں دی گئیں۔ اس نے ہندوؤں کو گورنر بنایا گورنر جنرل یا وائسرائے بنایا یہاں تک کہ خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب دارالسلطنت مقرر کیا تھا وہ ایک راجپوت تھا۔ اسی طرح سراج الدولہ کا وزیرِ اعظم موہن لال تھا۔ پٹنہ کا حاکم رام نرائن۔ ٹیپو سلطان کا معتبر سردار پورنیا برہمن تھا"[۱] اکبر کا زمانہ دوستانہ برابری کی روشن مثال ہے۔ اس کے علاوہ بھی مذہبی رواداری ہر دور میں ملتی ہے چنانچہ مزید لکھتے ہیں: "اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانے میں ہندو مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ مذہب کی مساویانہ توقیر ہوتی تھی اور مذہب کے لئے کسی قسم کی جانب داری نہیں برتی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں، جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔"[۲]

ہندو ریاستوں میں مسلمان مسجدوں اور خانقاہوں میں بہ اطمینان مذہبی فرائض انجام دیتے تھے اور مسلم حکومت میں ہندوؤں اور پنڈتوں کا احترام عام تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی اپنی کتاب "ہندوستان کا مستقبل" میں اس کی مثالیں دی ہیں مثلاً "سیتل داس بیراگی کو احمد شاہ بہادر غازی کی عطا کی ہوئی سند ٹھاکر جی کے بھوگ کے لئے اس قسم کے عطیوں کے دو فرمان الٰہ آباد میں ہیں ان میں سے ایک مہیشور ناتھ کے پجاریوں کے حق میں ہے جو اورنگ زیب کا عطا کردہ ہے۔"[۳] ایسی دو طرفہ مثالیں کمیاب نہیں بلکہ بے شمار ہیں۔ جو آپس کی رواداری کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہی نہیں سماجی زندگی کے رسوم و رواج، شادی بیاہ، غمی، میلوں ٹھیلوں اور تیوہاروں کے جشن و جلوس میں سب یکساں اور ایک دوسرے کے شریک نظر آتے ہیں۔

۱- بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری ص ۲۷-۳۶

۲- " " " " " ص ۴۲

۳- ہندوستان کا مستقبل از ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۷۷

ہولی، دیوالی اور دوسرے تیوہاروں کے جلوس اور میلوں میں مسلمان اسی طرح شریک ہوا کرتے تھے۔ جیسے محرم اور عرس وغیرہ کے موقعوں پر ہندو شریک ہوتے تھے۔ یہی چیزیں ایک مشترکہ کلچر کی صورت میں ہندوستانی وحدت بن رہی تھیں۔ جن میں محبت اور یکسانیت کی خوبو رچی بسی ہوئی تھی۔ سلطنت مغلیہ اپنی تمام کمزوریوں اور زوال پذیری کے باوجود دہلی کو اس خوبصورت رشتۂ اتحاد کا سیاسی مرکز بنائے ہوئے تھی۔ ہملٹن اپنی کتاب "ہندوستان" میں لکھتا ہے کہ جب ۱۸۱۳ء میں ٹراونکور کی رانی تمبور لیبنی نے انگریزوں کے مشورے اور ترغیب کے خلاف اس بات پر زور دیا کہ مغل شہنشاہ سے اس کے بیٹے کے واسطے جو ابھی بچہ ہی تھا گدی نشینی کی خلعت کے لئے درخواست کی جائے تو انگریزوں کو بڑا تعجب ہوا۔ اسلئے کہ رانی کی ریاست براہ راست کبھی مغل حکومت کے ماتحت نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ مغل شہنشاہ کی شخصیت ایک خیالی تصویر سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی" ۱

قدیم مشترکہ کلچر کے اس اتحاد میں رواداری و یگانگت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر ہندوستانیت کی یک رنگی تھی۔ مغل بادشاہوں کے لئے عزت و احترام اور محبت کا ایک عام جذبہ تھا۔ اور یہی اس وقت کا سیاسی اتحاد تھا۔ اینڈریوز لکھتا ہے کہ اس دور انقلاب میں دہلی کے لوگ ہندو و مسلمان یکساں طور پر عقیدت مندانہ وفاداری کے ساتھ مغل شاہنشاہوں سے چمٹے رہے۔ اس بارے میں جو جو شہادتیں مجھے ملیں وہ بالکل قطعی تھیں کہ انھیں بہادر شاہ کے ساتھ جو محبت تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان مغل بادشاہوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی خصوصی رواداری تھی۔ اور نسل و مذہب کی بناء پر بہت کم امتیاز روا رکھا جاتا تھا" ۲ ایک جگہ اور بہت حیرت سے لکھتے ہیں کہ مولوی ذکاء اللہ کی سوانح کی تحریر کے سلسلے میں جب انھوں نے غدر کے حالات دہلی کے بوڑھوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کرنا شروع کئے تو جس بوڑھے شخص سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا واقعہ بیان کر رہا ہے بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اپنی بیتی سنا رہا ہے" ۳

۱۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ از عبداللہ یوسف علی ص ۸۰

۲۔ بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از خورشید مصطفٰے رضوی ص ۵۰۵

۳۔ بحوالہ ۵۷ء کے ہیرو از سیدہ انیس فاطمہ ص ۵۸

انگریزی اقتدار نے اس حسین رشتہ کو توڑ ڈالا۔ این۔ ایس بوس کے الفاظ میں "سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہندوستان نے اپنا سیاسی اتحاد کھو دیا" ۱ مشترکہ کلچر ہندوستانیوں کو تہذیبی حیثیت سے ایک پلیٹ فارم پر سمیٹ کر ایک سیاسی وحدت میں پرونے لگا تھا۔ اس میں تاریخی حالات کو بھی بڑا دخل تھا مگر انگریزوں کی پالیسی شروع ہی سے تفرقہ اندازی کی تھی جس کے تاریخی واقعات شاہد ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف حیثیت سے جاگیرداروں اور نوابوں کی کثرت ہو جہاں مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ کثرت سے آباد ہوں انگریزوں کو اس پالیسی کے استعمال کرنے میں بہت آسانیاں تھیں اور یہی ان کی حکومت کے استحکام کا سب سے آسان اور اہم نسخہ تھا۔ مسز اینی بیسنٹ Mrs. Annie Besant نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے اور رشوت و سازش و نفاق نیز حد درجہ کی دورخی پالیسی پر عمل کر کے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر یہ ملک حاصل کیا" ۲

انگریزوں کی دین میں ہندو مسلم فسادات تو بہت بعد کی پیداوار ہیں مگر غدر کے پہلے پوری ایک صدی تک انگریزوں کے اقتدار کی تکمیل اور جنگوں میں ان کی مسلسل کامیابی کا راز دراصل انکی فریب دہی، سازشوں اور تفرقہ اندازی میں مضمر نظر آتا ہے۔ جس کو ہوشیار اور لائق حکمراں پلتے پہلے اس کے ختم کرنے کے درپے ہوتے۔ کمزور اور بودے حکمرانوں کو خوف اور لالچ دلا کر ان کی حفاظت کا یقین دلاتے اور اس طرح ان پر مسلط ہو جاتے۔ یکے بعد دیگرے اور موقع بہ موقع تمام ریاستوں اور چھوٹی بڑی طاقتوں کے ساتھ یہی کیا گیا۔

بنگال میں سراج الدولہ، میر قاسم اور میر جعفر، میسور میں ٹیپو سلطان، حیدرآباد میں نظام جنوب مغربی علاقوں میں مرہٹوں، پنجاب میں سکھ ریاستوں، اودھ، نیپال، جھانسی، بیکانیر اور سلطنت دہلی وغیرہ تمام حکومتوں کی تاریخ میں انگریزی اقتدار کی کہانی انھیں وسائل سے بھری پڑی ہے۔ ایک انگریز کمانڈر اپنی مراسلت میں تسلیم کرتا ہے کہ اس نے کنور سنگھ اور امر سنگھ کی رفاقت سے جنگ جو پٹھان نبی بخش خاں کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر

---

1. *Indian Awakening And Bengal — By N.S. Bose ; P. 1*

۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری۔ ص ۵۶

ناکام رہا۔ ذاتی طور پر بھی اس سے ملا مگر اس نے مصافحہ کرنا بھی گوارا نہ کیا۔“ ۱ کرنل کیتھ ینگ Col. Keath Young جنگ دہلی کے موقع پر اپنی بیوی کو لکھتا ہے ”بظاہر کل شہر میں زبردست فساد کے لئے ہماری امیدیں پوری نہ ہوسکیں۔ . . . . . بجائے اس کے کہ وہ لوگ آپس میں لڑتے وہ سب ہمارے خلاف ایک متحدہ اور بھرپور حملہ کرنے کے لئے ایک ہوگئے ہیں۔ جب کہ ایسے انتظامات کئے گئے تھے کہ بادشاہ شام کی نماز ہمارے کیمپ میں ادا کرے۔“ ۲ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اقتدار کے حصول کے واسطے انگریزوں نے ہندو مسلم تفرقہ کے لئے کن کن ذرائع سے کوشش کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ایک عام اتحاد اور جوش اور جذبۂ سرفروشی کے باوجود اس کی کمی یہ تھی کہ اس میں ایک منظم اور مضبوط بغاوت کی کڑیاں کمزور تھیں اور انگریزوں کے خلاف ایک عام عوامی غصہ اور نفرت کا شعلہ صفت اظہار زیادہ تھا، جو بھڑکا اور بجھا پھر دوسری جگہ نمودار ہوا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ خواجہ حسن نظامی ”غدر کی صبح و شام“ میں درج کرتے ہیں کہ چار ستمبر کو بہادر شاہ نے جے پور، جودھپور، اور بیکانیر کے راجوں کو دستخطی چھٹیاں لکھیں: ”میری دلی خواہش ہے کہ فرنگی جس طرح بھی ہو ہر قیمت پر ہندوستان سے نکال دئے جائیں اور ملک آزاد ہو لیکن آزادی کی جنگ اس وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب ایک قابل شخص جو تحریک کا تمام بار اپنے کاندھوں پر لے کر منتشر فرقوں کو منظم کرسکے اور اس بغاوت کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھے۔ میں ذاتی طور پر حکومت کی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر تم دیسی راجگان اپنی تلواریں دشمن کو نکالنے کے لئے بے نیام کرنے کو تیار ہو تو میں ان کے حق میں شہنشاہی سے دست بردار ہوجاؤں گا جو اس کام کے لئے منتخب ہوں۔“ ۳ مگر دھول پور اور بیکانیر کی ریاستیں انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہوچکی تھیں۔

اس سلسلے میں سر جان مینارڈ Sir John Minard کا قول ایک وزن رکھتا ہے

۱۔ بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، از خورشید مصطفٰے رضوی۔ ص ۳۵۶

۲۔ ” ” ” ” ” ” ص ۱۹۱

۳۔ ” ” ” ” ” ” ص ۱۹۶ اور

غدر کی صبح و شام از سید خواجہ حسن نظامی ص ۲۴۲

کہ "ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی"۔ ۱ ابتدائی زمانہ میں تو یہ چیز سازشوں، عیارانہ دوستیوں، دولت و حکومت کی لالچ اور حفاظت کا یقین دلانے میں نظر آتی ہے۔ مگر انگریزی حکومت کے استحکام کے بعد یہ تفرقہ اندازی کی پالیسی دوسرے ذرائع استعمال کرتی ہے۔ سرجان میلکم Sir John melcolm کا قول اس چیز کو واضح کرتا ہے "اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اس طرح سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری حکومت کے استحکام کو متزلزل نہ کریگی"۔۲

چنانچہ اس پالیسی کے لئے جو مختلف تدابیر اختیار کی گئیں ان میں سب سے کامیاب اور مستقل وہ تاریخیں ہیں جو کمپنی کے دور میں لکھی گئیں۔ سید طفیل احمد لکھتے ہیں: "انھیں میں سے ایک مشہور تاریخ سرہنری الیٹ Henry Elliot کی تھی۔ جس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔ یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانہ قدیم بالخصوص مسلم عہد کے خلاف خوب زہر اگلا ہے۔ تاریخی میدانوں میں یہی وہ سب سے پہلی کتاب ہے جس کے ترجمے دیسی زبانوں میں کراکے ان کے ذریعے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے عناد کا بیج بویا گیا۔ اگر کسی شخص کو اس تاریخ کے لکھے جانے کا مقصد معلوم کرنا ہو تو اس کے لئے صرف اس کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا۔ جس میں مورخ نے اپنے منشاء کو واضح اور صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے"۔ ۳ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں "ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اور معاشیات کی جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نقطۂ نظر بالکل برطانوی ملوکیت کا تھا اس میں ہماری پچھلی اور موجودہ خامیاں جتائی جاتی تھیں اور انگریزوں کے اوصاف اور بلند اقبالی"۔ ۴ چنانچہ ایسی ہی تاریخی تعلیم کے باعث ہندوستانی بچوں

۱۔ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۲۶۰

۲۔ " " " " " " ص ۲۶۰

۳۔ " " " " " " ص ۲۶۰

۴۔ میری کہانی از پنڈت جواہر لال نہرو ترجمہ شدہ ڈاکٹر سید عابد حسین ص ۲۴۹

کے دلوں میں تفریق کا بیج بویا گیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بقول رام گوپال جی "نصف صدی کے اندر تاریخ کا رخ بدلنے لگا مسلمانوں میں ہندوؤں سے بدگمانیاں پیدا ہوئیں اور ہندو مسلمانوں سے بے گانگی کے طریقے برتنے لگے۔ یہاں پر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ رشک اور بے گانگی ہندو مسلم عوام میں نہیں بلکہ اس اونچے اور متوسط طبقے میں پھیلے جن کی معاشِ و بقا کا انحصار سرکاری ملازمتوں اور جانب داریوں پر تھا۔ بہرحال اسی طبقہ نے قدرتی طور پر بعد میں ملک کی تمام سیاست پر اثر انداز ہو کر اسے تشکیل دینے میں خاص حصہ لیا۔" ۱ اس قسم کی تاریخوں کا اسکولوں اور کالجوں کے کورس میں شمول انگریزوں کی کامیاب اور زہریلی تدبیر ثابت ہوئی۔

اس کے علاوہ دوسری قابل ذکر تدبیر کا ہدف زبان تھی جو تہذیب و تمدن میں اہم اور اولین مقام رکھتی ہے۔ چنانچہ زبان کا فرق ایک خاص تقسیم اور تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ انگریز ہندوستان میں آئے تو بنگالی، مراٹھی، کشمیری، سندھی، نیز دکن کی مقامی زبانوں کی کثرت میں ہندو مسلم مشترکہ کلچر کے اثر سے ہندوستانی زبان کی ایک وحدت بھی تشکیل پا رہی تھی۔ یہ زبان اس وقت شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصہ اور اہم مرکزی علاقہ کی زبان تھی۔ ساتھ ہی تمام ہندوستان میں عام طور پر سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح ایک رابطہ کا کام دیتی تھی۔ گل کرسٹ Gilchrist کو بھی اس کا پورا اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ "جس گاؤں اور جس شہر میں میرا گذر ہوا وہاں اس زبان کی مقبولیت کی جو میں سیکھ رہا تھا مجھے ان گنت شہادتیں ملیں۔ جنھوں نے مجوزہ کتاب (قواعد و لغت) کی تکمیل کے شوق کو تیز تر کر دیا۔" ۲ یہی وجہ ہے کہ اسے ہندوستان کی لنگوا فرینکا تسلیم کیا گیا مگر جس طرح کہ مغلیہ دور کے مشترکہ کلچر کو درجۂ تکمیل تک پہنچنا باقی تھا اسی طرح ہندوستانی زبان کو بھی ہندوستانی وحدت بن کر مکمل طور پر چھا جانے میں کچھ وقت درکار تھا۔ پھر بھی عام بول چال تحریروں اور سرکاری دفاتر میں اس کا پورا تسلط تھا۔ فارسی کے اثر سے یہ ایک طرف فارسی رسم خط

---

1. *Indian Muslims — By Ram Gopal P. 28*

۲۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی۔ ص ۶۸

اپنا چکی تھی تو دوسری طرف اونچے حلقوں کے ذریعے اس کے الفاظ کی رنگینی جذب کرتی جاتی تھی۔

اس وقت تک ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی ادبی زبانوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ شاعری اور نثر میں ان کا اپنا ادب تھا۔ جس میں سنسکرت قدیم ادبی زبانوں میں شمار ہوتی تھی اور فارسی رائج الوقت ادبی زبان کی حیثیت سے عروج پر تھی بقیہ مقامی زبانیں ادبی حیثیت سے اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اس وقت کی لینگوا فرینکا یعنی "اردو" کی شاعری مقبول عام ہو چکی تھی اور اس کے شعر و ادب پر ترقی یافتہ فارسی کے رنگین نقوش کافی طور پر اثر انداز ہو چکے تھے۔ لیکن انگریزی اقتدار سے پہلے درباری زبان فارسی تھی اس لئے نثری تحریروں میں عام طور پر اردو نثر کو وسعت پانے کا موقع نہ ملا تھا۔ دراصل مغلیہ زوال کا دور ہی اردو زبان کی تشکیل و ترقی کا دور تھا، لہذا وہ زمانے کی کشمکش اتار چڑھاؤ مختلف بیرونی اثرات اور دباؤ کے اثر سے جو اس کی راہ میں حائل تھے کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔

انگریزوں نے تمام مقامی زبانوں کی کثرت کے مابین اردو کی اہمیت کے پیش نظر اسے سیکھنے کی شدید ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج اسی غرض کے لئے قائم کیا گیا۔ ولیزلی wellesly اپنے ایک نجی خط میں جو کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا گیا تھا لکھتا ہے۔ "کالج کو قائم رکھنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی۔" ۱ فورٹ ولیم کالج میں جب درسی کتابیں تحریر ہونے لگیں تو اسی ایک زبان پر سنسکرت اور فارسی اثرات الگ الگ غالب تر صورتوں میں نمایاں کر کے زبان کی وحدت کے سوتے سے جو اب تک ایک جگہ سے نکل کر ایک ہی سمت بہتا جا رہا تھا ہندی اور اردو کے دو مختلف دھارے مختلف سمتوں میں بہا دئے گئے۔ "اردو زبان ایک آریائی اور ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندی اور اردو دو مستقل اور جداگانہ زبانیں نہیں ہیں۔" ۲ فورٹ ولیم کی اولین درسی کتابوں اور تراجم سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی - ۱۴۲

۲- ادب اور نظریہ از آل احمد سرور، در مضمون نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصہ ص ۲۶۳

کہ ایک ہی زبان پر فارسی و سنسکرت الفاظ کا نکھار غالب کر دینے سے کس طرح دو قالب میں ڈھل گئی ہیں۔ اس کام میں سب سے زیادہ آسانی رسم الخط کی وجہ سے ہوئی۔ کیونکہ اس وقت تک سنسکرت یا فارسی رسم الخط میں سے کوئی بھی مشترکہ کلچر کے زیر اثر اپنی واحد اور منفرد حیثیت قائم نہ کر سکا تھا۔" چنانچہ جان فریر John Fryer اورنگ زیب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔ "دربار کی زبان فارسی ہے اور عوام اندستان زبان بولتے ہیں جس کا کوئی باضابطہ رسم خط نہیں ہے۔"۱ گوگل کرسٹ کے عہد تک فارسی رسم الخط اردو میں رائج ہو چکا تھا مگر اس کی منفرد حیثیت مکمل نہ ہو پائی تھی کیونکہ ناگری رسم خط بھی جاری تھا۔

چنانچہ رسم الخط کی یہ تفریق انگریزی سیاست کی مصلحت اندیشیوں کا کامیاب آلہ کار بنی۔ اس خیال کی حقیقت اور اس کا وزن گارسان دی تاسی Garcin de Tassy کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک خطبہ "۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء میں کہتا ہے" ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ حکمت عملی رہی تھی کہ اردو کو ہندی سے علیحدہ تصور کیا جائے۔ چنانچہ اردو کا جو جدید ادب اس زمانے میں پیدا ہوا اس میں عربی و فارسی کے الفاظ برابر استعمال کئے جاتے تھے بلکہ ان الفاظ کو ترجیح دی جاتی تھی۔"۲ فورٹ ولیم کالج کو کم و بیش جتنا بھی اس مقصد کے لئے ذریعہ بنایا گیا ہو اور اس لسانی تفریق کا ہندوستانی سماج اور سیاست پر جو بھی اثر پڑا ہو اس سے بحث نہیں۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ اردو کی نثری ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے اہم رول کے باوجود کورہ بالا حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں کی عیارانہ چالوں نے تعلیم اور زبان کو بھی اپنے مفاد کے لئے تفریق کا بڑا آلہ کار بنایا۔ اس آشکارا حقیقت کے ثبوت میں بھی گارساں دی تاسی Garcin de Tassy کی تحریر کافی ہے۔ یہاں پر وہ ایک ہندی کے حامی مسٹر گروز Mr. Gruise کا ذکر کرتے ہوئے

۱۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد از محمد عتیق صدیقی۔ ص ۷۰

۲۔ بحوالہ رسالہ "اردو" اورنگ آباد دکن۔ خطبہ مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خان ص ۱۵

کہتا ہے "ہاں ــــ میں بھی مسٹر گروز Mr. Gruise کی طرح اس بات پر اظہار افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فورٹ ولیم کے منشیوں نے خواہ مخواہ کی جو ایک خلیج اردو اور ہندی کے درمیان پیدا کر دی ہے وہ غیر ضروری ہے۔ یہ دراصل بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں تصور کیا جائے"۔ ۱ یہاں پر اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر گروز حامی ہندی کا بھی یہی خیال تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کی لائی ہوئی برکتوں اور نشاۃ ثانیہ کے عظیم اثرات میں ترقی پسندانہ شدت و تیزی کے باوجود ان سماجی ترقیوں پر ساتھ ہی ساتھ انگریزی مصلحت و سیاست اور انگریزی مفاد کا پورا پورا دباؤ بھی تھا۔ جس نے سماجی ترقی کے اس بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دھارے کو ایک خاص سمت میں بہنے اور مخصوص حدود کے اندر ہی بڑھنے پر مجبور کیا۔ لہذا ہندوستان میں انگریزی دور کی تاریخ ہر قدم پر اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو کی نثری ترقی میں کافی حصہ لیا۔ یہاں اردو زبان کے لئے تین اہم کام ہوئے۔

۱۔ اردو نثر کو سادہ اور آسان طرز میں ڈھالنا۔

۲۔ اردو گرام مرتب کر کے باقاعدہ اس کی اشاعت۔

۳۔ اردو ڈکشنری اور لغت کا تیار کرنا۔

اس وقت تک اردو کا نثری سرمایہ بہت کم اور غیر اہم تھا جو چند داستانوں، شعرا کے تذکروں اور تصوف کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس میں بھی زبان و بیان کی حیثیت سے شعروں کا سا جوڑ توڑ، الفاظ کی رنگینی، بیان کا تصنع، اور تکلف اتنا غالب تھا کہ ہر طرح کے مطالب کے بیان کرنے میں بڑی دشواریاں تھیں۔ فورٹ ولیم کالج نو وارد بدیسیوں کو زبان سکھانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ لہذا جو بھی کتابیں اس میں تیار کی گئیں وہ بہت سادہ اور آسان زبان میں تھیں۔ ادق الفاظ

۱۔ بحوالہ رسالہ اردو، اورنگ آباد دکن۔ خطبات گارساں دی تاسی (سترھواں خطبہ) ص ۶۲

اور پیچیدہ تحریروں سے گریز کیا گیا۔ فورٹ ولیم کی ان نثری کتابوں میں زیادہ تر فارسی کتابوں کے ترجمے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی بنیادی اہمیت ان کی سادہ اور آسان زبان میں پوشیدہ ہے۔ ان سب میں میرامن کی باغ و بہار زبان کی سادگی، شستگی اور بے ساختگی میں بہت اعلیٰ حیثیت رکھتی ہے یہ نئی اردو نثر کی نشان راہ تھی۔ اس کے علاوہ جو اور اہم چیزیں اس کے ذریعے اردو نے حاصل کیں وہ اردو زبان کی گرامر اور اردو ڈکشنری ہے۔ کوئی زبان جب ادبی ترقیوں کی حدود میں قدم رکھتی ہے تو اس کے قواعد وضوابط مرتب کرنے اور لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو وارد انگریزوں کو زبان سیکھنے کے سلسلے میں اس کے قواعد وضوابط سمجھنے اور یاد رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

فورٹ ولیم میں اردو نثر کی ترقی اور سرپرستی کا سہرا سرجان گل کرسٹ کے سر ہے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اردو سیکھنے کی غرض سے اس کے مراکز میں قیام کر چکے تھے۔ دو سالوں تک غازی پور، بنارس اور آس پاس کے علاقوں میں مقیم رہے۔ لغت کی تیاری کے لئے گل کرسٹ کی چھٹی کی درخواست پر ڈاکٹر فرانس بلغور Dr. Francis Bilghore نے ایک سفارشی خط مورخہ ستمبر ۱۸۸۵ء میں لکھا ہے۔ "اپنی کتاب کا مواد فراہم کرنے کے سلسلے میں لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، جونپور، کے علاوہ دوسرے علمی مراکز کا سفر بھی ختم کر لیا ہے جہاں سے ہر طرح کی معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔"[۱] گل کرسٹ نے دیسی باشندوں سے ربط وضبط قائم کیا۔ دیسی لباس پہنے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کے قیام کے ساتھ اردو شعبہ کی ذمہ داری مکمل طور پر سنبھالی اور نہایت محنت جانفشانی اور انہماک سے اردو زبان میں تراجم اور تصنیفات اپنی نگرانی میں کرائیں۔ ان کی اشاعت میں بھی تندہی سے حصہ لیا۔ اس طرح انگریز افسران کے لئے بہت محنت سے اردو کی درسی کتابیں مہیا کیں۔ اردو گرامر اور ڈکشنری گل کرسٹ ہی کی محنت کا ثمر بن کر اول اول اردو ادب کی زینت بنیں۔ گو انھوں نے ڈکشنری اور گرامر مرتب کرنے کی کوشش فورٹ ولیم کے قیام سے قبل ہی شروع کی تھی۔ مگر مالی پریشانیوں کے باعث اسے مکمل نہ کر سکے تھے جو یہاں تکمیل۔

۱۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ از محمد عتیق صدیقی۔ ص ۷۱

کو پہنچیں اور شائع ہوئیں۔ اپنی ولایت کی واپسی پر انھوں نے ہندوستان آنے والے افسران کے لئے لندن میں اردو سیکھنے کا ایک ادارہ کھولا تھا۔ انھوں نے اردو گرامر اور ڈکشنری وہاں سے بھی شائع کرائیں۔ چنانچہ انگریز افسران کی یہ ضرورت اردو نثر کی ترقی کا ابتدائی زینہ بن گئی۔ گرامر کے مرتب ہونے سے اردو زبان کے قواعد منضبط ہو گئے جو نثری ترقی کے لئے نشان راہ تھے۔ ڈکشنری کی تیاری سے اردو الفاظ و محاورات کا شاندار ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس لئے اردو نثر کی ترقی اور راہبری میں فورٹ ولیم کی حیثیت اولین اور اہم ہے۔ گویا یہاں سے اردو نثر نے نئے موڑ پر قدم رکھا۔

فورٹ ولیم میں اردو کی سادہ اور آسان طرز کی تحریر نے گو ہر طرح کے موضوع و مطالب کے لئے راہ ہموار کر دی تھی پھر بھی اس کا اثر عام ادبی حلقوں پر کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ فورٹ ولیم کی حدود میں ہی محدود تھا۔ کیونکہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان گو دلی اور لکھنؤ میں اردو شاعری کا بول بالا رہا مگر نثر اپنے قدیم رنگ میں قائم تھی۔ نو طرز مرصع، داستان امیر حمزہ، بوستان خیال اور بستان حکمت جیسی داستانیں اب بھی رنگینیٔ الفاظ اور پیچیدگی، تحریر پر داد حسن وصول کرتی تھیں۔ یہ ٹھوس اور حقیقی موضوعات کے بجائے خیالی دنیا بسائے ہوئے تھیں۔ اسی درمیان میں ۱۸۲۵ء میں دلی کالج قائم ہوا گو اس کا اصلی مقصد مغربی علوم، سائنس اور انگریزی تعلیم کی اشاعت تھا مگر اردو کی نئی ترقی میں فورٹ ولیم کے بعد دلی کالج کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔ چونکہ یہاں ورنیکلر کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی اس لئے اردو زبان کو نثری ترقی کا عمدہ ذریعہ ملا۔ بقول خواجہ احمد فاروقی فورٹ ولیم کالج سے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی تک عشق کی ایک جست نہیں ہے۔ قدیم دلی کالج اس کی درمیانی منزل ہے۔۔۔۔ ایک نئی فضا اور نئی شش جہت پیدا کرنے میں دلی کالج کا بڑا حصہ ہے۔[۱] یقیناً اردو نثر کو ٹھوس حقیقی اور علمی موضوعات دینے میں ابتدائی طور پر دلی کالج کا خاص حصہ رہا ہے۔ چونکہ یہاں تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اس لئے مذہبی تحریروں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ سائنس، شعر و ادب اور ٹھوس علمی و ادبی موضوعات کی کتابیں ترجمہ و تحریر کے ذریعے مہیا کی گئیں۔ اس مقصد کے لئے باقاعدہ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔ کالج کے اولین

۱۔ کلاسکی ادب از خواجہ احمد فاروقی، در مضمون جنگ آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۴۸

پرنسپلوں میں ڈاکٹر اسپرنگر Dr.Sprenger کیپٹن ٹیلر Capt. Taylor اور پروفیسر بوتروس Prof. Botrus تھے۔ اول الذکر دونوں مشرقی علوم والسنہ کے محقق تھے جو عربی و فارسی کی تحصیل اور ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے بانیوں میں سے تھے۔

ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے بارے میں گارسان دی تاسی لکھتا ہے "اسی انجمن نے سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمہ کرکے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔" ۱ اس انجمن کی تیار کردہ کتابیں قابل ستائش ہیں مگر چونکہ درسی مقاصد کے لئے لکھی گئیں اس لئے اہم ادبی درجہ نہیں رکھتیں ہیں بہرحال اس کے فوائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ایسی کتابوں کے ذریعہ اردو نثر میں سادہ زبان کے ساتھ ہر طرح کے ٹھوس موضوعات کی ابجد ہوگئی۔ مغربی خیالات واثرات اور سائنسی علوم ونظریات کا تعارف اردو کے حلقوں میں ہونے لگا۔ ماسٹر رام چندر، منشی ذکاءاللہ، ٹیلر Taylor اسپرنگر Sprenger اور پیارے لال آشوب وغیرہ نے صحافت، سائنس اور جدید مغربی تصورات کا اولین احساس کسی نہ کسی حد تک دلا ہی دیا۔ مگر دلی کالج اس مقصد کے انجام دینے میں ابھی اولین قدم ہی بڑھا پایا تھا کہ غدر سے تباہ و برباد ہوگیا۔ پھر بھی اس کے بنائے ہوئے نقوش کچھ نہ کچھ باقی رہ گئے۔ دلی کالج تو تباہ ہوگیا مگر وہ طلبار باقی رہے جن کے اذہان کی تشکیل اس ادارے میں ہوئی تھی۔

اس پورے دور آشوب میں شستہ اور بے ساختہ نثر اگر کہیں ملتی ہے تو وہ غالب کے خطوط میں جو نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب نے یہ اثر فورٹ ولیم یا دلی کالج سے لیا یا ان کی اپنی غیر معمولی و انفرادی صلاحیت اور فکری و ذہنی جودت کا دین ہے بہرحال اس وقت تک اردو نیں نثر عام طور سے قدیم طرز پر ہی گامزن تھی۔ فورٹ ولیم اور دلی کالج کی اہمیت نئے نثری ادب کے نقش اولین کی بنا ڈالنے میں منحصر ہے۔ مگر دراصل اردو ادب کی عظیم ترقی، وسعت اور اشاعت نئی بنیادوں پر غدر کے بعد سرسید کے ذریعہ ہوئی۔ دلی کالج کے بارے میں خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں۔ "یہاں جو چیز ایک مبہم احساس کی صورت میں تھی وہ سرسید کے یہاں عظیم اصلاحی پروگرام بن گئی۔" ۲

۱۔ قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء درمضمون قدیم دلی کالج گارسان دی تاسی کی نظر میں از ہربنس لال۔ ص ۱۱۶

۲۔ قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء در شذرات۔ از خواجہ احمد فاروقی، ص ۲۱

سرسید کے ذریعے اردو ادب و شاعری کو مکمل وسعت نئے تصورات اور نئی راہیں خاص طور پر ملیں نیز اردو ادب میں نئے مغربی اثرات پورے طور پر شامل ہو گئے۔ یہ اثرات کیا تھے؟ اور سرسید کی عظیم ادبی خدمات اردو ادب کے لئے کیا اہمیت رکھتی ہیں؟ اس کی تفصیل ایک الگ باب میں ہے۔ یہاں صرف اتنی نشان دہی کافی ہے کہ اس عظیم دور تغیر میں سرسید کی شخصیت ایک محب قوم و وطن بن کر ابھرتی ہے۔ ایسے خطرناک زمانہ میں جب کہ قوم کی شکستہ کشتی مغربی طوفان کے تھپیڑوں میں جھکولے کھارہی تھی امید کے چراغ گل تھے، خوف و وحشت ایک طرف اور غفلت دوسری طرف پورے طور پر مسلط تھی، سرسید نے اپنی تمام صلاحیتیں اور قوت عمل اس بات میں صرف کردی کہ کس تدبیر سے اس ڈوبتے بیڑے کو غرق ہونے سے بچایا جائے۔ اس سلسلے میں سرسید کی سوشل وادبی خدمات نئے ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں اہم ہیں۔ اور ان کی تحریک کے مقاصد کو اجاگر کرتی ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کی وسعت اور اس کے تفصیلی جائزے سے ہمیں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کی تعلیمی، سماجی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی صورت حال کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان عظیم اثرات کے اہم پس منظر کو تفصیلی طور پر سامنے رکھے بغیر سرسید کی خدمات، ان کی تحریک اس کے اثرات اور اہمیت کو سمجھنا ممکن نہ تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے انیسویں صدی کی ابتداء میں جو تحریک چلائی اس کے اثرات بہت گہرے تھے۔ یہ اسی تحریک کا اثر تھا کہ بنگال بہت جلد جاگ اٹھا۔ نیو ہندوازم کی تشکیل ہوئی اور نئی سیاسی تحریک کا وجود بھی ہونے لگا۔ اس وقت تک انگریزوں کا بڑھتا ہوا غلبہ مسلمانوں کی سیاسی کمزوریوں کو واضح کر چکا تھا۔ ان کی سیاسی اور سماجی پوزیشن حد درجہ کمزور و پست ہوتی جارہی تھی۔ قدیم طریقۂ تعلیم ختم اور ذریعہ معاش کے لئے بیکار ہو گیا تھا۔ نئی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سے وہ بے خبر تھے بلکہ نفرت کی بنا پر ہر مغربی چیز سے قصداً گریز کرتے تھے۔ نتیجتاً سماج کا جاہل اور ناکارہ جز ہوتے جارہے تھے۔

اس عظیم تباہی کے درمیان انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں قدیم مرکز ہند کے قلب سے وہ تحریک اٹھی جس نے پہلی بار دہلی، اودھ اور ان کے اطراف وجوانب میں جدیدیت کا علم بلند کیا اور مغرب سے ہم آواز ہو کر نئے زمانہ کی ہم قدم ہوئی۔ سرسید کی اس تحریک

کو ہم اولین جدید تحریکوں کی تکمیل کہہ سکتے ہیں جس نے ہندوستانی سماج کے ایک معطل جز کو نئے ہندوستان اور نئی صورتوں کے مطابق کام کرنے کے لائق بنایا۔ نئے ہندوستان میں ایک سماجی توازن قائم کرنے کی انتھک کوشش کی جو ملکی ترقی کے لئے اہم اور لازمی تھی۔ مردہ مسلم سوسائٹی میں ایک نئی روح پھونکنے کی پوری کوشش کی۔ اس تحریک کا سوشل پہلو بھی ہے۔ اور مذہبی حسن بھی، سیاسی رخ بھی ہے اور تعلیمی رجحان بھی، علاوہ ازیں اس کا ادبی مقام بھی ہے۔ یہی ادبی پہلو ہمارا موضوع ہے جو ازخود ایک اہم تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کی خدمات و اصلاح کی تفصیل الگ باب میں ہے۔ مگر اِن تفصیلات اور ان کے ادبی کارنامے بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ان کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جس سے ان کی شخصیت اور رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملے اور ماحول اور وقت کے تقاضوں کا اندازہ ہو۔

باب سوم

سرسید ۱۸۵۷ء سے پہلے۔ دورِ تشکیل

کسی تحریک کی بنیادی حیثیت سمجھنے کے لئے جس طرح اس کے پس منظر پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ اسی طرح بانئ تحریک کی شخصیت کو سمجھنا لازمی ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کے اولین حالات زندگی و ماحول و تربیت کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاکہ اس کی شخصیت کے ذہنی رجحانات کی روشنی میں اس کی خدمات اور اصلاح کو سمجھا جا سکے اور اس تحریک کی بنیادی اہمیت واضح ہو سکے۔ لہذا سرسید کی خدمات کو سمجھنے اور ان کا درجہ متعین کرنے کے لئے اس عظیم دور تغیر کے وسیع پس منظر اور اس کے ہر پہلو کو ذہن میں رکھ کر اب ہمیں ان کی زندگی اور ماحول پر نظر ڈالنا ہے۔ حالات زندگی اور ماحول وہ چیزیں ہیں جو عادات و اطوار کی تعمیر اور ذہنوں کی تشکیل میں خاص حصہ لیتے ہیں۔ حالات اور واقعات ذہنوں پر نقوش بناتے اور حادثات زمانہ طبیعتوں کو بدل ڈالتے ہیں۔ سرسید کی زندگی میں بھی ایسے نشیب و فراز کثرت سے آئے۔ ابتدائی تعلیم اور تربیت ہمیشہ انسان کی فطرت کا جزبن جاتی ہے جو عادات و اطوار کو مخصوص سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ مگر اعلیٰ فطری صلاحیتیں ماحول کی خوبیوں کو جذب کر لیتی اور اس کی خرابیوں سے گریز کرتی ہیں۔ ہر چیز میں غور و فکر سے کام لے کر اس کے اسباب و علل سے نتائج نکالتی اور اپنی عملی سرگرمیوں میں اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنی زندگیاں انسانی بھلائی اور ترقی کی کوششوں میں صرف کر دیتے ہیں اور اپنے مقاصد میں کسی شخصی مفاد کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

سرسید نے خاصی طویل عمر پائی جو واقعات و حادثات اور عمل سے بھری ہوئی تھی۔

انھیں چیزوں نے ان کی زندگی کے مختلف ادوار ۔ کو اہم بنایا لیکن یہ حقیقت ہے کہ شروع کے مقابلہ میں آخری زمانہ زیادہ ہمہ گیر، اہم، اور نتیجہ خیز تھا۔ یہاں ہم مختصراً ان کی ابتدائی زندگی کے نقوش پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی شخصیت اور ذہنیت کا اندازہ ہو سکے۔ سر سید احمد کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پہلا دور وہ ہے جس میں سر سید نے آنکھیں کھولیں۔ یہ زمانہ تاریخی، تہذیبی اور اقتصادی غرض ہر لحاظ سے ہنگامی و ہیجانی تھا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور سخت موڑ تھا۔ یہ زمانہ مغل شاہی حکومت کی تیز زوال پذیری پرانی تہذیب کی ٹوٹتی بکھرتی ہوئی قدروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اقتدار و تسلط کا زمانہ تھا۔ پرانی تہذیب کی جھلملاتی قدریں نمایاں اثرات کے باوجود غائب ہوتی جاتی تھیں اور نئے زمانے کا دھندھلکا سامنے تھا۔ اقتصادی تاریخ زمینوں اور جاگیروں کو جواب تک معاشیات کا مرکز تھیں اپنی جگہ سے ہٹا رہی تھی۔ مغل شاہی حکومت کی آخری ہچکیاں صاف محسوس ہونے لگی تھیں۔ اور سرمایہ دارانہ نظام و انگریزی تسلط کی سرگرمیاں کہنہ اقتدار کو بے بس محض کرتی جاتی تھیں۔ مگر ہیجانی دور میں مغل شاہی حکومت کی عظمت و شان کا سکہ قدیم تہذیب کا ستارہ بن کر اب بھی جھلملا رہا تھا۔

غدر کی ہنگامہ خیز صبح کے ساتھ جب یہ ستارہ بھی ڈوب گیا تو سر سید کے دل و دماغ پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ انھوں نے ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے دیکھا۔ ہم وطنوں اور ہم قوموں کو بدحال اور مجبور۔ ملک کی صنعت و دولت کو برباد و پامال ہوتے دیکھا۔ قدیم تہذیب و علوم کو مٹتے پایا۔ زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اسے بیجان اور کھوکھلا محسوس کیا۔ مذہب کی روح رسوم و عقائد کی زنجیروں میں محبوس نظر آئی۔ ان تمام حادثات نے ان کے قلب کو ملک و قوم کے درد سے بے چین و بے تاب کر دیا۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ سرکاری عتاب کو ٹھنڈا کر کے پرامن و سازگار فضا اور سرکار و عوام میں رابطہ ضروری ہے جس سے ہندوستانیوں کو آگے بڑھنے اور صلاحیت کے ساتھ زندگی کو نئی اقدار سے آشنا کرنے کا نئے سرے سے موقع مل سکے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ملکی آزادی و ترقی کے لئے قومی بیداری، اور قومی بیداری کے لئے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اعلیٰ تعلیم اور نئے اقدار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھیں ذہنی اثرات کے تحت ان میں ہمت

عزم و حوصلہ بیدار ہوا اور ارادے کی پختگی کے ساتھ ہر مشکل سے قطع نظر کرکے انھوں نے اپنی عملی سرگرمیاں اور مصلحانہ کوششیں مستقل طور پر شروع کر دیں۔

یہیں سے ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے مختلف اصلاحات کے لئے ہر طرف قدم بڑھایا۔ سماجی اصلاح کے بکھرے ہوئے گوشوں پر اپنی فکر و عمل کا زور لگایا۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی انگلینڈ کی روانگی کے وقت سے وہ تیسرا دور شروع ہوتا ہے جب کہ انھوں نے مختلف گوشوں سے اپنی توجہ ہٹا کر قوم کے بنیادی مرض اور اس کے علاج پر مرکوز کر دی۔ ملکی و قومی ترقی کا راز اعلیٰ مغربی تعلیم کی اشاعت میں جان کر اپنا سارا زور اسی طرف لگایا۔ اس وقت سے آخر دم تک سرسید ایک باعزم و حوصلہ انسان کی مانند سچے خادم قوم و وطن رہے۔ آخر الذکر ادوار کی تفصیل آگلے باب میں آئے گی۔ یہاں ہم ان کی ابتدائی زندگی کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے آئندہ ان کے عادات مزاج، ذہنیت اور شخصیت کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں ان کے عملی رجحانات کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد ملے گی۔

سرسید احمد خاں دادھیال و ننھیال دو طرفہ دہلی کے بڑے اور باعظمت خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خاندانی سید تھے اور چھتیس واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب حضور رسول پاک صلعم تک پہنچتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں سید برہان الدین دہلی آکر مقیم ہوئے۔ ان کے بیٹے سید عماد تھے جن کے دو بیٹے سید مہدی اور سید ہادی ہوئے۔ آخر الذکر سرسید کے دادا تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے عالمگیر ثانی کے زمانے میں بڑے خطابات اور عہدے پائے۔ سید ہادی کے بیٹے میر متقی سرسید احمد خاں کے والد تھے۔ جو فقیر دوست، آزاد منش اور باوضع انسان تھے۔[۱] ان کا موروثی مکان جامع مسجد دہلی کے جنوب مشرق گوشہ میں واقع تھا۔ سرسید کے والد نہایت درویش صفت اور صوفی مزاج انسان تھے۔ وہ شاہ غلام علی کے مرید تھے اور اس خانقاہ سے خاص لگاؤ اور محبت رکھتے تھے۔ سرسید کے ننھیال میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی تعلیم اور ان کے خیالات کا خاص اثر تھا

۱۔ حیات سرسید ترجمہ محمد فاروق، ص ۵-۶ (ایک عیسائی مصری عالم کی تصنیف ترجمہ از محمد فاروق)۔

حیات جاوید۔ ص ۱۶ - ۱۸ (حصہ اول پہلا اڈیشن ۱۹۰۱ء)

لیکن ان کی والدہ حضرت شاہ غلام علی کی مرید تھیں اور ان سے خاص عقیدت رکھتی تھیں۔ شاہ غلام علی بیر متقی اور ان کے خاندان کو بہت مانتے تھے اور گھر کی مانند تعلق رکھتے تھے۔ سرسید انھیں دادا حضرت کہا کرتے تھے اور والدہ کے ساتھ اکثر ان کی صحبت میں جایا کرتے تھے۔" ۱ لہذا انھیں بچپن سے ہی مذہبی ماحول سے قربت اور روحانیت سے لگاؤ رہا جس کی خاص صفت خدمت خلق، ایثار نفس اور فیض رسانی ہوتی ہے۔ یہ خاص قدیم طرز کا مذہبی ماحول تھا اور یہیں سرسید کی مذہبی پختگی کی بنیاد پڑ گئی۔ حبیب الرحمن خاں شروانی لکھتے ہیں۔ "حضرت شاہ غلام علی صاحب کی صحبت کا اثر ان کے قلب و دماغ پر آخر تک قائم رہا۔ میرا خود تجربہ ہے کہ آخر عمر میں بھی باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے شاہ صاحب کا ذکر چھڑ جاتا تو گھڑیوں اس میں محو رہتے۔ ایک بار میں نے گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ پورے پینتالیس منٹ شاہ صاحب کا ذکر کرتے رہے۔" ۲ شاہ عبدالعزیز اور ان کی تعلیم کا خاص اثر سرسید کے پورے کردار میں نظر آتا ہے۔ ولی اللّٰہی تحریک کے اثر سے ہی انھوں نے مذہب میں تقلید اور رسوم بندی کو کبھی درست نہ جانا اور ہمیشہ اس کے خلاف جہد کی۔ گو رواج وقت کے مطابق سرسید مذہبی عالم نہ بنے مگر اس مذہبی ماحول اور شاہ عبدالعزیز کے لگاؤ و اثر سے ان کی قوت ایمانی پختہ ہوئی اور وسیع النظری و جدیدیت ان میں نمایاں ہوئی جو ان کی زندگی کا نمایاں کردار رہے۔

سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد اور دادا سید ہادی میں اچھے تعلقات تھے۔ خواجہ فریدالدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد سے تھے۔ وہ اپنے زمانے کی بہت باعزت ہستیوں میں شمار ہوتے تھے اور بڑے صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ ریاضی میں کمال رکھتے تھے نیز اس سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ آلات رسد بھی خود بنا لیتے تھے انھوں نے خان بہادر، دبیرالدولہ، امین الملک اور مصلح جنگ وغیرہ کے خطابات پائے۔ وہ پہلے مدرسہ کلکتہ میں جو انگریزوں نے بنایا تھا سات سو ماہوار پر بحیثیت سپرنٹنڈنٹ بحال رہے۔ پھر اکبر شاہ ثانی (۱۸۱۵ء) کی وزارت نہایت دانشمندی اور قابلیت

۱۔ حیات جاوید ص ۱۸ و ۲۹ (حصہ اول پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

۲۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۳۱ - ۳۲۹

سے سنبھالی۔ اس وقت قلعہ میں آمدنی کی سخت تنگی کے باعث افراتفری تھی۔ ملازمان کی کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں باقی تھیں۔ انھوں نے نہایت دانشمندی سے ایسے انتظامات کئے جن سے کچھ ہی دنوں میں آمدنی و خرچ برابر ہو گیا۔ منجملہ ان چیزوں کے ایک یہ بھی تھی کہ دس فی صدی تمام تنخواہیں کم کر دیں۔ نیز مرہٹوں کی لوٹ میں جو دیوان عام کی تانبے کی چھت مع سونے کے ملمع کے اکھڑی پڑی تھی اس سے سونا الگ کرا کے تانبے کے سکے ڈھلوائے مگر مخالفتوں کے باعث اس عہدے سے مستعفی ہوئے "۔ ۱ خود سرسید کے والد بھی قلعہ سے وظیفہ پاتے تھے اور اکثر سرسید انکے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ (فٹ نوٹ نمبر ۱)۔ ۲ بادشاہ ان کو بہت مانتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ اور اکثر خطابات شاہی اور خلعت وغیرہ سے نوازتے تھے۔ اس لئے بچپن ہی سے سرسید قلعہ کے اندرونی رسومات اور وہاں کے حالات دیکھتے آئے تھے اور بہت قریب سے اس زندگی کو دیکھا اور سمجھا تھا اس سے ایک طرف تو قدیم تہذیب کے اثرات ان میں نمایاں ہوئے دوسری طرف عمر اور سمجھ کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں اور اس کی دم توڑتی ہوئی حالت کا جائزہ لینے کا بھی موقع ملا۔

سرسید کی والدہ کا نام عزیزۃ النساء بیگم تھا جو بہت ذہین، روشن دماغ، عاقل اور خدا ترس بی بی تھیں۔ سرسید کی تربیت میں ان کا بہت کامیاب ہاتھ رہا۔ سرسید کا بیان ہے کہ ان کی والدہ کے اعتقادات اور اعمال میں وقتی اور رسمی چیزوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ چنانچہ جب ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو اس کے کئی روز بعد ان کے کسی قریبی عزیز کے یہاں شادی کی تاریخ تھی۔ اس واقعہ کے بعد ان لوگوں نے تاریخ بڑھوانی چاہی تو سویم بعد ان کی والدہ خود ان کے گھر گئیں اور ایسا کرنے سے منع کیا اور خود شریک ہوئیں۔ حیات جاوید میں خود سرسید کی زبانی ان کے بچپن اور نوجوانی کے چند ایسے واقعات درج ہیں جن سے عزیزۃ النساء بیگم کی اعلیٰ ذہنیت اور تدبر کا پتہ چلتا ہے۔ ایک بار گیارہ سال کی عمر میں سرسید نے گھر کے بڈھے ملازم کو ایک تھپڑ لگا دیا۔ والدہ کو یہ معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئیں اور جب تک انھوں

۱۔ حیات جاوید۔ ص ۲۴ (حصہ اول پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

۲۔ (تفصیلی فٹ نوٹ نمبر (۱)، باب سوم) ص ۳۱۴

نے ملازم سے معافی نہ مانگ لی انھیں معاف نہ کیا۔ وہ اکثر نصیحت کیا کرتیں کہ جہاں برابر آنا جانا ہو وہاں کبھی سواری پر اور کبھی پیدل ہر طرح جانا چاہئے کیونکہ زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ ایسا نہ ہو کبھی شرمندگی اٹھانی پڑے۔

ملازمت کے زمانے میں ایک بار سرسید کو ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس شخص کے ساتھ انھوں نے سلوک کیا تھا اسی نے متواتر گمنام خطوط کے ذریعے ان کی شکائتیں دفتر کمشنری میں بھیجنی شروع کیں اور ان کے درپے ہوا۔ اس کا پورا ثبوت سرسید کے ہاتھ آیا اور اچھا موقع بھی کہ افسر اعلیٰ اس شخص کا سخت مخالف تھا۔ سرسید نے چاہا کہ اس کو افسر کے ذریعے سرزنش ہو مگر ان کی والدہ نے منع کیا اور کہا کہ بہتر یہ ہے کہ درگذر کرو اور اگر بدلہ ہی لینا ہے تو اس کا فیصلہ سب سے بڑے حاکم پر چھوڑ دو۔ دنیاوی حکام کے ذریعے ایسا کرنا دل کی ہوس ہے لہٰذا سرسید نے اس سے درگذر کیا۔" ۱ عزیزۃ النساء بیگم کی اسی اعلیٰ ذہنیت اور پختہ کردار کا اثر ان کی تربیت میں مکمل طور پر رہا اور سرسید ایسی روشن دماغ، وسیع النظر اور خدا ترس ماں کی آغوش تربیت میں پرورش پا کر ایک ایسے پختہ کردار اور اعلیٰ ذہنیت کے مالک بنے جو آئندہ چل کر ان کی زندگی کا جزو لاینفک نظر آتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ سرسید نے دہلی کی نہایت معزز، تعلیم یافتہ، مذہبی اور باعزت گھرانے میں آنکھ کھولی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے خاندان میں علم کی روشنی، روحانیت اور مذہب کا نور و فیض نیز دنیوی جاہ و حشم سب کچھ جمع تھے۔ سرسید نے پرانی تہذیب کی اس آخری جلوہ گری کے زمانے میں ایک طرف اس تہذیب کی وضعداری، خلوص اور صاف گوئی، مذہب کی محبت اور کیرکٹر کی پختگی پائی تو دوسری طرف انھیں ایسے حالات اور مواقع ملے جنھوں نے انھیں فکر کی بلندی، آزاد خیالی، جدت پسندی اور وسیع النظری کے ساتھ تقلیدی بندشوں سے باز رکھا۔ الغرض سرسید کے خاندانی حالات سے ان نقوش کا پتہ چلتا ہے جو ان کی تعلیم و تربیت میں نمایاں تھے اور جن کے اثرات سرسید کی ذہنیت، ان کے کردار اور ان کی عادات و مزاج میں نمایاں تر نظر آتے ہیں۔

سرسید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے ایک بڑے بھائی

۱۔ حیات جاوید۔ ص ۲۲ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)

سید محمود اور ایک بڑی بہن صفیۃ النسا، بیگم بھی تھیں۔ ان کا بچپن ننھیال میں گذرا اور پرانے شریف خاندانوں کے طور طریقوں کے مطابق ان کی پرورش ہوئی۔ قدیم مسلم گھرانوں کے طور پر تعلیم بھی پائی۔ ابتدا میں ان کی بسم اللہ شاہ غلام علی کے ہاتھوں ہوئی اور پھر قرآن شریف ایک پردہ نشین استانی نے ختم کرایا جیسا کہ اکثر گھرانوں میں اس وقت رواج تھا۔ ختم قرآن شریف پر بہت دھوم دھام سے محفل میلاد ہوئی۔ اس کے بعد مولوی حمید الدین سے جنھوں نے ان کے ماموؤں کو بھی پڑھایا تھا تعلیم پائی۔ اور رائج الوقت چیزیں پڑھیں۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد دیگر استادوں سے فارسی اور عربی کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ گلستاں اور بوستاں اور چند کتابیں فارسی کی نیز عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب میبذی وغیرہ "۱ اور اس طرح کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد آلات رسد کی طرف توجہ کی۔ کچھ طب غلام حیدر خاں سے پڑھی۔ غرض اس طرح سے رواج کے مطابق عربی و فارسی کی متوسط درجے کی عام تعلیم حاصل کی نیز مذہبی تعلیم پائی۔ ترک تعلیم کے بعد اپنے شوق سے مطالعہ جاری رکھا۔ خاص کر اس وقت دوبارہ محنت سے مطالعہ کیا جب وہ دہلی میں منصف ہو کر آئے (یہ ان کی ملازمت کا ابتدائی زمانہ تھا) "موج کوثر" کے مصنف لکھتے ہیں "۱۸۴۶ء تا ۱۸۵۵ء جب وہ دہلی کی منصفی پر مامور ہوئے تھے انھوں نے تحصیل علم میں زیادہ ترقی کی۔ اس زمانے میں سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ شاہ عبد العزیز کے جانشین محمد اسحق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں۔" ۲ انھیں بزرگوں کی صحبت اور اثر سے انھوں نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا پورا پورا اثر لیا۔ چنانچہ سرسید کے خیالات و عقائد میں ہر جگہ اس کا اثر نظر آتا ہے۔

آثار الصنادید میں سرسید نے مولانا سید احمد بریلوی مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا شاہ عبد العزیز کے متعلق جس عقیدت و احترام اور ادب کا اظہار کیا ہے اور ان کے مخالفین پر سخت نکتہ چینیاں کی ہیں نیز ہنٹر Hunter کی کتاب کے جواب میں جو وہابی عقائد کے حق میں ان کی تحریر ہے یہ سب اس بات کا پورا ثبوت دیتی ہیں کہ سرسید ولی اللّٰہی تحریک سے پوری طرح متاثر

۱۔ حیات جاوید ص ۴۱ (حصہ اول پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۰۱ء)

۲۔ موج کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام۔ ص ۲۰

تھے۔ آثار الصنادید سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید مولانا اسمٰعیل شہید کے جامع مسجد کے وعظ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ حیات جاوید میں حالی بھی لکھتے ہیں کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے ان کے خیالات کی زیادہ اصلاح کی اور انھیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا نیز یہ کہ وہ سید احمد بریلوی کی اصلاحی تحریک سے بہت متاثر ہوئے انھوں نے اس زمانے میں علی الاعلان خود کو وہابی کہا تھا جب سب وہابی باغی سمجھے جاتے تھے۔"۱ اس وقت وہابی انگریزوں کی نظر میں بغاوت کے جزو خاص تھے۔ دہلی اس زمانے میں بھی باکمالان علم و فن کا مسکن تھی۔ سرسید کو اس زمانے کے اہل علم اور فارسی داں حضرات کی بھی صحبت ملی۔ اور ان باکمال ادبا کی صحبت سے سرسید نے پورا فیض اٹھایا۔"۲ غالباً یہی وجہ ہے کہ اپنے فطری اور علمی ذوق کے علاوہ انھیں علم و ادب سے اتنا لگاؤ اور شغف ہو گیا۔ علم و ادب کا اعلیٰ ذوق اور شوق تحقیق جو ان کا فطری رجحان تھا چمک اٹھا۔ خود ان کے نانا نہایت ذی علم اور قابل شخص تھے۔ انھیں ریاضی میں کمال حاصل تھا جس پر انھوں نے چند رسالے بھی تصنیف کئے تھے (جنھیں بعد میں سرسید نے شایع کرایا) آلات رصد میں ایجادات کیں۔ ان کا کتب خانہ نہایت عظیم الشان تھا جو ان کے علمی ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ افسوس کہ غدر میں سب نذر آتش ہو گیا۔"۳

مذہبی ماحول، خانقاہ سے تعلق اور باکمال ادبا اور قابل ہستیوں کی قربت کے باوجود سرسید نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں قدیم تہذیب کی رنگین محفلوں میں بھی خوب حصہ لیا۔ اور عیش و عشرت کی وہ رنگینیاں بھی دیکھیں جو اس زمانے کے باحیثیت گھرانوں کا عام رنگ ڈھنگ تھا۔ چنانچہ نوجوانی کے زمانے میں تیراکی کی مشق و مقابلہ کے دل چسپ شغل، رنگین محفلوں دوست احباب کی مجالس میں راگ اور رنگ کی شب گزاریوں میں ہمیشہ حصہ لیتے تھے۔ عیش و نشاط کی رنگین محفلیں شبانہ روز گرم رہتی تھیں اور عاشقانہ شاعری کی دھوم تھی۔ چنانچہ یہ بھی مشاعروں میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ ایک مختصر سی مثنوی بھی لکھی۔ تخلص آہی اختیار کیا تھا۔ غرض ان کے تین چار سال خوب رنگ رلیوں میں بسر ہوئے۔"۴ باغوں، میلوں، تماشوں،

۱۔ حیات جاوید از حالی۔ ص ۱۲۲ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۲۔ حیات سرسید از نور الرحمٰن۔ ص ۲۸

۳۔ حیات جاوید ص ۲۳ (سرسید کی زبانی) (حصہ اول پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

۴۔ مقالات سرسید۔ مرتبہ عبد اللہ خان خویشگی در وقائع عملی زندگی ص ۲۳-۲۲

راگ رنگ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی بڑے زندہ دل، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ گویا یہ بھی ان کی زندگی کا رنگین تجربہ تھا۔ داستان تاریخ اردو میں اسی زمانے کا ایک واقعہ درج ہے کہ دہلی میں ایک طوائف شیریں جان نہایت حسین تھی لیکن اس کی ماں نہایت بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے۔ وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادر بسیار تلخ است" سرسید نے برجستہ کہا "گرچہ تلخ است ولیکن برشیریں دارد"۔ ۱

ان صحبتوں کا سلسلہ ان کے بھائی کے انتقال کے وقت تک برابر جاری رہا۔ بھائی کے انتقال کے بعد سرسید پر کچھ ایسی افسردگی طاری ہوئی کہ وہ ایسی محفلوں سے گریز کرنے لگے کیونکہ انھیں اپنے بھائی سے بے انتہا محبت تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ نہایت متشرع وضع اختیار کرنے لگے۔ یہ سلسلہ اس وقت مکمل طور پر منقطع ہوگیا جب ان کے والد کے انتقال کے بعد انھیں فکر معاش ہوئی۔ اور یہیں پر ان کے بچپن اور نوجوانی کی تمام بے فکریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید رؤسا کی محفلوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ اور اس کے کھوکھلے پن کو مکمل طور پر محسوس کرنے لگے تھے لیکن مروجہ مذہبی رنگ میں بھی ان کو وہ روحانی تسکین اور فیض حاصل نہ ہو سکا جو ولی اللٰہی تحریک کی اساس تھا۔ اور زمانہ طفلی ہی میں ان کے ذہن و نظر پر گہرا نقش بنا چکا تھا چنانچہ غدر کے بعد انھوں نے رواجی مذہب اور تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر نئے مسلک کے ساتھ مغرب سے مفاہمت کا اعلان کیا۔ اس طرح مذہب کی وہ روح بیدار کرنی چاہی جو ولی اللٰہی تحریک کے اثر سے عقل اور فکر و عمل کو دعوت دیتی تھی اور ہر رسمی چیز سے خواہ وہ گہرے مذہبی رنگ میں ہو مخالفت کا اعلان تھی۔

۱۸۴۶ء میں میر متقی (والد) کے انتقال کے بعد ان کی یہ بے فکر زندگی ذمہ داری میں تبدیل ہوئی۔ قلعہ کی تنخواہ تقریباً بند ہو گئی تھی۔ فکر معاش کے ساتھ ان کی زندگی میں سنجیدہ اور ذمہ دارانہ دور کا آغاز ہوا۔ قلعہ کی مالی حالت عرصہ دراز سے خراب تھی۔ پھر شہزادوں اور عملوں کی آپس کی چپقلش جس سے افراتفری تھی۔ اس لئے سرسید کو وہاں کوئی معقول ذریعہ معاش نظر نہ آیا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ قلعے میں آمد و رفت رکھتے تھے

۱۔ داستان تاریخ اردو۔ مصنفہ حامد حسن قادری۔ ص ۲۷۵

اور بہادر شاہ سے اعزاز و خطابات و خلعت بھی پا چکے تھے۔ اس لئے وہ اندرونی کسمپرسی بے اطمینانی، تنگی اور آپس کے جھگڑوں سے کماحقہ واقف تھے۔ اس کے علاوہ ان کے نانا انگریزی گورنمنٹ کے ذمہ دار عہدے سنبھال چکے تھے۔ ان کے خالو بھی انگریزی سرکار کے ملازم تھے لہذا انھیں گورنمنٹ انگلشیہ کی ملازمت کا خیال آیا۔ اس زمانے میں ان لوگوں کے لئے جو کسی خاص صنعتی اور آزاد پیشہ سے تعلق نہ رکھتے تھے طریقہ معاش کے دو ہی ذرائع تھے۔ ایک تو یہ کہ کسی سرکار سے وابستہ ہو کر کسی خدمت پر مامور ہوں اور حق ملازمت پر بسر کریں یا معافی اور جاگیریں حاصل کر لیں۔ اس وقت اندرونی خانہ جنگیوں اور لوٹ کھسوٹ کا عروج تھا۔ بنگال پر انگریزی اقتدار کی تکمیل کے ساتھ تمام شمالی ہند میں انگریزی سکہ جمتا جا رہا تھا۔ گو پرانی ریاستوں کی نوعیت بظاہر باقی تھیں پھر بھی کم و بیش براہ راست یا بالواسطہ ان سب پر انگریزی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ لہذا انگریزوں نے انتظامات کے لئے براہ راست بھی عملے رکھنے شروع کر دئے تھے۔

اس وقت عام اذہان انگریزی اقتدار کو اچھی طرح محسوس کر چکے تھے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا یقین عام تھا۔ ایسے بحرانی دور میں ذریعہ معاش کے لئے مجبوراً بھی ادھر رخ کرنا ہوتا تھا۔ سرسید احمد کے خالو خلیل اللہ خاں اس وقت دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر امین کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں کی کچہری میں سرسید چند دنوں تک کام سیکھتے رہے اور سر رشتہ دار مقرر ہو گئے۔ ایک سال کے عرصہ میں کمشنری کے دفتر میں نائب منشی بنا دئے گئے۔ جہاں بہت جلد قانون مال سے واقفیت حاصل کر لی محنت اور کام کی لگن ان کی فطرت تھی لہذا انھوں نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق کمشنری کا تمام دفتر مرتب کیا گیا۔ اسی زمانے میں قانون دیوانی کا خلاصہ تیار کیا تاکہ اس کے مطالعے سے منصفی کے امیدوار فائدہ اٹھا کر منصفی کا عہدہ پا سکیں۔ ان چند باتوں سے جو ان کی ابتدائی ملازمت کے کام ہیں ان کی تحقیقی طبیعت، محنتی اور فرض سے آگاہ ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر کام میں لگن اور محنت سے کام لیتے تھے۔ ملازمت کے تین سال کے عرصے میں مین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔ تین سال بعد فتح پور سیکری کو تبادلہ ہو گیا وہاں چار سال مقیم رہے اور پھر دہلی کا تبادلہ ہو گیا جب سے مسلسل آٹھ سال تک یعنی ۱۸۵۵ء تک دہلی میں رہے۔ دہلی ہی کے زمانہ قیام میں جیسا

کہ اوپر بیان ہو چکا ہے انھوں نے مختلف استادوں سے از سر نو پھر تعلیم جاری رکھی۔ پڑھی ہوئی کتابیں پھر سے بغور دہرائیں اور اپنے طور پر ذوق مطالعہ بڑھایا۔ اسی زمانے میں انھوں نے تصحیح آئین اکبری اور آثار الصنادید تصنیف کیں۔ ۱۸۵۵ء میں صدر امین کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور بجنور بھیجے گئے۔ ان کے بجنور کے ہی زمانہ قیام میں غدر کا واقعہ پیش آیا۔

غدر کے پہلے کا یہ زمانہ ان کی زندگی کا پہلا دور ہے۔ گو سرسید نے آخر تک سرکاری ملازمت بھی جاری رکھی مگر زمانہ ملازمت کے ابتدائی دور سے غدر تک کا زمانہ وہ ہے جب کہ عام زندگی میں وہ ایک سرکاری ملازم کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہ تو یہ ان کی خدمات کا اہم زمانہ تھا اور نہ اس زمانہ میں سوائے اس کے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا کہ انھوں نے غدر کے ہنگامے میں پھنسی ہوئی انگریز عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں اور ان کی حفاظت کی۔ ہر چند کہ یہ خدمت انھوں نے خالص انسانی جذبہ کے تحت بلا خوف و طمع انجام دی مگر ان کے اس فطری اقدام کو ان کی وفاداری سمجھا گیا۔ بہر حال ان کے اس دور کے مطالعہ حیات سے ان چند اہم چیزوں کا پتہ چلتا ہے جو ان کے اخلاق و عادات، فطرت و جبلت پر روشنی ڈالتی ہیں اور جن سے آئندہ چل کر ان کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے اور پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ یقیناً ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اس پرورش، تعلیم و تربیت اور اس ماحول کا پورا اثر تھا۔ جسے قدیم تہذیب کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ ابتدائی دور حیات اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں ان کی شخصیت کی تعمیر عقائد کی تشکیل اور عادات و اطوار کی تربیت ہوئی۔ سرسید پر اس دور کے تین خصوصی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جو ان کے کردار اور اطوار کا جزو خاص بن گئے۔ ان تینوں نے اپنی اپنی جگہ اتنے گہرے نقش بنائے جو آگے چل کر سرسید کے پختہ کردار اور اعلیٰ ذہنیت کے ضامن بنے۔

سب سے پہلے تو جب ہم ان کے بچپن پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی والدہ کی اعلیٰ تربیت اور پختہ کرداری کا اثر ان کے عادات و مزاج میں صاف طور پر اپنی جگہ بناتا نظر آتا ہے۔ سنجیدہ مزاجی، سچائی، ہمدردی، خلوص، وسیع النظری، علو ہمتی، ارادے میں پختگی، سب کچھ انھوں نے اپنی والدہ کے فیض تربیت سے حاصل کیا۔ والدہ کا آمنا

اثر تھا کہ جوانی کے زمانے میں بھی وہ انھیں نصیحتیں کرتی رہتی تھیں اور اپنے مفید مشوروں سے ہر وقت مستفید ہونے کا موقع دیتیں۔ سر سید والدہ کا بہت خیال کرتے ان کی باتوں پر غور کرتے اور مانتے تھے۔ ان کی والدہ کے خیالات مذہب کے سلسلے میں تقلیدی نہ تھے۔ چنانچہ سر سید پر یقیناً اس کا اثر ہوا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ "میں اس زمانے میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصول پر مبنی ہیں اپنی والدہ کے عقائد میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا"۔ ۱

دوسرے سر سید کا خاندان ولی اللہی تحریک سے خصوصی طور پر متاثر تھا۔ ابتدا سے ہی سر سید پر یہ اثرات غالب آئے حتیٰ کہ اسی پر ان کے مذہبی خیالات کی بنیاد پڑی۔ مذہبی خیالات میں تقلیدی بندشوں سے بالکل آزادی، مذہب کو رسوم کے بجائے اصولی بنیادوں پر دیکھنا اور پرکھنا اور سمجھنا اور زمانے کے تقاضوں کے تحت نئے اصولوں کی روشنی میں اس کی تشریح کرنا، مذہب کی بنیادی چیزوں پر زور دینا اور فروعی چیزوں میں تقلید رسمی سے گریز۔ نیز مذہب سے خصوصی لگاؤ اور محبت یہ سب باتیں شاہ ولی اللہ کی تحریک سے متعلق ہیں۔ شاہ عبد العزیز کی تحریریں اور شاہ مخصوص اللہ کی تعلیم کا اثر سر سید کے مذہبی رجحانات کا جزو خاص ہیں۔ اسی رجحان کے باعث سر سید نے خود نئے علم الکلام کی بنیاد ڈالی اور زمانے کے تقاضوں کے تحت نئے اصولوں کے ذریعے مذہب کی تشریح و توضیح کی۔ اس میں ان سے جو غلطیاں بھی ہوئی ہوں اس میں شک نہیں کہ وہ بحیثیت ایک بہی خواہ، اسلام کی سچی محبت کے ساتھ ہی نہایت خلوص اور سچائی سے اپنے نظریات کی تشریح کرتے رہے۔ خود سر سید کے والد نہایت صوفی منش بزرگ تھے اور ان کے والدین حضرت شاہ غلام علی سے مرید تھے۔ بچپن میں خانقاہ کی آمد و رفت اور بزرگوں کی محبت نے ان کے دل میں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا کر دیا تھا۔

تیسری چیز یہ کہ سر سید نے خالص قدیم ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن اچھی پرورش اور عمدہ تربیت کے باعث اس کی خوبیاں ان کے مزاج و عادات میں جذب

۱۔ حیات جاوید دوسرا حصہ ص ۱۰ (پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

حیات سر سید از نور الرحمن ص ۲۷

ہو کر ان کے کردار کا جز بن گئیں۔ اس کی خامیوں سے وہ اپنا دامن بچا گئے۔ اور اس کی برائیوں کا ان کے مزاج و خیالات پر کوئی اثر نہ ہو سکا۔ سرسید نے رواداری، سچائی، خلوص، مذہب کی پختگی اور محبت، باکمالان فن کی قدر و منزلت اور ان کا خاص احترام پورے طور پر سیکھا۔ اور بقول مصنف حیات سرسید احمد "عالی ہمتی اور مستقل مزاجی ان کو اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی تھی"۔[۱] انھوں نے حالات و حادثات کے دو رنگی امتزاج کا وہ زمانہ پایا جو قدیم و جدید میں حد فاصل بن رہا تھا۔ تمام پرانی قدریں مردہ و بے جان ماحول اور بے لبسی کا مظہر بنتی جاتی تھیں نئی قدریں اپنا اثر جما رہی تھیں جس سے بے چینی اور کشمکش کا سلسلہ جاری تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی حکمرانوں کا کوئی مرکزی اقتدار اعلیٰ باقی نہیں تھا۔ مغل حکمرانوں کا ادب و لحاظ ملکی شرافت اور قدیم عظمت کی ایک روایت رہ گیا تھا۔ جاگیردار، نواب، راجے اپنے اپنے اقتدار اعلیٰ کے خواب دیکھا کرتے اور جب موقع ملتا وہ آزاد حکمران بن جاتا۔ یہ نو دولتئے حکمران اور انکے حاشیہ بردار شاہانہ عیش و آرام راگ رنگ اور لذت و سرور کی زندگی کو ہمیشہ بنظر تحسین دیکھتے اور حرص و آز کے ساتھ اس کی تقلید کرتے۔ لہذا جاگیردارانہ دور کی ہلاکت کے یہ جراثیم نوابوں اور راجاؤں کے ذریعے ملک میں پھیل گئے تھے۔ امراء کی تعیش پسندی کا تمام ساز و سامان قرضوں کے بوجھ اور مزدوروں کی زبوں حالی سے فراہم ہوتا تھا۔ اہل حرفہ اور نوکری پیشہ تنخواہوں کی عدم وصولی اور مناسب قیمتوں کے حاصل کرنے میں بہت مایوس اور بد دل ہوتے جاتے تھے۔ جب کہ کمپنی بہادر کے ملازمین تیزی سے معاشی استحکام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف شاہی نظام کے اقتصادی ڈھانچہ میں ایسی گنجائش تھی کہ ہر خوشحال گھرانے سے غریب طبقہ کی کافی تعداد پرورش پاتی تھی۔ مگر جاگیرداروں کی تباہ حالی کے ساتھ ان کے یہ طفیلی اضطراب کی لہر بن کر ملک میں پھیلتے گئے۔ انگریز بازی گر ہندوستانی امراء کے لہو و لعب، عیش و عشرت، خود آزاری و نفس پروری کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اور ان کی اس غفلت کو تفرقہ اندازی اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس طرح دولت و حکومت کی باگ اقتدار اعلیٰ بن کر ان کے ہاتھ میں آتی جاتی تھی۔

۱۔ حیات سرسید احمد۔ عربی سے ترجمہ از محمد فاروق۔ ص ٦
(ایک عیسائی مصری عالم کی تصنیف)

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے عام مسلمان صرف تقلیدی و رسمی چیزوں کو اس کی بنیاد سمجھتے تھے اس کے مقابلے میں ولی اللٰہی تحریک پورا کام کر رہی تھی جس نے وقت کے ہر مرض کا علاج مذہبی دائرے میں کرنا شروع کر دیا تھا اور عملی طور پر خانقاہوں اور مدرسوں کو مرکز بنایا تھا۔ جہاں بر سر اقتدار امراء کے لئے کوئی خاص کشش نہ تھی۔ علماء صلحاء والہانہ طور پر اس کے مجاہدانہ پروگرام کے سچے شریک کار تھے۔ عوام صرف مذہبی جذباتیت کے طور پر ان کا ساتھ دے دیتے تھے۔ علاوہ ازیں واقف علم و مذہب شرفاء ان کی تعلیم کے اثر سے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس تحریک کی بنیادی روایات کے حامی تھے۔ سرسید کا گھرانہ بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ ولی اللٰہی تحریک کا اثر ان کے آبا و اجداد پر ایسا تھا کہ طبقہ امراء کی عام روش سے کم و بیش ان کا گھرانہ محفوظ تھا۔ دوسری طرف سرسید کے ننھیالی خاندان میں کمپنی بہادر سے خاص تعلقات تھے۔ ان کے نانا بڑے عہدوں پر فائز کئے جا چکے تھے اور بڑے بڑے حاکموں سے رابطہ اور ملنا جلنا رہتا تھا۔ اس لئے مغربی معاشرت کا قریب سے مطالعہ کرنے کا بچپن میں ہی ان کو موقع ملا اور وہ تحریک ولی اللٰہی کے اثرات کے باوجود انگریزوں کی نفرت سے محفوظ تھے۔ کیوں کہ ہندوستانی معاشرہ کی تمام خرابیاں اور انگریزوں کے علوم اور ان کی خوبیاں متوازی طور پر ان کے سامنے تھیں۔

اس صورت حال میں پیدا ہونا اور پرورش پانا سرسید کے لئے غیر معمولی انعام ثابت ہوا۔ ایسے نادر مواقع اس وقت کم لوگوں کو میسر تھے جن سے انھوں نے بچپن ہی سے کافی فائدہ اٹھایا اور تنگ نظری کی جگہ ابتدا ہی میں وسعت اخلاق نے لے لی۔ چنانچہ قلعہ معلی کی قربت سے انھیں لالچ کے بجائے عبرت ہوئی اور کاہلی اور بیکاری کی اس زندگی کا ردعمل انھیں ہمہ تن جہد و عمل میں مصروف کر گیا۔ غدر کے پہلے کا سارا وقت انھوں نے غیر شعوری طور پر آئندہ زندگی میں انجام پانے والے کاموں کی تیاری اور تربیت میں صرف کیا۔ جن تجربات علوم، احساس، خیال اور شعور نے ان سے اپنی پس ماندہ قوم کی اصلاح و تعمیر کا کام لیا وہ سب غور سے دیکھا جائے تو انھیں اس ابتدائی دور میں بھی حاصل ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے تجربات اور حالات زمانہ کی بنا پر اصول اخذ کئے۔ ان حالات میں ان کے اصولوں کی تشکیل زیادہ وضاحت سے ہوئی اور ارادوں کی تکمیل زیادہ کھلے طور پر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آخر کار آئندہ چل کر ایک مفکر و مدبر اور علم و ادب کے سرپرست بن کر سرسید سامنے آئے اور مخالفت

کے تند و تیز طوفانوں کا مقابلہ کیا۔

اس پورے دور میں ان کے بچپن کا زمانہ چھوڑ کر نوجوانی اور ابتدائی زمانہ ملازمت میں بھی غدر کے پہلے تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ اور نہ سرسید کی شخصیت اس وقت تک ایک بڑی ہستی کی حیثیت سے اجاگر ہوئی تھی۔ ابتدائی زمانہ "ملازمت میں سرسید صرف اونچے اور معزز خاندان کے ایک شریف ملازمت پیشہ فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرکاری ملازمت میں ان کی محنت اور لیاقت سے افسران خوش تھے، کیونکہ وہ اپنے فرائض منصبی نہایت ایمانداری، سچائی اور محنت سے بجا لاتے تھے۔ وہ قدیم ماحول کے پروردہ تھے اور سچائی، صاف گوئی، رواداری، محبت اور مذہبی پختگی وہ صفات تھیں، جو اس ماحول سے ان کی عادات و مزاج کا جز بن چکی تھیں۔ مگر اس پختگی میں رواجی اور رسمی چیزوں کو دخل نہ تھا۔ بلکہ شاہ مخصوص اللہ کی تعلیم اور والدہ کے اثر سے ان کا رجحان مذہب کی اصل بنیاد اور روح پر تھا۔ سرسید کی زندگی کے اس اولین دور کی اہمیت اس ماحول میں مضمر ہے جس میں پرورش پاکر سرسید کی عظیم اور اعلیٰ شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ گو وہ دور زوال پذیر تھا پھر بھی شاہ ولی اللہ کی اجتہادی سرگرمیوں کا اثر فقہا، علماء و صلحاء کی صحبت اور نہایت اعلیٰ صلاحیت اور سوجھ بوجھ رکھنے والی والدہ کی تربیت یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے مل کر ان میں ذہن کی وسعت نظر کی گہرائی سنجیدگی طبع اور ذوق علم و ادب کے ساتھ ذوق عمل بھی پیدا کر دیا۔ لہذا اس منتشر اور زوال یافتہ معاشرہ کے مابین بھی ان کا ذہن غفلت کے بجائے بیداری اور غور و خوض کی طرف مائل ہوا۔ اس طرح ان کی شخصیت کی تعمیر اسی سطح پر ہوئی جو عام لحاظ سے غیر معمولی تھی۔" یہی وجہ ہے کہ سرسید کا ذہن عام سطح سے بلند اور ان کے افکار وسیع اور گہرے تھے وہ اپنے تمام اعمال و افکار میں ہمیشہ اپنے ماحول سے اونچے اور اپنے زمانے سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی ذاتی صفات اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اجاگر ہوتی ہیں۔

بے غرضی اور دیانت داری ان کا خاص طریقۂ کار رہیں۔ ابتدائے ملازمت سے لیکر تمام خدمات قومی آخر تک انھوں نے نہایت دیانت اور بے غرضی سے انجام دیں اور کبھی کوئی ذاتی غرض یا نفع پیش نظر نہ رکھا جس کا سب کو اعتراف ہے۔ ۱۸۶۹ء میں جب انھیں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا۔ اس وقت مسٹر کینیڈی Kennedy کلکٹر علیگڑھ

نے کہا تھا "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا مگر ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی" ۱ سرسید کی بے خوفی اور دیانتداری کا یہ عالم تھا کہ ابتدائے ملازمت میں غدر کے پہلے بھی نہ تو کسی انگریز حاکم کی سفارش سے اور نہ کسی عزیز و اقارب کے سبب کبھی کوئی رو رعایت کرتے تھے۔ حالی رقم طراز ہیں کہ دو جاگیردار بھائیوں میں جاگیر کے متعلق سخت جھگڑا تھا ان میں سے ایک سرسید کا بہت دوست تھا اس وقت جان پاٹن گبنس John Potten Gibbens دلی کے جج تھے جن کے رعب و طنطنے کے سامنے کسی کو چوں کرنے کی مجال نہ ہوتی تھی۔ سرسید ان کے تحت منصف تھے۔ انھوں نے فریق مخالف کے کہنے پر سرسید کو منع کیا اور کہا کہ اپنے دوست سے اس وقت تک ملنا چھوڑ دیں جب تک فیصلہ نہ ہو جائے۔ سرسید نے نہایت صاف گوئی سے کہہ دیا کہ سرکاری معاملات میں آپ کا ماتحت ہوں جو ہدایت دیں اس کی تعمیل کر سکتا ہوں مگر میرے ذاتی معاملات میں آپ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں"۔ ۲

سچائی کی صفت تو ان کی سرشت بن چکی تھی۔ وہ جس چیز کو سچ سمجھتے اس کے اظہار میں ذرا بھی نہ جھجکتے تھے۔ ضمیر کے خلاف کسی وجہ سے بھی حق اور سچائی سے گریز تو درکنار ایسے موقع پر خاموش بھی رہنا خلاف ایمانداری سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں۔ "میری نصیحت یہ ہے کہ ہر کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو تمہارا دل اس کو سچ جانتا ہے یا نہیں، اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کیا"۔ ۳ چنانچہ ان کی ساری زندگی میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ جس چیز کو انھوں نے سچ سمجھا نہایت صاف گوئی سے اس کا اظہار کیا اور نہایت خلوص سے اس کے لئے کوشاں ہوئے۔ وہ اس سلسلے میں کسی مخالفت کی پروا نہ کرتے تھے۔ ایچ۔ جی۔ الینس H. G. Allens لکھتے ہیں" سرسید کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ان کی

۱۔ حیات جاوید ص ۲۲۷ حصہ دوم طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۲۔ حیات جاوید ص ۲۲۹ (حصہ دوم طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۳۔ علی گڑھ تحریک ۲۰۶

مکمل بے خوفی ہے ان کی صاف گوئی بعض اوقات تشویشناک ہو جاتی تھی۔ ان کا مخاطب خواہ وائسرائے ہو یا کوئی مغلوب الغضب ملّا، عیسائی مشنری یا اخباری نمائندہ، وہ وہی کہتے تھے جو واقعی ان کے دل میں ہوتا تھا۔"۱ چنانچہ مذہبی معاملات میں جب ان کی اجتہادی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو نہ کبھی فتوائے کفر کی پرواہ کی نہ کسی بڑے عالم یا مولوی سے مرعوب ہوئے نہ لوگوں کے طعن وتشنہ سے ڈرے اور نہ شدید مخالفت سے گھبرائے بلکہ نہایت خلوص اور صاف گوئی سے ہمیشہ وہی کہتے کرتے اور لکھتے رہے جس کو وہ سچ جانتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی بات کے وزن کو سنجیدگی کے ساتھ اصول وحقیقت کی بنا پر دلائل وبراہین سے ثابت کرتے۔ علم وعقل کی روشنی میں اس کی تشریح کرنے کی کوشش کرتے۔ دیگر تمام معاملات میں بھی ان کا یہی حال تھا۔

صبر وتحمل بڑی شخصیتوں کا خاص وصف ہوتا ہے جو سرسید میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اپنی تمام اصلاح وترقی کی سرگرمیوں میں تقریباً چالیس سال تک انھوں نے جس استقلال اور صبر وتحمل سے کام لیا وہ اپنی کہانی آپ ہے۔ مذہبی مباحث میں سرسید پر جو دشنام طرازیاں ہوئی اس کی کوئی حد نہ تھی۔ اصلاحی کاوشوں میں ان کی شدید مخالفت کی گئی۔ تعلیمی سرگرمیوں میں شبہے کیئے گئے مگر وہ رہے استقلال کہ ہمیشہ صبر وتحمل سے کام لیتے انہوں نے کسی کی ذات اور شخصیت پر حملے نہیں کیئے بلکہ ہمیشہ اصول ونظریات سے بحث کرتے وہ بھی دلائل اور براہین کے ساتھ۔ ایک بار محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

"لوگوں نے مجھ کو برا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آگیا معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہوگا مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے میں ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے گا جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔"۲

بے تعصبی اور رواداری سرسید کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ چنانچہ آج سے سو سال قبل جب مذہبی رسوم میں کسی قسم کی نئی روش مذہب کے خلاف سمجھی جاتی تھی سرسید نے

۱۔ بحوالہ تذکرۂ سرسید از محمد امین زبیری ص ۴۴ - ۴۰۳

۲۔ بحوالہ علیگڑھ تحریک خط مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۷۰ء از لندن ص ۶۰۱

اپنے پوتے راس مسعود کی بسم اللہ کسی مولوی کے بجائے ان کو راجہ جے کشن داس کی گود میں بٹھا کر کرائی جو سرسید کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ سید مسعود کا نام رکھا تو اپنے دوست مسٹر داس کے نام پر ان کے نام میں داس شامل کر دیا۔ چنانچہ وہ آخر عمر تک راس مسعود کہلائے۔ علی گڑھ کالج قائم کیا تو مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے برابر سے تعلیم کا انتظام کیا اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے شعبہ قائم کیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تو اس کے لکچروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی مسائل پر برابر سے اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ اور مباحثے ہوتے تھے۔ اس کے ممبروں میں ہندو مسلمان عیسائی سب شریک تھے وطن دوستی ان کی زندگی کا اہم جزو رہی۔ جو ان کی عملی سرگرمیوں کے علاوہ تحریروں اور تقریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں

"حال کی پارلیمنٹ میں جو بل مزید اقتدار گورنر جنرل ہندوستان پاس ہوا ہے . . . . .
حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے ہے۔" ۱

ایک اور موقع پر محسن الملک کو انگلستان سے لکھتے ہیں: "یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزل موجودہ ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کو ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔" ۲

سرسید کی شخصیت کے اس سنجیدہ کردار کے ساتھ ہمیں ان کی طبیعت میں شوخی و لطافت بھی ملتی ہے۔ جس کے باعث ان کی ذات سنجیدہ ہی نہیں بلکہ دل چسپ اور پرکشش بن جاتی ہے۔ ان کی شوخیٔ طبع اکثر اوقات دلچسپ مزاح پیدا کر دیتی تھی۔ علاوہ ازیں سرسید کی تحریریں سنجیدگی اور وزن کے ساتھ لطافت اور شوخیٔ طبع کا بھی اکثر مظاہرہ کرتی ہیں۔ ایک بار ریل کے سفر میں ایک پادری سرسید کا ہم سفر تھا جس نے سنا تھا کہ سرسید بے دین ہیں۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ سرسید یہی ہیں تو ان کو قائل کرنے کے لئے خدا کا ذکر چھیڑ دیا۔ سرسید بحث سے گریز کرنا چاہتے تھے اس لئے نہایت معصومانہ

۱۔ مکتوبات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ص ۶۴

۲۔ [illegible]

کہا کہ میں انھیں نہیں جانتا۔ پادری نہایت حیرت سے بولا کیا آپ خدا کو نہیں جانتے تو سرسید نے پوچھا آپ فلاں شخص کو جانتے ہیں پادری کی نفی پر کہنے لگے تو بھلا آپ خود بتائیں جس سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ جس نے کبھی مجھے بلایا ہو اسے میں کیونکر جان سکتا ہوں۔ پادری نہایت کراہت کے ساتھ خاموش ہو گیا اور علیگڈھ میں سرسید کے ایک انگریز دوست کے یہاں ٹھہرا۔ اتفاق سے اسکی موجودگی میں سرسید اپنے دوست سے ملنے گئے اور نہایت بے تکلفی سے دوستانہ گفتگو ہوتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد پادری نے میزبان سے کہا کہ یہ شخص تو بڑا بے دین اور کافر ہے جو کہتا ہے کہ خدا کو نہیں جانتا۔ ایک بار کسی شخص نے بے روزگاری کی شکایت کرتے ہوئے اس سلسلے میں کوئی سفارش چاہی۔ سرسید نے جواب میں لکھا کہ میری تفسیر کا رد لکھ کر شائع کر دو۔ انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ سرسید کی ذاتی خصوصیات ہی نے ان کی شخصیت کو لائق تحسین بنایا۔ یہی صفات تھیں جو ان کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا سبب بنیں جس شخص میں سچائی اور بے خوفی، صبر و تحمل، ہمت و استقلال، قومی ہمدردی و وطن دوستی، بے تعصبی و رواداری اس درجہ موجود ہو اس کے خلوص جذبہ، نیک نیتی اور سچائی پہ کسے شبہہ ہو سکتا ہے بلکہ اصولی و نظریاتی اختلافات کے باوجود لوگوں کی نظر میں ایسی شخصیتیں لائق قدر و عزت ہوتی ہیں اور کسی فرد کے کردار کو اس کی شخصیت کے آئینے میں دیکھنے سے اس کے رجحانات کا صحیح اندازہ اور اس کی کاوشوں کی اہمیت معلوم کی جا سکتی ہے۔" سرسید کی بلند شخصیت ان کے افکار و کردار میں نمایاں نظر آتی ہے نیز ان کی تمام تحریروں اور تقریروں میں صاف جھلکتی ہے۔ سرسید کی زندگی سراسر عمل و کردار تھی اور یہی چیز ان کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں ہے اور جب عمل و اخلاق سے ان کے اخلاق و عادات کا موازنہ کرتے ہیں تو ان کے حسن و شرافت کا وزن معلوم ہوتا ہے۔"[۱] یہاں پر اس تفصیل سے یہی منشاء ہے کہ آئندہ اسی عکس میں ان کے اعمال و افکار کی صحیح اہمیت معلوم کی جا سکے۔ گو یہ دعویٰ ٹھیک نہیں کہ سرسید کے

۱۔ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۹۲

عمل اور کردار میں کوئی خطا نہ تھی مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی خطا تھی تو وہ بھی ان کی نیک نیتی پر مبنی تھی۔"[۱] ان کا رجحان اجتہادی تھا اور بحیثیت انسان اس راہ میں خطا بھی ہو سکتی ہے پھر بھی ان کے اعمال و کردار کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نیک نیتی، خلوص جذبہ سے پر ہوتے تھے۔

سرسید علم و ادب سے خاص شوق و شغف رکھتے تھے۔ انھیں مطالعہ سے خاص لگاؤ تھا اور اپنے شوق مطالعہ کے باعث اعلیٰ ادبی ذوق پیدا کر لیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز سے خاندانی تعلق اور لگاؤ کے باعث علمی و تحقیقی اثرات گہرے ہوئے۔ علاوہ ازیں آزردہ، صہبائی، غالب اور شیفتہ جیسی قابل ادبی شخصیتوں کی صحبت نے اس ذوق کو اور بھی جلا دی جس سے ان کی ادبی صلاحیتوں کے جوہر اور نکھر آئے۔ تصنیف و تالیف کا شغل اسی ذوق علمی کے باعث ابتدائے ملازمت سے ہی شروع ہو گیا جو آخر دم تک ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سرسید کی تعلیم قدیم طرز میں بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی۔ نئے تعلیمی اداروں اور نئی تعلیم سے بھی ان کو اپنی کم سنی میں کوئی واسطہ نہ رہا۔ اگر انھیں پرانے دستور کے مطابق رواجی ڈھنگ کی تعلیم ملی ہوتی تو ان میں وہی مولویانہ رنگ آجاتا جو تقلیدی اور رواجی تھا۔ انگریزوں کی ملازمت کے باعث افسران کی قربت سے ان کا ذہن نئی چیزیں قبول کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود کوئی عملی راستہ یا کوئی خاص اسکیم پیش نظر نہ تھی۔ بلکہ ایک نئی فہم در پردہ عبرت اور سبق یاس و امید کی مبہم سی ذہنی کشمکش میں اندرونی طور پر جاری تھی۔ دراصل غدر کے عظیم حادثہ نے ہی سرسید میں صاف طور پر وہ لگن پیدا کر دی جس نے انھیں ہمدرد ملک و قوم بنا کر بحیثیت ایک مصلح پیش کیا۔

سرسید کی زندگی کے ابتدائی دور کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے فطری طور پر علمی و ادبی اور سنجیدہ موضوعات پر لکھنے کی صلاحیت اور تصنیف و تالیف کی طرف مستقل رجحان اور شوق رکھتے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں جب وہ آگرہ میں نائب منشی تھے اس وقت انھوں نے ترتیب دفتر کا دستور العمل بنایا اور اسی کے مطابق دفتر کمشنری مرتب کیا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں انھوں نے قانون دیوانی جو منصفی کے متعلق ایک خلاصۂ قوانین

۱۔ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۲۹۲

تھا اس غرض سے مرتب کیا کہ منصفی کے امیدواروں کو اس سے سہولت ہو۔ یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لئے ایسا مفید ثابت ہوا کہ جلد ہی تمام صوبہ میں شایع ہو گیا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں بزبان فارسی جامِ جم تصنیف کی جس سے ان کی تاریخی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں تسہیل فی جر ثقیل جو فارسی کی معیار العقول کا ترجمہ ہے، شایع کی۔ قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین، فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، تحفۂ حسن اور جلاء القلوب یہ سب ابتدائی زمانہ کی تحریریں ہیں۔ دلی کی منصفی کے زمانہ میں سنہ ۱۸۴۹ء میں سر سید نے تصحیح آئینِ اکبری بڑی محنت اور توجہ سے کی۔ اس کتاب سے سر سید کے ٹھوس علمی ذوق و تاریخی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں تاریخ بجنور لکھی۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید لکھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت محنت سے کام کیا۔ جسے سر سید کی پہلی مشہور ادبی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ یہ تحریریں سر سید کے علمی ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی اس زمانے کی تصانیف و تالیفات کچھ مذہبی کچھ قانونی اور کچھ تاریخی و علمی چیزوں پر مشتمل ہیں مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ سب کی سب طرزِ تحریر میں قدیم مگر موضوعات کے لحاظ سے وسیع اور تحقیقی ہیں۔ ان تحریروں کی اہمیت یوں ہے کہ سنجیدہ مزاج و محنت کا خوگر اور تحقیق طلبی و کاوشِ نظری سے کام لینے والا ہے۔ مذہبی نظریات میں تقلید سے آزاد معلوم ہوتا ہے، قانونی نکات کو سمجھتا اور انتظامی کارروائیوں کو بہتر بنانے کی زبردست صلاحیت اور خواہش رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ نہ وہ مصلح تھے نہ خادمِ قوم نہ بلند پایہ مصنف نہ مذہبی عالم مگر زمانۂ قدیم کے عمدہ ماحول کے پروردہ تھے۔ اسی لئے قدیم ماحول کی خوبیاں ہی بیشتر ان کے حصہ میں آئی تھیں۔ حقیقی مذہب سے محبت اور اس کا احترام ان کے دل پر چھایا ہوا تھا۔ پھر بھی کورانہ تقلید جو اس زمانہ کا خاصہ تھی اور بے دلیل پیروی کے مطلق قائل نہ تھے۔ شاہ محمد اسحٰق (شاہ عبد العزیز کے پوتے) سر سید کے استاد تھے چنانچہ ولی اللٰہی تحریک کی اجتہادی روش ان کے مذہبی عقائد کی بنیاد بن گئی اور بڑے بڑے اختلافات کے طوفان سے بھی متزلزل نہ ہو سکی۔ دین سے سچی محبت کے باعث دیگر مصروفیات کے ساتھ ہمیشہ عقائد کی اصلاح اور دین کی خدمت میں لگے رہے۔ سر سید نہایت محنت و مشقت سے کام کرتے اور اپنی ذمہ داریوں سے پوری دلچسپی لیتے تھے۔ جس کام کو شروع کیا اپنی بے پناہ لیاقت ثابت کر دی۔ دنیاوی طاقت سے مرعوب نہ ہوئے۔ بے خوفی صاف گوئی اور خودداری سے ہمیشہ کام لیا۔ محبت، رواداری اور انسانی ہمدردی کو فرض جان کر ملک و قوم کی خدمت کو

مقصد زندگی بنایا۔

سرسید چاہتے تو مغل شاہی دربار میں انھیں درباری عہدے بہ آسانی مل جاتے اور وہ بغیر مشقت جاگیر پر بسر کرتے۔ مگر وہ مشرق کی اس مٹتی ہوئی تصویر کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے جو آئندہ ہمارے صفحۂ تاریخ سے مٹنے والی تھی۔ وہ چاہتے تو انگریز حکام کی خوشنودی خاص شخصی مفاد کے لئے بہ آسانی حاصل کر سکتے تھے اور اسے اپنی شخصی مطلب برآری اور عیش و آرام کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں بھی ایسا نہ کیا اور غدر کے بعد تو اپنے فکر و عمل کا سارا زور اپنے عہدے اور شخصیت کے تمام فوائد عام مقاصد کے لئے استعمال کئے۔ یہ پورا دور یعنی انیسویں صدی کا نصف اول ایک خاموش کشمکش کا مرکز بن کر تاریخ کے نہایت ہنگامہ آفریں دور کی پیشوائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ قدیم و جدید کی ٹکر، تقلید و عقلیت کی رسہ کشی، حرکت و جمود، مایوسی و اضطراب کا اضافہ کر کے نئے سماج کی تشکیل کا پیش خیمہ اور قدیم قدروں کی حسرتوں کا مزار بن رہی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ قدیم تیزی سے ماضی میں گم ہو رہا تھا۔ مگر مستقبل ابھی بالکل دھندلکے میں تھا۔ سرسید زوال کے اسباب کو دیکھتے اور محسوس کرتے تھے مگر اس وقت تک ان کے سامنے مستقبل کی کوئی نمایاں تصویر نہ تھی جس کو غدر ۱۸۵۷ء نے نمایاں کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مصلحانہ عملی کارروائیوں کا کوئی خاکہ سرسید کے یہاں اس وقت تک نہیں ملتا۔ غدر نے ان کے جذبات و خیالات کو حرکت دینے میں بجلی کا کام کیا۔ ان کے ابتدائی زندگی کے عادات و مزاج، علمی ذوق، اور جدید طرز فکر ہی دراصل ان کی آئندہ زندگی کا بنیادی جز نظر آتے ہیں۔

باب چہارم

سرسید ۱۸۵۷ء کے بعد۔ دورِ تکمیل

۱۸۵۷ء کے بعد سے سرسید کی زندگی میں (جو ابھی صرف سید احمد خاں تھے) ایسی انقلاب انگیز تبدیلیاں آئیں جن کا تجزیہ ہی ان کی اہمیت اور عظمت کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کرے گا۔ اس لئے اب کسی قدر تفصیل سے ان کی زندگی، خدمات، خیالات و افکار اور ان کی تمام علمی کاوشوں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ دور جو غدر کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے ان کی زندگی کا ہی نہیں ہندوستانی تاریخ کا اہم ترین موڑ ہے۔ تاریخی کشمکش جو اٹھارہویں صدی سے جاری تھی۔ اب ایک اہم اور فیصلہ کن منزل پر پہنچ چکی تھی۔ جیسے جیسے ہندوستان سیاسی طور پر انگریزی اقتدار کے چنگل میں آتا گیا تمام ملک میں ایک عام سوشل، اقتصادی اور سیاسی کشمکش کے ساتھ بے چینی پھیلتی گئی۔ آخر کار یہ چنگاریاں ۱۸۵۷ء میں آگ بن کر بھڑک اٹھیں۔ اس عظیم بغاوت میں بلا لحاظ مذہب ہر فرقہ کے لوگ شامل تھے۔ علماء، ہندو، مسلم ریاستیں، انگریزی سرکار کے دیسی سپاہی مرد اور عورتیں سبھوں نے اپنے اپنے طور پر اس میں حصہ لیا۔ مگر انجام کار خون کی ندیاں بہا کر بے شمار جانیں نثار کر کے اور ہر طرح کی قربانی دے کر حکومت انگلشیہ کے ظلم و تشدد کے شکار بنے، تختۂ دار پہ چڑھائے گئے، در بدر کی ٹھوکریں کھائیں، گھر بار لٹے، ملک بدر کئے گئے، قید و بند کی اذیت ناک سزائیں برداشت کیں اور آخر کار

مکمل غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے۔ وقت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ یہی نہیں قدیم و جدید قدروں کی کشمکش جاگیردارانہ نظام کی مٹتی ہوئی قدروں اور سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے تسلط کے ساتھ جو پوری ایک صدی سے بہت تیزی کے ساتھ جاری تھی غدر ۱۸۵۷ء تک ایک ایسی منزل پر جا پہنچی جہاں تاریخ نے قدیم کے خلاف فیصلہ دیا۔ اور ایک بالکل نئے دور کی پیشن گوئی کر دی۔ وہ دور جو تمام قدیم قدروں کو بے بس محض کرتے ہوئے نئے خیالات نئے انداز اور نئے طریقوں کے لشکر لیے امڈا چلا آرہا تھا۔ جو اس کی پیشوائی کے لئے لبیک کہتا تھا وہی ترقی کے زینوں پر ہوتا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی دردناک حالت کسی بھی حساس دل پر اثر کرنے کے لئے کم نہ تھی۔ خاص کر مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایک طرف ان کا تمام دولت مند اور تعلیم یافتہ طبقہ جو علماء اور جاگیرداروں اور نوابوں پر مشتمل تھا، انگریزی حکومت کا شکار خاص بن کر مٹ چکا تھا۔ (نوٹ)۔۱ دوسری طرف عام مسلمانوں میں جہالت، مفلسی اور بربادی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ تیسرے حکومت کا عتاب خصوصی طور پر مسلمانوں کی طرف اس لئے تھا کہ حکومت براہ راست انھیں سے چھینی گئی تھی۔ اس کے برعکس شمالی مشرقی و دکنی ساحلی علاقوں کے نئے متوسط طبقہ کی ترقی انگریزی تعلیم اور مغربی طریقوں سے آشنائی نیز سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادوں پر منحصر تھی۔ مسلمان اس طبقہ میں کہیں بھی شامل نہ تھے۔ غدر کے بعد اب جو کچھ سکت نظر آتی تھی وہ اس نئے طبقے میں جو سرمایہ دارانہ نظام کے زیر اثر مغربی تعلیم اور نئے اقتصادی طریقوں سے آشنا ہو کر دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ غدر ۱۸۵۷ء جہاں ہندوستان کی تاریخ کا دردناک افسانہ ہے وہیں ہماری سماجی تاریخ میں اس دور کا آغاز بھی جب کہ ہندوستان کی تاریخ ہر حیثیت سے نیا جامہ پہن رہی تھی۔

مسلمان اس وقت بری طرح ٹھوکر کھا کر اندھیرے کوئیں میں جا گرے تھے اور ان کا حال تاریک اور مستقبل نظروں سے اوجھل تھا۔ سر سید نے غدر کی دردناکیوں اور ان تمام نا انصافیوں کو اس کے قلب میں رہ کر قریب سے اور بہت غور سے دیکھا تھا۔

۱۔ نوٹ:۔ تفصیل کے لئے دیکھیں انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ از عبداللہ یوسف علی۔

وہ نہایت حساس دل رکھتے تھے چنانچہ ملک وقوم کی اس بربادی پر تڑپ اٹھے۔ مگر اس پر آشوب زمانے میں جس محنت اور ذہن کی رسائی سے انھوں نے کام لیا وہ لائق تحسین ہے ان کے اندر ایک مصلح اور مفکر بیدار ہوگیا اور وہ قوم کے مرثیہ خواں ہونے کے بجائے اس کی راہبری کے لئے تیار ہوگئے۔ انھوں نے قوم کو بربادی کے غار سے نکالنے کا پختہ عزم کر لیا۔ مسلمانوں کی اس بربادی کی بنیادی وجوہات پر غور وخوض کیا اور اس عظیم تباہی کی بنیادوں کو سمجھتے ہوئے ملک وقوم کی ترقی کے لئے عملی قدم اٹھانا شروع کیا۔ یہیں سے سرسید کی زندگی کا وہ اہم دور شروع ہوتا ہے جبکہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حد سے بڑھی ہوئی جہالت نے لوگوں میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو مفقود کر دیا ہے جو قدیم طرز تعلیم رائج ہے۔ وہ نئے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس میں مکمل جمود آچکا ہے۔ سرسید نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اگر زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دیا گیا تو ہم معدوم ہو جائیں گے۔

یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا!
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

چنانچہ سرسید نے اصلاح کا پکا عزم کر لیا۔ انھوں نے اس مایوسی کو جس نے وقتی طور پر انھیں ہجرت کرنے کا خیال دلایا تھا، خیرباد کہہ کر امید کو اپنا مشعل راہ اور عزم کو اپنا منتہائے نظر بنایا اور خدمت واصلاح کے میدان میں اتر آئے۔ چنانچہ خود ان کے احساسات خیالات وعزم اور ارادے کی پوری تصویر اس تحریر میں نظر آتی ہے۔

"قوم کیا دنیا کی باتوں کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ ادھر کی چیزیں تو درکنار وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں پڑی تھی۔ پھر میرا دل آخر دل ہی تھا پتھر نہ تھا جو نہ پگھلتا۔ ایک مدت تک اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجئے آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کچھ کرنا بہتر ہے کرو جو کچھ کر سکو ہو یا نہ ہو۔ اس بات پر دل ٹھہرا۔ ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ نہ جب معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے مگر قوم کی طرف کا بدلہ اس وقت سے معلوم تھا جو اب ظاہر ہے۔ کافر، ملحد، زندیق، اسلام کا دشمن، مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو، دین و دنیا سے آزاد کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا۔ مگر شکر ہے کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا۔ اور ہمیشہ ہمارے دل میں یہی آیا کہ اے خدا

ان پر رحم کر کیونکہ یہ نہیں جانتے ۔"۱ اس وقت ان کے سامنے ایک طرف قدیم قدروں کی مٹتی ہوئی عظمت گویا صحبت شب کی شمع خاموش تھی تو دوسری طرف نئی قدروں کا بڑھتا ہوا تقاضہ دعوت فکر و عمل تھا۔ سرسید کی مصلحانہ کاوشوں کی وسعت ہماری سماجی و قومی زندگی کے ہر پہلو سے ٹکراتی تھی۔

سرسید کے پیش نظر ایک زبردست اور لق ودق اصلاحی میدان تھا جس کی حدود نظروں سے اوجھل تھیں۔ ایک طرف سماج کی دکھتی رگوں کو چھیڑنا اور اس کی قدیم بنیادوں کو ہلا دینا لازمی تھا۔ دوسری طرف نئی قدروں سے آشنا کرنا اور انھیں نئے سماج کی تعمیر میں شامل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ملکی اور قومی تہذیب کے شاندار ماضی کے ساتھ نئی مغربی تہذیب کے صحت مند عناصر کو ملانا اور قدیم تہذیب کی کھوکھلی اور بے جان روایتوں کو فوری طور پر مٹانا، مسلسل معرکۂ جنگ کو آواز دینا تھا۔ تمام غلط عقائد کے غلط اجزاء کی نشان دہی (خاص طور سے وہ جو مذہب کا جز بنائے جا چکے تھے۔) گویا بارود میں آگ لگانا تھا۔ سماجی اور اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لئے انگریزی تعلیم و تہذیب کو اختیار کرنے کی تلقین نیز نئی مغربی قدروں کو اپنانے اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے پر اصرار گویا ہنگامۂ طوفان بپا کرنا تھا۔ عام جہالت اور مغربی تعلیم سے ناآشنائی کے پیش نظر نئی مغربی تعلیم اور سائنس کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنا جس کے لئے انگریزی زبان سے واقفیت کی کوشش لازمی تھی۔ بعض مسلمانوں کی نگاہ میں ان کو نیچری اور کرسٹان بنا دیتی تھی۔

مسلمانوں کی ان خصوصی بربادیوں کے علاوہ عام سیاسی ابتری اس درجہ تھی کہ سیاست میں حصہ لینا تو کیا اس وقت اس کا نام لینا بھی جرم تھا۔ ہندوستانیوں کو اس بدتر اور برباد حالت سے نکالنے کے لئے حکومت اور عوام میں رابطہ پیدا کرنا لازمی تھا۔ یہ رابطہ خاص طور پر مصیبت زدہ اور تباہ شدہ مسلم عوام کو حکومت کے ظلم و تشدد کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے اور آئندہ ابھرنے کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ یکہ و تنہا اس عظیم اصلاحی میدان میں آگے بڑھنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ انھوں نے

۱۔ تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۵۷۰ - ۵۷۱

ملک و قوم کے قلب کی دھڑکنوں کو محسوس کیا۔ ان کی نبض ٹٹولی ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ان سب اصلاحات کے لئے کسی بنیادی چیز کو اپنانا ضروری ہے۔ وہ چیز جس میں مرض کی شفا کا تمام تر بجوڑ موجود ہو، چنانچہ کہتے ہیں "قومی ترقی اور قومی عزت حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں۔ اول امن و امان ملک میں دوسرے تعلیم و تربیت قوم میں" ۱ اس طرح ایک طرف سر سید نے حکومت اور عوام میں رابطہ کو اور دوسری طرف تعلیم کو بنیادی طور پر اپنی اصلاح کا مرکز بنایا اور ان بنیادی چیزوں کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

ان کا خیال تھا کہ صرف تعلیمی ترقی ہی قوم کا دماغ روشن کر سکتی ہے اور یہی ہر قوم کی ترقی کا بہترین زینہ ہے۔ ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی صرف اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہمیشہ ذہنی روشنی اور صلاحیت بیدار ہوتی ہے جو زندگی کے میدان میں صحیح رہبری کرتی ہے اور عزت کے لائق بناتی ہے۔ ایسی ترقی یافتہ قوم کبھی محکوم و غلام نہیں رہ سکتی۔ بلکہ آزادی اور عزت خود اس کے قدم چومنے لگتی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر سر سید نے جلد سے جلد اور کم سے کم وقت میں قوم کی اعلیٰ تعلیم کو وقت کا اہم ترین تقاضہ اور قومی ترقی کا بنیادی جز تصور کیا۔ انھوں نے اپنی مصلحانہ کوششوں میں ہر دوسری چیز پر اسے ترجیح دی مگر مشکل یہ تھی کہ ہنگامی حالات کو فرو کئے بغیر اور حکومت کے عتاب کو ٹھنڈا کئے بغیر جس سے ملک میں امن و امان قائم ہونا ممکن نہ تھا۔ عوامی خوف و ہراس دور ہونے کے لئے انگریزوں سے نفرت بھی ختم ہونی ضروری تھی ساتھ ہی نئی سیاست سے آگاہی بھی لازمی تھی۔

چنانچہ سر سید نے سب سے پہلے انھیں خطرناک و دشوار کاموں کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے ۱۸۵۸ء میں اسباب بغاوت ہند لکھی اور پہلی بار سیاست میں دخل کو ہندوستانیوں کا حق بنا کر پیش کیا۔ غدر کے فوراً بعد اس شیدائے قوم و وطن نے اسباب بغاوت ہند میں حکومت پر جیسی بے خوف نکتہ چینی کی اور ہندوستانیوں

۱۔ تہذیب الاخلاق ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ در روداد جلسہ پنجاب بابت خزینۃ البضاعۃ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء (تقریر سر سید احمد خاں)

کے حقوق پیش کئے وہ بے نظیر ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ خود حکام کو ان کی باتوں کی صحت اور وزن کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ مطالبہ اس وقت کتنا جراُت مندانہ تھا کہ "انتظام حکومت میں ہندوستانیوں کی شرکت اور دخل لازمی ہے۔" جو اس وقت کچھ انھیں کی ہمت کا کام تھا۔ دوستوں کے سختی سے منع کرنے کے باوجود انھوں نے اس رسالے کی پانچ سو جلدیں چھپوا کر ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجی ایک اپنے پاس رکھی اور باقی سب انگلینڈ کے ممبران پارلیمنٹ کو بھیج دیں۔

رائے شنکر داس نے جو ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی اور سر سید کے عزیز دوستوں میں سے تھے اور اس وقت مراد آباد میں منصف تھے بہت منع کیا اور کہا کہ ان سب کو جلا ڈالو اور ہرگز اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔" ۱ مگر سر سید نہ مانے۔ چند انگریز حکام اسباب بغاوت ہند دیکھ کر سر سید سے سخت ناراض ہوئے اور انھیں باغی قرار دیا۔ مگر ان کی خدمات غدر کے پیش نظر حکومت نے اسے ان کی نیک نیتی پر محمول کیا۔ ۱۸۸۳ء میں جب جنرل گراہم Genral Graham نے اس کا ترجمہ انگریزی میں شایع کرایا تو ایک تہلکہ ہو گیا۔ تمام اخبارات نے اپنی رائیں دیں۔ چنانچہ ہوم نیوز Home News لکھتا ہے۔" سر سید نے جو غدر کے اسباب تحریر کئے ہیں ان میں بعض بہت قیمتی اور عمل در آمد کے قابل ہیں۔" ۲

سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں۔ خود کانگریس کے بانی ھیوم Hume نے آفتاب احمد خاں سے ان کے انگلستان کے زمانۂ قیام میں کہا "سب سے پہلی چیز جس نے نیشنل کانگریس کی قسم کی تحریک کے جاری کرنے کا خیال میرے دماغ میں پیدا کیا وہ خود سر سید کی کتاب اسباب بغاوت ہند تھی۔" ۳ غدر کو خونیں بغاوت قرار دے کر انگریز حکام جس نفرت و ظلم سے کام لیتے تھے ان کے اس رویہ کو تبدیل کرنے اور ملک و قوم کو مسلسل جور و ستم کا نشانہ بننے سے بچانے

۱۔ حیات جاوید از حالی ص ۶۱ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۲۔ " " " ص ۲۳۶ (" " " ")

۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد منگلوری ص ۵۸۶

کے لئے سر سید نے یہ رسالہ لکھا جو ان کی بے خوفی اور دور اندیشی کی بہترین مثال ہے۔

سر سید نے محسوس کیا کہ غدر ایک ملکی ہنگامہ تھا مگر حکومت انگلشیہ مسلمانوں کو خصوصی مجرم تصور کرتی ہے بلکہ مسلم کا نام ہی سنگین مجرم قرار دئے جانے اور دار پر چڑھائے جانے کے لئے کافی تھا۔ ریکس Rex لکھتا ہے کہ "باغی کا دوسرا نام مسلمان تھا"۱ حتیٰ کہ صرف ڈاڑھی ہی مسلمان اور مجرم ہونے کا کافی ثبوت ہوتی تھی، اچھے یا مشہور مسلم خاندان سے ہونا ہی سازش کے الزام کے لئے کافی تھا۔ لہذا دوران غدر ایسے صدہا واقعات پیش آئے کہ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے سیکڑوں ہزاروں بلا جرم و بلا تقصیر مجرم ثابت کئے اور دار پر چڑھائے گئے۔ غدر کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ جس بے رحمی کا برتاؤ کیا اور جس طرح ان کو کچلا اس کے لئے بعض انگریز مصنفوں نے بھی مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کیا ہے۔ غدر میں ان کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں اور ان کے پورے پورے شہر کے شہر تباہ کر دئے گئے جہاں کوئی چراغ جلانے والا نہ بچا۔ جہاں کہیں مسلمان بچے تو سرکار نے ان کی جائداد قرق کرلی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں کو ۱۸۵۹ء تک دہلی کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ غالب کا بیان ہے کہ صرف پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے تھے جن کو لے کر لوگ اندر داخل ہو سکتے تھے۔ غالب اپنے ایک دوست منشی ہر گوپال کو لکھتے ہیں "مہاجن دہلی میں آ گئے ہیں مگر مسلمانوں میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اتنے زیادہ رشتہ داروں کا قتل ہوا ہے کہ اگر میں مرجاؤں تو شاید میرے واسطے کوئی رونے والا نہ ہوگا"۲ لہذا جب غالب کی پیشی ہوئی تو حاکم کے استفسار پر کہ وہ مسلمان ہیں انہوں نے خود کو آدھا مسلمان اور آدھا کرشان بتایا۔ یہ محض غالب کا ظریفانہ انداز نہ تھا بلکہ جان بخشی کے لئے ان الفاظ کی آڑ میں فریاد تھی۔ غدر کی تفصیلی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدہا جانوں کو موت کی سزا صرف مسلم کے نام پر ملتی تھی۔ چنانچہ ہنگامہ کے بعد یہ عتاب دوسری صورتوں میں مسلم عوام پر جاری رہا۔

سر سید نے حکومت کے اس خصوصی عتاب کو دور کرنا ضروری سمجھا اور اس کیلئے لائل

۱۔ بحوالہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از خورشید مصطفیٰ رضوی ص ۵۳۶

۲۔ سر سید تاریخی و سیاسی آئینے میں از ڈاکٹر شان محمد ص ۲۵

محمڈنز آف انڈیا Loyal Mohammadens of India کے نام سے ولعات لکھنے شروع کئے۔ جس میں ان مسلمانوں کے حالات قلم بند کئے جنھوں نے غدر میں کسی نہ کسی صورت میں انگریزوں کو بچایا تھا یا ان کی مدد کی تھی۔ یہ کام ادھورا رہ گیا کیونکہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس کا حال جتنے صفحے پر ہوگا اتنے صفحات کا خرچ وہ شخص دے گا۔"۱ سرسید کی سیماب صفت شخصیت اتنی ہی بات پر اکتفا بھی کیسے کر سکتی تھی۔ انہوں نے غور و خوض کے ساتھ یہ سوچا کہ مسلمانوں اور حکام میں رابطہ پیدا کرنا اور انس بڑھانا لازمی ہے۔ اس کے لئے اسلام اور عیسائیت میں جو مشابہت ہے اس کو واضح کرکے منظرعام پر لانا ضروری ہے۔ کیونکہ عیسائیوں میں صدیوں سے مسلمانوں بلکہ اسلام کے خلاف غلط خیالات اور نفرت عام تھی۔ اسلام کے نظریات اور حضرت محمدؐ کے متعلق مضحکہ خیز اور توہین آمیز رائیں مشہور تھیں۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمان انگریزوں سے غصہ و نفرت کی بناء پر زیادہ سے زیادہ دور رہنا پسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہر وہ بات جو مغرب سے تعلق رکھتی تھی اور جدید ہوتی تھی خواہ وہ کتنی ہی اچھی اور درست ہو ان کے لئے گناہ کبیرہ کے مترادف تھی۔ اس کے علاوہ وہ پہلے شخص تھے جنھیں مشنریوں کے اسلام پر غلط الزامات کے جواب کا بھی خیال ہوا ورنہ ایسی تحریروں کو چھونا ہی گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ نتیجتاً اسلام کے خلاف غلط بیانیاں یک طرفہ ہوتی رہتی تھیں اور مسلمان اس سے بے خبر رہتے تھے۔

مذہبی عقائد ایسی چیز ہیں کہ اگر ان میں یکسانیت محسوس ہو تو آپس کا اتفاق بڑھتا ہے۔ اس کے پیش نظر سرسید نے غازی پور کے زمانۂ قیام میں تبیین الکلام لکھنا شروع کیا اس کے لئے انہیں بڑی کاوشیں کرنی پڑیں نیز بہت خرچ برداشت کرنا ہوا۔ جب غدر کے بعد بہت سی رکی ہوئی تنخواہ اور گھربار لٹنے کا معاوضہ بیک وقت ملا تو انھوں نے اس مقصد کے لئے بائبل اور دیگر مذاہب کی کتابیں منگوائیں، ایک عربی داں اور ایک انگریزی داں ملازم رکھا، ہزاروں کا پریس رڑکی سے منگوایا۔"۲ عبرانی سیکھنی شروع کی تبیین الکلام میں انھوں نے اسلام اور عیسائیت کے عقائد و بیانات کی مطابقت واضح کی ہے جو ان کے اس

۱۔ حیات جاوید از حالی۔ ص ۶۴ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)۔

۲۔ حیات جاوید ۷۲ تا ۷۹ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)

مقصد کی تکمیل کے لئے یقیناً مفید تھی۔ تبیئن الکلام کے مذہبی اور ادبی فوائد کا ذکر یہاں مقصود نہیں۔ یہ مناسب موقع پر آئے گا۔ اس کام میں چونکہ زر کثیر درکار تھا جس کا سارا بوجھ ان کی ذاتی آمدنی پر تھا نیز اس کے لئے وقت اور محنت کی ضرورت تھی جس کا انحصار سر سید کی شخصی محنت اور کوشش پر تھا۔ لہذا ان کی دوسری بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث یہ کام ادھورا رہ گیا تاہم جتنا لکھا اس کے فوائد بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ لہذا ایسی صورت میں ان کی یہ خدمت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں عیسائیوں سے نفرت کم ہوئی۔ دوسری طرف عیسائیوں میں اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کا نظریہ پیدا ہوا۔ غیر متعصب اذہان اس سے متاثر ہوئے۔ عیسائیوں میں اسلام سے نفرت کے بجائے اسے سمجھنے کی کوشش ہونے لگی۔

سر سید کی عظیم شخصیت کوئی ایک بڑا کام کر لینے پر قناعت نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے عمل کی جولان گاہ بہت وسیع تھی اور وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمیشہ نئے طریقے نکالتے تھے اور نئی راہیں ڈھونڈھتے رہتے تھے۔ وہ مصلح تھے اور جہد مسلسل جہد ان کا پیمانہ نظر تھا۔ انھوں نے حکومت اور عوام میں مفاہمت پیدا کرنے اور ربط بڑھانے کے لئے نیز ہندوستانیوں کو مغربی علوم اور خیالات سے متعارف اور آشنا کرنے کے لئے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس میں ہندو اور مسلمان اور انگریز ممبر برابر کے شریک تھے۔ اس کے جلسوں میں تمدنی، تحقیقی، مغربی علوم اور سائنس وغیرہ کے متعلق مفید لکچرز اور مباحثے ہوتے تھے۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے اس کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا جو بعد کو سوسائٹی کے علی گڈھ منتقل ہونے کے بعد علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے موسوم ہوا۔ سر سید کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ہندوستانیوں کا انگریزوں اور مغرب سے ایسا رابطہ قائم ہو جائے جس سے مغرب و مشرق اور قدیم وجدید کی تاریخی ٹکر ایک مفید اور کارآمد سنگ میل بن جائے۔ انگریزی حکومت اور ہندوستانی عوام ایک دوسرے کو سمجھیں، حکومت عوام کی ضروریات اور حالات سے واقف ہو اور عوام نئے مغربی طرز حکومت نیز دور جدید کے تقاضوں سے آشنا ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے سر سید نے اس سوسائٹی سے پورا کام لیا۔ سوسائٹی میں جن موضوعات پر لکچر ہوتے تھے ان سے جدید خیالات پر روشنی پڑتی تھی۔ علمی مباحثے ہوتے تھے اور ترجمے کی ضرورت

پر اشارے ہوتے تھے۔ اس کے اخبار میں مفید انگریزی علمی مضامین کے تراجم شائع ہوتے تھے۔ دوسرے ممالک کے تذکرے ہوتے تھے اور تبادلہ خیالات کا پورا موقع ملتا تھا۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کے ذریعے سرسید نے جو تعلیمی اور ادبی خدمت انجام دیں، مغربی علوم و سائنس کو دیسی زبان میں تیزی سے منتقل کرنے کی جو کوشش کی اور اس اخبار کے ذریعہ صحافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا اس کا تفصیلی ذکر ان کی تعلیمی اور ادبی خدمات کے سلسلے میں آئے گا۔

سرسید نے اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کی حدیں بہت وسیع تھیں۔ ہماری سماجی زندگی کا کون سا گوشہ تھا جس کی خامیوں کو ان کی دور اندیش نگاہوں نے نہ تاکا ہو اور جس پر ان کی اصلاحی کاوشوں کی شدید ضربیں نہ پڑی ہوں۔ جن کی قدامت اور فرسودگی کی بنیادوں کو انہوں نے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہ کی ہو۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ قدیم اور جدید کی یہ ٹکر اور ہندوستان کی سیاسی شکست محض ایک اتفاقی اور تاریخی حادثہ نہیں ہے بلکہ ہماری سماجی، تمدنی اور عقائد کی خامیوں کا نچوڑ اس میں صاف جھلکتا ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ قدیم خوبیوں کو جدید اقدار میں ضم کر دیا جائے۔ کیونکہ واقعات اور حالات مغرب کی فوقیت کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نئے علوم و سائنس کی روشنی میں مغرب عقلیت پسندی کا علم لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس عقلیت پسندی نے عقائد کی دیواروں کو متزلزل کر دیا تھا جس کی بنیاد یقین اور جذبہ پر ہوتی ہے۔ سائنس کی ترقی نے مادی کامیابیوں کے ساتھ ہر چیز کو عقل کی ترازو میں تولنا اور عقائد سے انکار کی طرف مائل کرنا شروع کیا۔ سائنس کے علمی و عقلی مشاہدات و تجربات کے ساتھ اس سے مرعوبیت بڑھتی جاتی تھی جو انگریزی تعلیم کے ساتھ ناگزیر تھی۔ مذہب پر یہ شکوک عام ہو گئے تھے۔ سرسید ایک خط میں لکھتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ علوم جدیدہ ہندوستان میں اور تمام اسلامی ملکوں میں روز بروز پھیلتے جاویں گے۔ اگر کوئی ہزار تدبیریں ان کے روکنے کی کرنے رک نہیں سکتے۔ اور یہ بھی میں اپنی رائے میں یقینی سمجھتا ہوں کہ جب وہ علوم بخوبی پھیل جاویں گے تو تمام مذاہب کے نیز مذہب اسلام کے سرسبز و شاداب پودے جل کر برباد ہو جاویں گے۔ ان علوم کے سامنے اسی مذہب کا پودا سرسبز و شاداب رہے گا جس نے بخوبی ان علوم کا مقابلہ کیا ہو گا۔ اور یا تو ان علوم

کے مسائل مخالف اسلام کو ڈھادیا ہوگا یا خود اسلام کے مسائل کو ان علوم کے مطابق کر دکھایا ہوگا۔" ۱

اس خطرے کے پیش نظر سرسید نے ایک نیا علم الکلام پیش کر کے جدید مذہبی نقطۂ نظر کی تشکیل کی اور ایک نئے طرز پر اپنی مذہبی خدمات کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کی مذہبی خدمات کا تصور ہی بالکل نئے انداز کا تھا۔ (فٹ نوٹ نمبر ۱) ۲۔ اس وقت تک مذہبی پختگی کا ثبوت یہ سمجھا جاتا تھا کہ کسی نے عظیم الشان مسجد بنوادی یا خانقاہوں میں کسی قسم کی امداد کر دی خواہ یہ امداد کچھ جائداد وقف کر کے ہو یا کسی طالب علم کو دو چار روپیہ ماہانہ دے کر یا کسی طالب علم کا کھانا مقرر کر کے یا یہ کہ کسی نے اپنے بیٹوں کو حافظ قرآن بنادیا یا صوم و صلوٰۃ کی وقتی رواج کے مطابق سختی سے پابندی کے ساتھ زہد اختیار کیا۔ اس کے برعکس سرسید کے یہاں مذہبی خدمات کا تصور بنیادی طور پر نیا تھا۔ انھوں نے دور جدید کے سائنٹیفک رجحان کے لحاظ سے اسلام کی عقلی نظریئے سے تشریح کی اور اس بات کو دلائل و تشریح سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کی تعلیم عقل و سائنس کے خلاف اور ناقابل عمل ہرگز نہیں ہے۔ (نوٹ) ۳ اس طرح اسلام کو عقلی و عملی طور پر قابل قبول بنا کر پیش کیا۔ اور یہی مذہبی خدمت کا وہ نیا تصور تھا جس میں عملی پہلو نمایاں ہے۔

انیسویں صدی میں خاص طور پر غدر کے بعد ہندوستان میں اسلام کو تین خطرے درپیش تھے۔ پہلا خطرہ مشنریوں سے تھا۔ دوسرا یورپ والوں کے ان خیالات سے تھا جنھیں دیکھ کر بقول سرسید "مرجانے کو جی چاہتا ہے۔" یہ لوگ ہمیشہ طرح طرح کے الزامات و اعتراضات سے اسلام کو عقل و اخلاق کا دشمن بتاتے اور انسانی ترقی میں حارج ثابت کرتے تھے مگر ان کے الزامات کی غلطی اور کمزوری کو بتانا تو درکنار مسلمان ایسے اعتراضوں سے کان بند کر لینا ہی مذہب کی محبت

۱۔ تہذیب الاخلاق ۱۵ رجادی الثانی ۱۲۹۰ ہجری جواب خط حافظ علی بخش خاں درعنوان مراسلات۔

۲۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۱ باب چہارم) ص ۲۱۵

۳۔ نوٹ:۔ تفصیل کیلئے دیکھیں Religious Thoughts of Syed Ahmad Khan —By Bashir Ahmad Dhar

اور خیر خواہی سمجھتے تھے۔ تیسرا بڑا خطرہ جو مستقبل قریب میں بڑھتا نظر آرہا تھا وہ نئی تعلیم سے خود مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا تھا۔ جن کا شافی جواب مذہب کی طرف سے نہ پاکر خود جدید تعلیم سے آشنا مسلمان مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔ (نوٹ) ۱ چنانچہ انھیں خطرات کے پیش نظر سرسید اسلام کی خدمت پر کمربستہ ہوئے۔ تقلیدی مذہب کے متعلق محسن الملک کو لکھتے ہیں۔ "اگرچہ تم خفا ہو گئے، ہو لو، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہونچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہونچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے" ۲

غدر کے پہلے ہی مسلمانوں میں سیاسی جمود تو پیدا ہو ہی چکا تھا، تہذیبی حیثیت سے ہر چیز رسم و رواج کی پابندیوں اور روایت پرستی کے خانوں میں بھی بٹ چکی تھی۔ حتی کہ ادب و معاشرت کے ساتھ مذہبی عقائد بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکے تھے۔ لوگوں پر اجتہاد کے دروازے صدیوں پہلے سے بند ہو چکے تھے۔ مروجہ مذہبی عقائد من و عن مذہب کا جز سمجھے جانے لگے تھے۔ جدید علوم و سائنس کی تحصیل سے اس لئے گریز کیا جاتا تھا کہ ان سے مذہبی عقائد خراب ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ اسلام کی کمزوری کا کھلم کھلا اعتراف تھا کہ اس کے پاس ان حقائق کا کوئی جواب نہیں۔ چنانچہ سرسید نے علوم جدیدہ سائنس کی تحقیق اور اسلام کی ان پر تطبیق کو لازمی خیال کیا اور مروجہ مذہبی خیالات کی تصحیح نیز اسلام کے بنیادی اصولوں کی تشریح کا سلسلہ جاری کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کام کیا وہ ان کی مذہبی تصنیفات، مقالوں نیز تفسیر کی صورت میں موجود ہے۔ بائبل کی تفسیر جو تبئین الکلام کے نام سے مشہور ہے رسالہ ابطال غلامی، رسالہ احکام طعام، خطبات احمدیہ نیز ان کے وہ تمام مذہبی مضامین جو وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں ان کے مذہبی خیالات کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن میں ان کی تحقیقی نظر و جدت نمایاں ہے۔ خطبات احمدیہ انھوں نے ولیم william Muir کی کتاب لائف آف محمدؐ میں رسول کریمؐ پر اعتراضات کے جواب میں لکھی۔

۱۔ نوٹ ۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں موج کوثر ص ۱۶۲ تا ۱۶۴

۲۔ "مکتوبات سرسید" مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، مکتوب ۸ راکتوبر ۱۸۹۲ء ص ۱۱۶

اس کے تمام الزامات کو بہ دلائل غلط ثابت کیا۔

اپنی تفسیر القران بھی انھوں نے نئے علم الکلام کی بنیاد ڈال کر نئے نظریات کے پیش نظر لکھنی شروع کی۔ تاکہ دوسرے مذہب والوں کی نظروں میں بھی اسلام کی اکملیت ثابت کریں۔ مسلمانوں کے احساس کمتری کو دور کریں۔ نئے علوم سے فرار کے بجائے اسلام کی افضلیت کے احساس کے ساتھ نیا علمی شعور بیدار ہو اور خود اعتمادی پیدا ہو۔ ساتھ ہی روایتی عقائد کی جڑیں کٹ جائیں۔ ان کے یہ نظریات اور تفسیر کی بنیاد وقت اور ضرورت کے تقاضوں کے تحت صحت مند اجزاء پر مشتمل تھی۔ سرسید کے مذہبی تصور کی بنیاد اور اس کا نچوڑ تو یہ عقیدہ ہے کہ اسلام عین فطرت ہے اور فطرت عین اسلام۔"۱ چنانچہ اپنے مضمون مذہب اور علم میں لکھتے ہیں۔" زمانہ تحقیق اور علم کا ہے اور اس کا اثر روز بروز مذہب پر پڑتا جاتا ہے۔ ایسے نازک زمانے میں جو مذہب کے نادان دوست ہیں وہ صرف افسوس کرنے پر قانع ہیں۔ مگر جو لوگ مذہب کے عاقلانہ حمایت کرنیوالے ہیں وہ مذہب کی بنیاد علم اور فطرت پر قائم اور دینی عقائد کو علم اور فطرت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" ۲

مذہبی خیالات میں اس نئے طرز فکر نے ان کے خلاف شورش کا ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا۔ انھیں نیچری، دہریہ، کافر، زندیق اور کیا کچھ نہ کہا گیا مگر وہ کسی مخالفت اور دشنام طرازی کی پرواہ کئے بغیر اس مقصد کی تکمیل میں انتہائی سرگرمی سے مصروف رہے۔ سرسید کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں تامل نہ کرتے اور نہ کسی مخالفت کی پرواہ کرتے۔ مولوی محمد ابراہیم آروی کو لکھتے ہیں۔" میرے نزدیک علماء کی اصلاح ناممکن نہیں تو قریب قریب ناممکن ہے۔ نفاق ضد اور تفوق ایک دوسرے پر اور بعضوں کا دینداری کو ذریعہ معاش بنانا اور تقلید میں ایسا غلو کرنا کہ شرک فی نبوۃ کی حد تک پہنچ گیا ہے۔" ۳ سرسید نے ایک نئی راہ فکر

۱۔ علی گڑھ تحریک در مضمون سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر از پروفیسر عزالدین۔ ص ۳۸۔

۲۔ تہذیب الاخلاق یکم شوال ۱۳۱۲ھ۔

۳۔ مکتوبات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مکتوب ۱۴ دسمبر ۱۸۹۴ء ص ۶۴۴ – ۶۴۳۔

کے ذریعے لوگوں کو مذہب کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی۔ یہاں تفسیر القرآن اور ان کی دیگر مذہبی تحریروں کے ادبی پہلوؤں سے غرض نہیں ہے بلکہ ان میں مذہبی عقائد اور نظریات کی جدت سے بحث ہے۔ سرسید کے اس جرأت مندانہ اقدام نے ان کے خلاف مذہبی حلقوں میں آگ لگا دی۔ یقیناً "ان کی ساری کوششیں اسلام سے سچی محبت پر مبنی تھیں۔ ان کے خلوص وجذبہ اور نیک نیتی میں شبہہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن ...... جدید علم الکلام کی ایجاد اور اس قدر وسیع ومہتم بالشان مسئلے میں ہزاروں اختلافات اور گتھیوں کو سلجھا کر ایک سیدھی اور نئی راہ قائم کرنا معمولی کام نہ تھا اور نہ ایک ذات واحد کی کوششوں سے انجام پا سکتا تھا۔"[۱] افسوس کہ روایتی عقائد وتعصب کے جوش میں علماء کا طبقہ اگر بجائے مخالفت کے ان کی اعانت کرتا تو ان سے اس سلسلے میں جو غلطیاں ہوئیں ان کی تصحیح بھی ہوتی اور ایک عظیم مقصد کی تکمیل بھی۔ اس طرح یہ نئے طرز کی تفسیر زیادہ صحت مند اور مکمل ہوتی۔ کیونکہ سرسید اپنے مذہبی خیالات کی صحت پر بضد نہ تھے اور چاہتے تھے کہ بجائے ملامت کے ان خیالات کی غلطی کو علماء دلائل سے ثابت کر دیں ایسی صورت میں وہ اپنی غلطی مان لیں گے اور تفسیر کی غلطی درست ہو گی۔ مگر ساتھ ہی وہ صرف لعنت و ملامت کے قائل نہ تھے اور اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ "بات یہ ہے کہ میں خود یہ چاہتا ہوں کہ کوئی دوست اور صاحب سمجھ ایسا ہو جو میری تفسیر پر متوجہ ہو، اس کی غلطیوں سے مجھے آگاہ کرے اور شاید آپ کو یقین ہو گا کہ اگر وہ آگاہی آپ سے مجھے حاصل ہو تو اس سے زیادہ خوشی مجھے کوئی نہیں ہو سکتی۔"[۲] ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ سلجھا اور صحیح طریقہ کار اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر بھی ان کی اس بات کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔

مولانا حالی نے بھی حیات جاوید میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس سلسلے میں سرسید سے غلطیاں ہوئیں۔ مصنف "داستان تاریخ اردو" سرسید کی مذہبی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "وہ بھی ان کی دینی خدمت اور اس سے

۱۔ حیات سرسید از نور الرحمٰن۔ ص ۱۰۴

۲۔ مکتوبات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مکتوب ۸ اکتوبر ۱۸۹۲ء ص ۱۲۷

زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی لیکن وہ ایسا کام تھا جس کے سرسید اہل نہ تھے جس کو ضروری سمجھنے میں سرسید سے غلطی ہوئی جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر تھا۔" ۱ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سرسید کوئی باقاعدہ مذہبی عالم نہ تھے بچپن کی تعلیم کے بعد ان کی باقی تمام تعلیم اور معلومات ان کے اپنے ذوق مطالعہ ذہانت و فطانت پر منحصر تھی۔ لہذا کہیں کوئی غلطی ہو جانا تعجب کی بات نہیں چونکہ انھوں نے مذہب پر اعتراضات کا جواب دیا اس سلسلے میں سائنس کے عقلی دلائل کی روشنی میں مذہب کے اصولوں کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ اس لئے مذہب کی روحانی وسعتیں بھی عقلی حلقے میں محدود ہو گئیں اور مذہب کی وجدانی کیفیات سرے سے نظر انداز ہو گئیں پھر بھی یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر مضر ثابت ہوئی۔ سرسید کی تفسیر کے کارنامے نیز اس کے کمزور پہلوؤں پر مصنف داستان تاریخ اردو نے بہت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ (فٹ نوٹ نمبر۲) -۲ سرسید کی تمام مذہبی تحریریں روایت پرست اور پیشہ ور مولویوں کے لئے بڑا حربہ مخالفت بن گئیں لیکن سرسید اس سے کبھی ہراساں نہ ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا وقتی اثر جو بھی رہا ہو اور ان سے جو بھی ضمنی غلطیاں ہوئی ہوں انھوں نے ان مذہبی تحریروں سے ایک نئی راہ اور نئے صحت مند اجزا لئے فکر مہیا کئے۔ اس سے نئے علوم اور سائنس کے مقابلے میں اسلام کی حقیقت کو اس دور جدید میں روشن تر اور پائندہ تر کرنے میں بڑا کام کیا نیز نئی پود اور ایک پوری نسل کو مذہب سے برگشتہ ہونے سے بچا لیا۔ یقیناً اس سلسلے میں ان سے لغزشیں بھی ہوئیں تاہم انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کے نتائج حسب مراد نکلے۔" ۳ سرسید کی ان کوششوں کو سمجھنے ان کی مذہبی خدمت کا اعتراف کرنے اور ان کی مخالفت کے عناصر کو یکجا کرنے کے لئے ان کے مذہب کے متعلق بنیادی عقائد پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ (فٹ نوٹ نمبر۳) -۴ عقائد کی اس تفصیل پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایسے مذہبی عقائد رکھنے والے شخص کے ایمان پر شبہہ کرنے کی گنجائش باقی نہیں

۱- داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری ص ۳۰۱

۲- (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر۲ باب چہارم) - ص ۲۱۶

۳- سرسید کی دینی خدمات از غلام رسول مہر در علی گڑھ تحریک ص ۱۰۰

۴- (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر۳ باب چہارم) ص ۲۱۷

رہ جاتی بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہب کی روح کو سمجھتا ہے

سرسید کی دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ باوجود مذہبی خیالات کا دائرہ اتنا وسیع ہونے کے ان کی اصلاحی کوششیں یہیں تک مرکوز نہ تھیں وہ ایک طرف مفسر، مبلغ و محقق تھے تو دوسری طرف خادم ملک و قوم اور مصلح بھی۔ مذہب، تہذیب، معاشرتی اقدار، تعلیم، زبان و ادب، ان میں سے ہر ایک حیرت انگیز طور پر ان کی مصلحانہ کوششوں کا میدان رہا ہے۔ سرسید کی تحریک بنیادی طور پر سوشل تحریک تھی۔ تعلیم و تمدن، رسوم و رواج، رجحانات عامہ، اقتصادی پست حالی اور اس کی خرابیوں کو کو دور کرنے کی تیز جد و جہد اس تحریک کا مسلک تھا۔ اس کا مذہب سے صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ اور خرابیوں کی مانند مذہب کے نام پر عقائد و رسوم میں جو خرابیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں انھیں دور کیا جائے۔" سرسید جانتے تھے کہ مذہب کا ایک گمراہ کن اور سطحی تصور لوگوں کے ذہن و دماغ پر اس قدر چھایا ہوا ہے کہ وہ دنیوی ترقی اور علم و فن میں سعی کی طرف سے غافل ہیں۔" ۱ اس لئے ان کی کوشش تھی کہ وہ قدیم نہج کا غلط مذہبی فہم جو نئے تقاضوں کے سامنے شبہہ پیدا کر دیتا ہے دور کیا جائے اور اصلی لوچ اور وسعت فہم کو اپنایا جائے جو مذہبی وسعت اور گیرائی میں مانع نہ ہوں۔ اسطرح اس تحریک کا مطمح نظر خالص دنیاوی امور پر تھا۔ سرسید لکھتے ہیں:" اصلی مقصود تو ہمارے اس پرچے کا تہذیب قومی ہے۔ مسائل مذہبی کی بحث مجبوری آجاتی ہے۔" ۲

قدیم سخت بندھنوں کو توڑنے کے ساتھ مغربی اثرات کو قبول کرنا، نئی تعلیم اور اس کے فوائد کو حاصل کرنا، مادی ترقی سے بہرہ اندوز ہونا نیز عقلیت کی بنا پر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرنا اس تحریک کے اہم رجحانات تھے۔ اپنے ایک مضمون "تکمیل" میں لکھتے ہیں" ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے علوم اور فلسفہ اور اس کے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے سمجھیں۔ بوعلی کچھ صاحب وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علوم دینی ہم مدت دراز سے پڑھتے آئے تھے اور جو اپنے زمانے میں ایسے

۱۔ علی گڈھ تحریک در مضمون سرسید اور مغرب کے تہذیبی اور ادبی اثرات از پروفیسر آل احمد سرور ص ۶۳

۲۔ تہذیب الاخلاق یکم محرم ۱۲۹۱ھ

تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے انھیں پر پابند رہنے کے لئے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھیں نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدائے تعالیٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتے جارہے ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں"۱

ان کی سوشل خدمات کا مذہبی پس منظر خود ان کے الفاظ میں یہ ہے "۔ اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے سو انھوں نے اس کو ایسا بدصورت بنایا ہے کہ جو کوئی نفرت کرے تو تعجب نہیں۔ پس میری خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق، تہذیب، شائستگی کی درستی میں پوری کوشش کریں اور اپنے حال اور چال چلن کو درست و عمدہ کرکے اسلام کی جو اصلی صورت ہے وہ دنیا کو دکھادیں"۲

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان پر غلامی کی لعنت مسلط ہوچکی تھی۔ قومی بدحالی انتہا پر تھی۔ راجہ رام موہن رائے کی تحریک کو نصف صدی گزر چکی تھی۔ خود ہم وطنوں کا نیا طبقہ ان باتوں کی حقیقت اور انگریزی تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس سے مفر کو مضر جانتا تھا۔ لہٰذا یہ طبقہ ترقی کی دوڑ میں ایک صدی آگے بڑھ چکا تھا۔ مسلمان کئی وجوہ سے ابھی تک مکمل طور پر انگریزی تعلیم اور اس کی اہمیت سے بے خبر اور غافل تھے۔ ایک تو انگریزوں کے براہ راست حریف مسلمان تھے لہٰذا انگریزی عتاب کا خاص مرکز بھی وہی تھے۔ (نوٹ)۔۳ مغرب کی لائی ہوئی برکتوں میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا صرف اس لئے نہیں کہ مسلمان ان سے دور بھاگتے تھے بلکہ ملازمتوں میں، تعلیمی اداروں میں فوج میں، عدالتوں اور دفاتر میں انگریزی حکام نے مطلق ان کے لئے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے "ستر سال پہلے ایک بنگالی مسلمان کے لئے ناممکن تھا کہ وہ مفلس ہو۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ کسی بنگالی مسلمان کے لئے ناممکن ہوگیا ہے کہ وہ اپنی دولت قائم رکھ سکے"۴

۱۔ تہذیب الاخلاق پرچہ اولین از مضمون "تکمیل"

۲۔ مقالات سرسید از عبداللہ خویشگی۔ ص ۵۳

۳۔ نوٹ:۔ تفصیل کے لئے دیکھیں غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۱۱۳ تا ۱۲۵

4. Indian Musalmans — By W.W. Hunter P. 158

یہاں مسلمانوں کی کس مپرسی کا اندازہ دو ایک اور مثالوں سے ہو سکتا ہے (فٹ نوٹ نمبر ۴) ۱۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد انگریزوں نے ان پر کس قدر پستی، مفلسی اور بے بسی مسلط کر دی تھی۔ اُن وجوہات کے سبب جو نفرت مسلمانوں میں پیدا ہوئی اس وجہ سے بھی وہ مغربی اثرات سے صلح جو ہونے سے باز رہے۔ حالانکہ اس سے خود مسلمانوں کا ہی نقصان ہوا۔ اسی سبب سے سرسید مسلمانوں کی تعلیم پر خاص کر متوجہ ہوئے تاکہ انھیں ان کے ہم وطنوں کی آگے بڑھتی ہوئی صف میں شامل ہونے اور زندگی کا مقابلہ کرنے کے لائق بنا دیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرسید صرف مسلمانوں ہی کی ترقی یا مفاد کے خواہاں تھے جیسا کہ ان کے الفاظ سے وضاحت ہوگی۔ کوئی وقار اور کوئی عزت کسی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک حکمران قوم کے ساتھ درجہ حاصل نہ کرے اور اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عزت تبھی ہو گی جب ہمارے ملکی بھائی حکمران قوم کے ساتھ برابر کے عہدے رکھتے ہوں گے" ۲ اسی طرح ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "کوئی وقار اور کوئی عزت کسی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ حکمران قوم کے ساتھ درجہ حاصل نہ کرے اور اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے۔ دوسری قومیں مسلمانوں یا ہندوؤں کی محرری یا ادنیٰ عہدوں کو دیکھ کر عزت نہیں کر سکتیں بلکہ جو گورنمنٹ اپنی رعایا کو اس قسم کے اعزاز سے محروم رکھے وہ بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ عزت جبھی حاصل ہوگی جب ہمارے ملکی بھائی حکمراں قوم کے ساتھ برابر کے عہدے رکھتے ہوں" ۳

سرسید جہاں کہیں بھی ملک و قوم کا فائدہ محسوس کرتے ہیں اپنی تحریروں اور مشغولیات

۱۔ (دیکھیں تفصیل فٹ نوٹ نمبر ۴ باب چہارم) ص ۳۱۹

۲۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز مرتبہ محمد امام الدین گجراتی ص ۲۳۷ (مصطفائی پریس لاہور) در تقریر ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء بمقام امرتسر۔

۳۔ سفرنامہ پنجاب۔ ص ۷۷۔

ہیں انگریز دوستی قائم رکھتے ہیں اور جب بھی انھیں ملک و قوم کا نقصان محسوس ہوتا ہے، حکومت کی مخالفت کرتے ہیں اور طنز سے باز نہیں آتے ان کے مضامین اور عرضداشتیں اس سے بھری پڑی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں جب کہ ان کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اعلیٰ مغربی و انگریزی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے" وہ گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کے خلاف بے دھڑک لکھتے ہیں:" گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں۔ وہ ہم کو اس قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کہ اس کو ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچا دیں۔ ان کو انتظام ملک انتظام دفتر کے لئے چند ایسی کٹ پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے مانچسٹر میں سوت کاتنے کے لئے کٹ پتلیوں کی ضرورت ہے . . . . ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں میں بعض مدبران سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اعلیٰ درجے کی حقیقی تعلیم دینا دہ مناسب نہیں سمجھتے" ۱ ان الفاظ کے تیکھے پن پر غور کریں۔ عام طور پر گورنمنٹ کے ساتھ صلح جویانہ طریقہ برتنے کے باوجود وہ جہاں ملک و قوم کے مفاد کو ٹھیس پہنچتی ہوئی محسوس کرتے ہیں فوراً مخالفت کرتے ہیں۔ سخت طنز اور تنقید سے باز نہیں آتے۔

اسباب بغاوت ہند ان کا وہ سیاسی کارنامہ ہے جو نہایت تیز نشتر اور گہرا طنز پوشیدہ رکھتا ہے۔ پھر بھی انداز تحریر باغیانہ نہیں مدافعانہ اور دوستانہ ہے اس کتاب میں نہایت صفائی سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ حکومت نے خود ایسے حالات اور اسباب پیدا کر دئے تھے کہ ملک میں خوف و ہراس اور حکومت کی طرف سے بدظنی اور بے چینی پھیل گئی جس کا لازمی نتیجہ غدر تھا۔ گویا خود حکام کی ناعاقبت اندیشی نے غدر کے اسباب مہیا کر دئے تھے۔ اس میں محض ایک بحث یا ان کے اپنے خیالات کا اظہار ہی نہ تھا بلکہ انھوں نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں دلائل اور ثبوت کے ساتھ پانچ خاص وجوہات بیان کر کے ان کی تشریح کی تھی۔ اس ہنگامی دور میں جب کہ حکام کے سامنے کسی کو آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ تھی، سر سید نے اپنی جان و عافیت کی پرواہ کئے بغیر نہایت صفائی اور بے باکی کے

۱۔ حیات سر سید از نور الرحمٰن۔ ص ۷۰

ساتھ حکومت پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔

سرسید ہندوستان کی ترقی اور ہندوستانیوں کی بہودی کے دل سے خواہاں تھے۔ ملکی و قومی ترقی اور آزادی کے لئے جس بیداری کی ضرورت تھی اس سے بھی بے خبر نہ تھے وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کے لئے ایک مضبوط اور منظم ہندوستانی قوم کی ضرورت ہے جس کی ذہنی اور علمی صلاحیتیں یکساں ہوں اور یہ چیز مسلمانوں کے پست حال رہ جانے کی صورت میں ممکن نہ تھی۔ چنانچہ سرسید اسی لئے مسلمانوں کی ترقی کے لئے خصوصی طور پر کوشاں ہوئے۔ یقیناً ملکی ترقی کی کوششوں میں یہ ان کا خاص حصہ تھا۔ ان کے سامنے اس وقت جو سیاسی میدان تھا وہ انگریزوں کے مقابلے پر لانے کے لئے قوم کو سوشل اور تعلیمی طور پر اس لائق بنانا تھا کہ اجتماعی تنظیم ممکن ہو سکے اور ایک بڑی ہندوستانی طاقت وجود میں آسکے۔ براہ راست مخالفت یا جنگ یا باغیانہ انداز اختیار کرنے کا ان کے خیال میں وہ موقع نہ تھا جب کہ غدر کی عظیم بغاوت کو قابو میں لانے کے بعد انگریز اب کھلے طور پر تنہا حکمراں بن چکے تھے۔ ہندوستانیوں کی رہی سہی طاقت جواب دے چکی تھی اور باقی ماندہ قوت منتشر و برباد ہو چکی تھی۔ اس چیز کو مسلمانوں کی خصوصی اصلاح کے ساتھ مغربی رجحانات کو قبول کر کے ایک عام ہندوستانی یکجہتی اور تہذیبی یکسانیت پیدا کرنے سے ہی مکمل کیا جا سکتا تھا۔ جس سے غیر ملکی طاقت کے سامنے ایک منظم اور متحد ہندوستانی قومیت کا استحکام ہو سکے۔

نورالرحمٰن صاحب اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں "چنانچہ علی گڈھ کالج کی تعمیر، مذہبی مسائل میں رواداری کی تعلیم، قومی و ملکی تعصبات سے بیزاری علو ہمتی اور بلند خیالی کی ترغیب وہ اس مقصد سے کرتے تھے ...... تاکہ ان میں یہ طاقت و لیاقت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر حکومت میں عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور جب موقع ملے تو آزادی حاصل کرنے میں اپنی ہمسایہ قوموں سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔"[۱] مسلمانوں کی تعلیم میں خصوصی کوشش سے سرسید کا مقصد یہی تھا کیونکہ تعلیم کے بارے میں ان کا خیال تھا۔ "کوئی قوم ترقی نہیں

۱۔ حیات سرسید از نورالرحمٰن ص ۱۲۰

پا سکتی جب تک کہ تعلیم ایک مقدار تناسب سے اس قوم میں رائج نہ ہو۔"۱ سرسید کے فرزند سید محمود جن کے خیالات سرسید کے تصورات اور ان کی عملی کوششوں کے عین مطابق تھے اور جن پر سرسید کو بہت فخر تھا۔ (جیسا کہ ان کے بہت سے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے) ایک جگہ فرماتے ہیں" میں ہمیشہ جان و دل سے اس بات پر یقین کرنے والا ہوں کہ جب تک مسلمان اور ہندو ایک برادرانہ محبت سے مل کر ملکی ترقی میں کوشش نہ کریں گے اس وقت تک ہمارے ملک کو پوری ترقی نہ ہوگی۔ اگر ہم کیسی ہی ترقی کر جاویں اگر ہندو ناشائستہ رہیں جن کی تعداد اس ملک میں ہماری بہ نسبت بہت زیادہ ہے اس وقت تک ہمارا ملک اندھیرے میں رہے گا۔"۲

مذہبی سلسلہ میں سرسید کی کوششوں کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہئے کہ پچھلے کئی ہزار سالوں میں پوری دنیا پر مذہب اور مذہبی رجحانات کا مکمل غلبہ رہا ہے۔ خواہ وہ کوئی مذہب ہو مذہب کا اقتدار ہر جگہ مانا گیا۔ حکومتوں پر سیاست پر عوامی اذہان پر مذہب اور اس کے نام کا تسلط مستقل چلا آتا تھا۔ تمدنوں اور تہذیبوں کی بنیادوں میں مذہبی عناصر شامل رہے۔ تعلیم و عقائد، رسوم اور رواج میں مذہب کے بندھن مضبوط رہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے دور سے قبل و بعد یہی حال تھا۔ پچھلے ہزار سالہ دور میں ہندو اور مسلمانوں میں تہذیبی و لسانی میل جول کے ساتھ ایک نئی ملی جلی تہذیب جگمگا اٹھی۔ سیاست میں تمدن میں ہر جگہ بلا تعصب مذہبی، یکجہتی اور اتحاد نظر آنے لگا۔ (نوٹ) ۳۔ مگر ساتھ ہی مذہبی تسلط اپنی جگہ پر تھا۔ یعنی اپنے اپنے مذہب کی بڑے خلوص سے پابندی اور اس کا خیال۔ یہی وہ میدان تھا جہاں صرف ایک ہم مذہب ہی قیادت کر سکتا تھا۔

۱۔ تہذیب الاخلاق ۱۵ ذی قعد (روداد جلسہ پنجاب مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء)
تقریر سرسید احمد خاں۔

۲۔ از تہذیب الاخلاق ۱۵ ذی قعد ۱۲۹۰ھ لکچر سید محمود بمقام لاہور۔

۳۔ نوٹ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں اردو شاعری کا پس منظر، باب اول از ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔

نیز سوشل اصلاح کے سلسلے میں براہ راست مذہبی عقائد اور رسوم سے واسطہ بھی لازم تھا۔

سرسید مسلمانوں کی حد درجہ لپست حالت کے پیش نظر خاص طور پر ان کی سوشل اور تعلیمی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اس پوری ہندوستانی قوم کی تنظیم کے دل سے تمنائی تھے جس کا مسلمان ایک اہم حصہ تھے۔ لہذا خود ان کے الفاظ اس کی بہتر وضاحت کرتے ہیں۔" پرانی تاریخوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں یوروپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں گو ان میں دوسرے ملک کے لوگ بھی آکر بس جاتے ہیں۔ مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کے لوگ کہلاتے ہیں۔ غرض قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں کے لئے بولا جاتا ہے گو ان میں بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔ اے ہندو اور مسلمانوں کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دونوں دفن نہیں ہوتے؟ کیا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے ہو؟ اسی پہ مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے، ایک ہونا چاہئے۔"۱

راجہ رام موہن رائے کی تحریک اس بات کی صداقت کا پتہ دیتی ہے۔ راجہ رام موہن رائے کی عظیم شخصیت ایک ہندوستانی قوم کی تنظیم اتحاد اور اس کی عظیم قوت سے بے خبر نہ تھی۔ انھیں یہ احساس تھا کہ بغیر ایک عظیم یکجہتی کے جس میں مذہب و ملت کے قطع نظر ہندوستانی ہونا مقصود ہو ترقی اور آزادی ناممکن ہے۔ مگر جدید ترقی کی راہوں

۱۔ لکچر مدرسہ گورداس پور ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء از مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید احمد خاں مرتبہ محمد امام الدین گجراتی۔ ص ۲۴۷۔ (سلطانی پریس لاہور۔)

پر گامزن ہوئے بغیر پرانے بندھنوں کو توڑے بغیر آزادی کی کامیاب جہد ممکن نہیں۔ یہی اس وقت کا سیاسی میدان تھا یعنی سوشل اصلاح کے ساتھ مغربی تعلیم و اثرات کی تبویت اور قدیم غلط بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔ سوشل اصلاحات کے سلسلے میں مذہبی رسوم و عقائد کا سامنا لازمی تھا۔ جس میں صرف ہم مذہبوں ہی کی قیادت ممکن ہوسکتی تھی۔ سرسید سے سو سال قبل راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی سماجی نظام تمدن میں بچھڑی ہوئی حالت اور سخت مذہبی بندھنوں کو اسی طرح محسوس کیا تھا جیسا سرسید نے مسلمانوں کے لئے غدر کے بعد محسوس کیا۔ لہذا یہی وجہ تھی کہ راجہ رام موہن رائے نے خصوصی طور پر اپنی تحریک کو ہندوؤں کی اصلاح پر مرکوز کیا۔ یہی حال سرسید کی اصلاحی تحریک کا تھا۔

سرسید راجہ رام موہن رائے کی تحریک اور اس سلسلے کی تمام تحریکوں سے کما حقہ' واقف تھے۔ ان کی ضرورت اور اہمیت کو جانتے تھے۔ لہذا ان کی تحریک اور راجہ رام موہن رائے کی سوشل تحریک میں صاف مناسبت نظر آتی ہے۔ نیز یہ پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے جس وقت مسلمانوں میں سوشل اصلاح کا کام شروع کیا ماضی قریب کی پچھلی تمام تحریکیں ان کی نظر میں تھیں۔ (فٹ نوٹ نمبر ۵) ۔۱ مذہبی تسلط کے اس زمانے میں جب کہ مغربی مادیت اپنی جگہ بناتی جارہی تھی۔ ہر مصلح مجبور تھا مذہبی رجحانات سے دوچار ہونے اور مخصوص طبقہ کی خصوصی قیادت کرنے پر کیونکہ عوام کو کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے مذہبی رجحانات اور عناصر سے دوچار ہوئے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ مذہبی تسلط کے اس تہذیبی پس منظر کے ساتھ اور ان مذہبی اصلاحات کے پیش نظر جو لامحالہ سامنے آئیں سرسید کو صرف ایک طبقہ کا نمائندہ کہنا بے جا ہے۔ وہ راجہ رام موہن رائے کی مانند ایک محب قوم و وطن تھے مگر جہاں مذہبی اصلاح کا سوال درپیش ہوتا تھا وہاں یہ دونوں صرف ہم مذہب گروہ کی قیادت کرسکتے تھے۔

سرسید کی عام خدمات میں ساری ہندوستانی قوم ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ اس حقیقت کا انکشاف ان کی تحریروں کے بغور مطالعہ سے ہوجاتا ہے۔ سرسید کا ایک ہندوستانی قوم اور قومی تربیت کا تصور اور اس کی مثالیں ان کی تحریر و

۱۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۵ باب چہارم) ص ۳۲۱

تقریر میں اکثر ملتی ہیں۔ کہتے ہیں۔ "یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں سے نہیں، ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ غیر ملکوں میں ہم لوگ جاتے ہیں تو ہندو اور مسلمان کے نام سے نہیں پکارے جاتے بلکہ نیک دل لوگوں سے نیٹو اور تنگ دل لوگوں سے نیگرو (وحشی) کا لقب برابر سنے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ساتھ پرورش نہ پاویں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جاویں، ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مقصد تھا۔ مگر میرا کیا مقدور کہ میں اس کو انجام دے سکتا میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مدد کی۔" ۱

سرسید قدیم شاہی حکومت کی کمزوری سے اچھی طرح واقف تھے اور سمجھ چکے تھے کہ یہ ریت کی دیوار اب نہیں ٹھہر سکتی۔ اسی لئے غدر کے پہلے ہی دربار شاہی سے باوجود اتنی قربت اور تعلق کے جو والد اور نانا کے ذریعہ انھیں تھا مستقل ملازمت کے لئے وابستگی انھوں نے پسند نہ کی۔ زمانے کے حالات کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ نئے دور میں جمہوری طور پر حکمرانی کی ہندوستانیوں میں ابھی صلاحیت نہیں تھی۔ ایسی صورت میں انھوں نے جو راہ اختیار کی وہ یہ کہ پہلے ہندوستانیوں کو خود حکومت کرنے اور جمہوری حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیت حاصل کرنا چاہئے نیز حکومت سے دوستانہ برتاؤ کے ساتھ نہایت خاموشی اور سرعت سے علوم جدیدہ کی تحصیل اور تعلیمی ترقی میں کوشاں ہونا چاہئے۔ سرسید کے سیاسی رجحانات میں تین چیزیں نمایاں ہیں جو ان کی عملی جدوجہد اور اصلاحی کاوشوں میں صاف کارفرما نظر آتی ہیں۔ ایک معزز انگریز کے نام خط میں لکھتے ہیں: "میں مسلمان ہوں، ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انھیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں"۔ ۲

۱۔ لکچر بجواب انجمن اسلامیہ امرتسر ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء از مجموعہ لکچرز سید احمد خاں مرتبہ امام الدین گجراتی ص ۲۲۲ (مصطفائی پریس لاہور)

۲۔ مکتوبات سرسید از محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ص ۱۷۸۔

اول تو یہ کہ وہ خود کو ہندوستانی مسلمان کہتے تھے اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے بھی لفظ ہندوستانی پر خاص زور دیتے تھے۔ لہذا ہندوستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کی فلاح و ترقی کو ہمیشہ ہندوستان کے دامن سے وابستہ رکھا حتی کہ پین اسلامی تحریک کی بھی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ جو قوم اپنا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں وہ کس طرح سیاست اسلامی کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ چنانچہ فتح ترکی پر ہندوستانی مسلمانوں کے جلسۂ خوشی کے متعلق لکھتے ہیں: "لوگوں نے اس زمانے میں ترکی کی فتح یابی پر ہندوستان میں متعدد جلسے کئے اور سلطان کو مبارکبادی کے تار بھیجے۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی کی کیا مدد کر سکتے ہیں اور اس خوشی منانے سے ترکی کو کیا فائدہ ہوا۔" ۱ ان کے مذہبی طرز فکر پر بھی کہ "اسلام عین فطرت ہے اور فطرت عین اسلام" مخالفین نے بہت غل مچایا تھا اور انھیں نیچری مشتہر کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ جمال الدین افغانی نے اسی بنا پر سرسید کی پالیسی پر شدید حملے کئے ہیں۔ انھیں دہریہ بھی کہا اور انگریزوں کا پٹھو اور خوشامدی بھی کہا ہے۔ خلیق احمد نظامی کہتے ہیں "کتنی تعجب کی بات ہے کہ سرسید کے پورے انداز فکر کو مولانا جمال الدین نے غلط سمجھا اور غلط پیش کیا۔ یہ وہ طرز فکر ہے جو کسی حد تک حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی حجۃ البالغہ میں اپنی تحقیق کی اساس قرار دیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز سے ایک بار سوال کیا گیا تھا کہ اتنے مذاہب دنیا میں آئے ان کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، آپ کیسے کہتے ہیں کہ اسلام کی شریعت تمام عالم اور ہر وقت کے لئے ہے۔ جواب دیا اور شریعتوں کی بنیاد وقتی ضرورتوں پر تھی، شریعت اسلام کی بنیاد فطرت انسانی پر ہے۔" ۲
بقول اقبال غالباً "وہ (سید احمد خاں) دور جدید کے پہلے مسلمان ہیں جس نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی ..... لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جس نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لئے سعی کی۔" ۳

۱۔ مقالات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی (حصہ نہم) ص 19
۲۔ علی گڈھ میگزین (علیگڈھ نمبر) در مضمون سید احمد خان اور سید جمال الدین افغانی ص ۱۲۱
۳۔ بحوالہ علی گڈھ میگزین (علی گڈھ نمبر) ص ۱۳۳

سرسید کے انتقال کے بعد کچھ پین اسلامک تحریک کے زیر اثر اور کچھ تحریک خلافت کے طوفان نے جب ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ کو مشرق وسطیٰ اور ترکی کی طرف مبذول کر دیا تو سرسید کے طرزِ فکر اور خیالات پر شدید نکتہ چینیاں ہوئیں۔ سرسید کے خیالات کہاں تک صحیح تھے۔ واقعات خود اس کے شاہد ہیں۔ پین اسلامی تحریک بین الاقوامی سیاست کا نشانہ بن گئی اور خلافت کی تحریک ترکی کی خلافت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کا کتنا تعلق رہ سکتا تھا ظاہر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ ریڈیکل کہا کرتے تھے اور اس میں تعجب نہیں کہ ان کے رجحانات اس زمانے کے لحاظ سے ریڈیکل تھے۔ "اسباب سرکشی ہندوستان"، سرسید کے انقلاب انگیز طرزِ فکر کی یادگار ہے جس میں انھوں نے گویا یہ دعویٰ کیا کہ خود انگریزوں کی نااہلی، خود غرضی اور عزدر نیز ہندوستانیوں سے ان کی نفرت و حقارت غدر کا سبب بنی اور یہ ثابت کیا کہ وائسرائے کی کانسل میں ہندوستانیوں کا شمول لازمی اور حکومت و عوام دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اسباب بغاوت ہند پہلا سیاسی نظریہ تھا جو غدر کے دورِ آتشین کے فوراً بعد پیش کیا گیا جب کہ حکام وقت کے سامنے کسی کو لب کشائی کی مجال نہ تھی۔ پھر جب سرسید خود ممبر کانسل چنے گئے تو وہ پہلے ہندوستانی تھے جو اپنی رائے کے اظہار میں کبھی نہ جھجکے خواہ وہ حکام کے خلاف ہی ہو۔ انگریزی سے ناواقفیت کے باوجود وہ کانسل کی تمام کارروائیوں سے باخبر رہتے اور خود بھی ترجمہ کے ذریعہ انگریزی زبان میں صحیح تلفظ کے ساتھ نہایت قابلانہ اسپیچ دیتے اور ایسی باوزن تجویزیں پیش کرتے جو ملک کے لئے مفید ہوں۔

(نوٹ نمبر ۱) یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی جد و جہد کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی۔ انڈین ایسوسی ایشن سترہ برس بعد ۱۸۷۶ء میں بمقام کلکتہ قائم ہوئی۔ مسٹر سریندر ناتھ بنرجی کا پہلا سیاسی دورہ اٹھارہ برس بعد ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ مسٹر ہیوم Mr. Hume کی تحریک سیاسی کے متعلق پہلی اپیل چوبیس سال بعد ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئی اور خود انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس چھبیس سال بعد ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد

۱۔ نوٹ۔ تفصیل کے لئے دیکھیں حیات جاوید ص ۱۵۶ ۔ ۱۶۲

ہوا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید نے جس وقت اپنی اول ترین اہم اور مقبول ترین سیاسی خدمت انجام دی ہے تو ہندوستان کی دنیائے سیاست ہنوز خواب عدم میں تھی اور سیاسی تحریک عالم وجود میں بھی نہ آئی تھی۔" ۱

یہی نہیں سرسید کو جب کسی ایسے مسئلہ کا سامنا ہوا جس میں ہندوستانیوں کی عزت اور فائدہ ہو تو انھوں نے اس کی حمایت کی خواہ اس کے لئے حکومت کی پالیسی سے اختلاف کرنا پڑے۔ ایسے موقعوں پر وہ کبھی صاف طور پر اعتراض کرنے یا اس کا جواب دینے سے باز نہ آئے۔ چنانچہ ورنیکولر اسکیم پر زور دینے کی پالیسی گورنمنٹ کی طرف سے شروع ہوئی تو سرسید نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ اس وقت تک وہ سمجھ چکے تھے کہ اعلیٰ مغربی علوم کے حصول و فوائد کے لئے ملک میں انگریزی تعلیم لازمی ہے۔ ان کو خیال ہوا کہ گورنمنٹ اعلیٰ تعلیم سے ہندوستانیوں کو محروم رکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کہتے ہیں۔ "ہمارے لئے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے جہاں تک ہم سے ہوسکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں۔ جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہوسکتے ہوں حاصل کریں۔ . . . . . بے شک ہم کو ایسا کرنے میں بہت مشکلات درپیش ہیں۔ ادھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت اور تعصب سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور ادھر اپنی فتح مند قوم کے ان تنگ دل لوگوں کی مزاحمت کو برداشت کرنا ہے جو ہماری سوشل اور پالیٹیکل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگ دلی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن، جنٹلمین کے ایسے اخلاق یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلودہ سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بہت بڑے مجرم کو دیکھتا ہے۔" ۲

جب قانوناً اشتعال سے قتل، قاتل کی رہائی کی وجہ قرار دی گئی تو کئی انگریز اس کی وجہ سے جرم قتل سے بری ہوئے۔ اس پر بھی سرسید نے سخت نکتہ چینی کی۔ "قانون تعزیرات ہند کے حکم سے یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ بے رحم لوگ نہایت جری ہوگئے ہیں اور ہر شخص اپنے

۱۔ حیات سرسید از نورالرحمن ص ۱۱۰-۱۰۹

۲۔ حیات جاوید۔ ص ۲۹۰ (حصہ دوم طبع سوم ۱۹۲۲ء)

دل کا بخار نکالنے اور قتل میں کامیاب ہونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا ہے۔ تاہم کچھ اندیشہ تھا مگر جب سے کہ ایک گورے کے ہاتھ سے شاہ جہاں پور میں تین ہندوستانی مقتول ہوئے اس وقت سے آلۂ قتل کی بھی چنداں پرواہ نہیں اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکیدار کا شکار بندوق ہی سے ہوا اور اگر ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جیوریوں کی نیتیں بخیر رہیں تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہوگی۔ اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔"۱ یہ سرسید ہی تھے جو حکام کی خفگی سے بے پرواہ آگرہ دربار میں شرکت سے اس بات پر انکار کر کے واپس چلے آئے کہ وہاں ہندوستانیوں کے لئے کرسیاں نیچے درجے پر اور انگریزوں کے لئے اونچے درجے پر سجائی گئی تھیں۔ یہ واقعہ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ (فٹ نوٹ نمبر ۶) -۲

یہی نہیں علمی وادبی میدانوں میں بھی سرسید نے حکام اور انگریزوں کی غلط بیانیوں کا کھلم کھلا اور دنداں شکن جواب دیا۔ نہایت سچائی کے ساتھ حقیقت اور اصلیت سے پردہ ہٹا کر اسلام کے متعلق عام عیسائی غلط بیانیوں اور مسلمانوں پر حکومت انگلشیہ کے عتاب بے جا کو دور کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہنٹر Hunter کی کتاب پر ان کا ریویو مشہور ہے۔ وہابیت کے نام پر جو مسلم کش نظریات حکام میں پھیلے ہوئے تھے اس کے ذریعہ اسے ختم کیا۔ ولیم میور William Muir کی کتاب لائف آف محمدؐ کا جواب خطبات احمدیہ کے ذریعہ دے کر ایسی لاجواب مثال پیش کر دی کہ عیسائیوں میں اسلام کے خلاف بہت سی غلط بیانیوں کا ازالہ ہوگیا۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود وہ کسی ایسے انگریزی حاکم ضلع سے ملاقات نہ کرتے تھے جو خود پسند و مغرور ہوتا اور ہندوستانیوں سے توہین آمیز برتاؤ کرتا۔ اور آخر تک یہ طریقہ قائم رکھا۔ چنانچہ جب علی گڈھ میں ایک انگریز کلکٹر آیا جو ہندوستانیوں کو جوتا پہن کر سامنے نہ آنے دیتا تھا تو سرسید نے کبھی اس سے ملاقات نہ کی۔

۱۔ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۲۵-۲۴ اور مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی حصہ سیزدہم ص ۲۷-۵ - در مضمون ہندوستانیوں کا خون۔

۲۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۶ باب چہارم) ص ۳۲۲-

اب تیسری بات جو باقی رہی وہ یہ کہ سرسید جمہوری طرز حکومت کو پسند کرتے تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ انگریزوں کی فوجی طاقت یورپ کے صنعتی انقلاب اور سائنس کی ایجادات پر منحصر ہے۔ مگر ہندوستان کی ترقی کی عنان بدلیسیوں کے تسلط کے نیچے دب چکی ہے۔ ہندوستان اب تک قدیم شاہی نظام کا عادی تھا اور نئی تبدیلیوں کے باوجود جمہوریت کے خد وخال ابھی اس پر واضح نہیں ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں۔ "جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری ترقی ہوگی، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا، بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہماری قوم میں کافی تعلیم ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔" ۱

سرسید کے فکر وعمل کا دائرہ بہت وسیع اور ان کی نظر عمیق تھی انھوں نے زمانے کی آواز کو سنا اور سمجھا تھا۔ اسی لئے حکومت وقت کے ساتھ نرم اور دوستانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مگر اس بناء پر انھیں خوشامد پسند سمجھنا ٹھیک نہیں بلکہ ایسے موقعوں پر یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ سرسید کی کاوشوں کو اس زمانے اور حالات کے درمیان دیکھا اور سمجھا جائے نہ کہ موجودہ حالات کی روشنی میں۔

مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید کے خیال وعمل میں یکسانیت اور صاف مطابقت نظر آتی ہے۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کے اظہار میں ذرا تامل نہ کرتے تھے۔ اور نہایت سچائی سے اسے علانیہ ظاہر کرتے تھے۔ ساتھ ہی بہت پرخلوص طور پر اس چیز کے لئے کوشش کرتے۔ ایسے موقعوں پر انھیں نہ تو حکومت کا خوف ہوتا تھا اور نہ کسی مخالفت کی پرواہ۔ بہرحال سرسید کے سیاسی افکار کی وضاحت ابھی غور طلب وبحث طلب ہے جس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں اور نہ یہ ہمارا موضوع ہے۔ اس لئے ایک سرسری جائزہ کافی ہے۔

۱۔ مکمل مجموعہ لکچرز واسپیچیز از امام الدین گجراتی ص ۳۲۵۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اول میں، ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء۔ (نول کشور پریس لاہور)

سرسید نے آج سے سو سال قبل یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ابھی ہماری قوم کا ذہن پختہ نہیں اور بجائے اور باتوں پر توجہ دینے کے ساری کوشش تعلیمی اور سوشل ترقی پر صرف کرنی چاہئے کیونکہ تعلیم قومی ترقی کا بنیادی زینہ ہے۔ بغیر اعلیٰ تعلیم اور پختہ تر قومی ذہن کے اور بغیر فکر و عمل کی راہ کھلے آگے بڑھنا ایسا ہی ہے جیسے اندھے کو راہ دکھانی۔ (فٹ نوٹ نمبر ۷) ۔ ا سرسید کی اصلاحی کاوشوں کے ضمن میں ان کے سیاسی خیالات کا سرسری جائزہ ضروری تھا۔ دراصل سوشل اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں مذہب و سیاست، تعلیم و ادب، عقائد رسوم تمام چیزوں کی حدود ایک دوسرے میں پیوست نظر آتی ہیں اور کسی مصلح کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان تمام چیزوں کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

سرسید کی سوشل خدمات کسی تشریح و تعارف کی محتاج نہیں۔ انھوں نے جس ہمت اور مستقل مزاجی کے ساتھ ملکی و قومی ترقی کا علم بلند کیا اور جس جانفشانی اور قربانی کے ساتھ ہر چہار طرف سے کوشش میں لگے رہے یہ ان کی اولوالعزمی کی دلیل ہے۔ جس طرف ضرورت محسوس کی اس طرف جہد و عمل میں برسرپیکار ہوئے اور تیس چالیس سال کی قلیل مدت میں ایک دنیا بدل ڈالی۔ مذہب، عقائد، سیاست، ادب، رسوم اور رواج اور اقتصادی حالت غرض ہماری سماجی زندگی کے گوشہ گوشہ کو چھان مارا اور ہر جگہ سے اصلاح طلب باتوں کو چن کر پرخلوص خدمات انجام دیں۔ تعلیمی ترقی ان کی اصلاح کا مرکزی جز تھی وہ مغربی اور انگریزی تعلیم اس درجہ کی اور اس لئے چاہتے تھے کہ اس سے قومی ترقی ہو، روشن خیالی اور بیدار مغزی پیدا ہو۔ چنانچہ لکھنؤ میں تقریر کرتے انھوں نے کہا تھا "اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔" ۲ ان کا خیال تھا کہ وقتی تقاضوں کے مطابق تمام علوم و فنون کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب تعلیمی ترقی عروج پر ہو۔ صرف اسی صورت میں عام ذہنی سطح بلند اور فکر و عمل کا دائرہ پختہ اور وسیع تر ہو سکتا ہے۔

۱۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۷ باب چہارم) ص ۳۲۳

۲۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز مرتبہ محمد امام الدین گجراتی ص ۲۸۷ (مطبوعہ نول کشور پریس لاہور) لکچر بمقام لکھنؤ دوسرا اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس)

چنانچہ تعلیم کے متعلق لاہور کی ایک تقریر میں اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا کہ قوم میں تین طرح کے تعلیمی طبقے ہونا چاہئیں۔ ایک طبقہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ہو جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں نہ صرف کامل دست گاہ بلکہ امتیازی شان رکھتا ہو۔ ایک طبقہ متوسط تعلیم کا ہو جو اعلیٰ مصنفوں کی علمی تحقیقات و تصنیفات سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو اس کے بعد ایک طبقہ ادنیٰ تعلیم کا ہو جس میں تین درجے کرتے ہیں۔ ایک وہ جس نے اس قدر تعلیم پائی ہو کہ خاص اپنی اپنی عقل و علم سے اپنے کاموں کو انجام دے سکے۔ دوسرے وہ جو ان ترقیوں کے ذریعہ جو ہر روز علوم و فنون میں ہوتی ہیں فائدہ اٹھا سکے۔ تیسرے جو جسمانی محنت کی لیاقت رکھتا ہو لیکن آسان کتابیں، اخبار اور دینی مسائل کی کتابیں پڑھ سکتا ہو۔ انھوں نے ہمیشہ ملازمت کو ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا نتیجہ بتایا اور اسے تیسرا درجہ دیا ہے۔ وہ اقتصادی اور معاشی ترقی کی بنیاد تعلیمی ترقی کو ہی سمجھتے تھے۔ ایک تقریر میں کہتے ہیں: "سمندر کے اندر ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہئے کہ دوسرے ملکوں میں آڑہت اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجہ کے تاجر ہوں۔ ملک کی پیداوار اور قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ . . . . بے شک جس طرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملکوں میں جاتا ہے ہم بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک میں کھینچ لاویں یہ سب باتیں صرف ہم کو ہائی ایجوکیشن کے نہ ہونے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ اگر علم ہوتا تو ہم زوال رسیدہ تجارت کے عوض دوسری تجارت اختیار کرتے اور ہم لوگ امریکہ، لندن، جرمن اور فرانس میں جاتے اور وہاں اپنی نئی تجارت کی دوکانیں کھولتے اور ہم اپنے ملک کی چیزوں سے پورا فائدہ اٹھاتے جو دوسری قومیں ہمارے یہاں کی چیزوں سے اٹھاتی ہیں۔ اگر علم ہو جاوے تو یہ سب کچھ ہو اور ملک دولت سے مالا مال ہو جاوے"۔[۱] ہر طرح کی اقتصادی، معاشی اور سوشل ترقی اور سیاسی بیداری کے لئے وہ قومی تعلیم کو بنیاد سمجھتے تھے۔ اور تعلیم کو مرکز بنا کر ان کی کاوشیں ہر چہار طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

غدر کے بعد ان کے مرادآباد کے زمانۂ قیام میں جب زبردست قحط پڑا تو انھوں نے

۱۔ مجموعہ لکچرز و اسپیچیز مرتبہ محمد امام الدین گجراتی ص ۲۲۲ (نولکشور پریس لاہور)
اور سفرنامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی ص ۱۱۷-۱۱۶

ایسی سچی ہمدردی محنت اور خوش اسلوبی سے کام کیا کہ تمام انتظامات حکومت نے خاص طور پران کو سونپ دیئے اور انھوں نے بغیر امتیاز مذہب و ملت و نسل سب کی خدمت کی اور ہر ضرورت مند اور قحط زدہ کی ضروریات نہایت اچھی طرح اور یکساں طور پر پوری کیں۔ راجہ جے کشن داس جو سرسید کے بارے میں ان کی وفادار مسلمان ہند" دیکھ کر اچھی رائے نہ رکھتے تھے اور انھیں متعصب سمجھتے تھے یہیں پہلی بار ان سے ملے اور جب انھوں نے سرسید کو ایک ایسے ہندو کی خدمت کرتے دیکھا جو اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا اور جس کے رشتہ دار اس کی گندگی کی وجہ سے اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے، تو ہمیشہ کے لئے ان کے دوست بن گئے۔" ۱ حالی کی حیات جاوید میں خود راجہ جے کشن داس کی زبانی سرسید کے بارے میں یہ واقعہ درج ہے۔ ۲

مراد آباد ہی میں سرسید نے ایک اسکول انگریزی طرز کا کھولا۔ پھر غازی پور تبادلہ ہوا تو وہاں ایک اسکول کھولا۔ جس میں عربی، فارسی، سنسکرت اور انگلش وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ یہ اسکول اب کالج ہو گیا ہے اور ڈگری کالج غازی پور کے نام سے اب بھی غازی پور میں قائم ہے۔ یہیں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ بہت سی کتابیں اور مضامین نئے علوم سائنس اور تاریخ، انگریزی سے ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ سوسائٹی کے اخبار میں ہمیشہ صحت مند خبریں شائع ہوتی تھیں۔ سوسائٹی کے بارے میں ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں جب وہ علی گڑھ میں تھے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی جس میں ہندو مسلمان سب برابر کے شریک تھے۔ اس کے قیام کا مقصد خود ان کی تقریر سے ظاہر ہے۔ "ہندوستانیوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہئے۔ جس طرح ان انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے۔ اس طرح ہم تمام اضلاع شمال و مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعے سے اپنے تمام مطلب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔" ۳ اس ایسوسی

۱۔ سرسید تاریخی اور سیاسی آئینے میں از ڈاکٹر شان محمد ص ۹۸

۲۔ حیات جاوید ص ۷۰

۳۔ حیات جاوید ص ۸۵ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۶ء)

ایشن کے ذریعے کئی مفید کام بھی ہوئے۔ مثلاً مسافران ریل کی تکالیف کا تدارک ہوا جو اس زمانے میں بہت زیادہ تھیں۔ کتابوں کا ڈاک محصول کم کرایا تاکہ علمی اور تعلیمی مشاغل بڑھیں مگر ۱۸۶۷ء میں سرسید کے بنارس کے تبادلہ کے ساتھ یہ الیوسی ایشن ختم ہوگئی۔

سرسید کی گہری نظر اور جذبۂ شوق ملک و قوم کی ترقی و فلاح کے لئے نئی نئی راہیں نکالتا رہتا تھا۔ مگر اس کا چلانا اور قائم رکھنا زیادہ تر ان کی ذاتی محنت اور کوشش پر منحصر تھا۔ اس وقت تک لوگوں میں ایسا شوق اور صلاحیت بیدار نہ ہوسکی تھی کہ ایسے کاموں کو سنبھال لیں اس لئے لوگوں کی عدم توجہی کے باعث ایسی اسکیمیں ادھوری رہ جاتی تھیں۔ اس زمانے میں انہوں نے جدید تعلیم کی ترقی اور شمالی و مغربی اضلاع میں اس کی تیز اشاعت کی اسکیم سوچی۔ ۱۸۶۶ء میں ہی تعلیمی کمیٹیاں قائم کرائیں۔ وہ اس طرح کہ زمینداران علی گڈھ کی جانب سے گورنمنٹ میں عرض داشت بھیجی کہ جب علاوہ مالگذاری ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم لیا جاتا ہے تو انصاف یہ ہے کہ تعلیمی کمیٹیوں میں ہمیں شامل کیا جائے اور ہر ضلع کی ایک کمیٹی قائم ہو۔ یہ عرضداشت منظور ہوئی اور تمام اضلاع شمال و مغرب میں ایسی کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے سرسید کا منشا یہ تھا کہ ضلع ضلع کی کمیٹی سے جدید تعلیم سرکاری مدارس کے ذریعے جلد اور بہ آسانی عام ہوسکے۔ مقامی روٗسا اپنی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر اپنے بچوں کی تعلیمی سکیم میں اس کمیٹی کے ذریعہ گورنمنٹ کے ساتھ خود حصہ لے سکیں جس کی وجہ سے اس مسئلے سے انھیں دل چسپی اور لگاؤ پیدا ہو جائے اور علاوہ گورنمنٹ ایڈ کے اس معاملہ میں خود بھی کچھ کر سکنے کے قابل بنیں۔ مگر ان کا یہ منشا، تشنۂ تکمیل رہا کیونکہ ۱۸۷۲ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا حوالہ پیش خدمت ہے۔ ”جس غرض سے یہ کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ ان کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یوروپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جن کو شکست دینا اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں ان موم کی مورتوں کے مانند ہوتے ہیں جو میڈم ٹساؤ Madam Tsad کی نمائش گاہ میں تھیں“[۱] سرسید کی سوشل اصلاح میں چونکہ جدید تعلیم ایک اہم مقام رکھتی تھی اس لئے تعلیمی کاوشیں ان کی تحریک اور خدمات کا ایک بڑا جز تھیں۔

۱۔ حیات جاوید از حالی ص ۸۶ (طبع سوم ۱۹۲۶ء)

۱۸۶۷ء میں جب کہ وہ علی گڈھ میں تھے انہوں نے ورنیکولر تعلیم کی تحریک کی اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے کو عرضداشت بھجوائی کہ (۱) اعلیٰ درجہ کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔ (۲) دیسی زبان میں ان ہی مضمونوں کا سالانہ امتحان ہو جن میں کلکتہ یونیورسٹی کے طلباء انگریزی میں دیتے ہیں۔ (۳) جو سندیں ان طلباء کو ملتی ہیں وہی دیسی زبان میں تعلیم پانے والے طلباء کو بھی دی جائیں۔ (۴) یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹیفک سوسائٹی انجام دے گی۔"۱ اس اسکیم کا شمالی ہند میں بہت چرچا ہوا اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ سرسید نے اردو کو دیسی زبان مان کر یہ اسکیم بنائی۔ یہ واقعہ آج سے سوا سو سال پہلے کا ہے۔ جب کہ اردو عرصہ سے سرکاری زبان کا رول ادا کرتی آرہی تھی۔ انگریزی کے سرکاری دفاتر میں رائج ہونے سے پہلے تمام انگریزی دفاتر اور کچہریوں میں اسی کے ذریعے کام ہوتے تھے۔ اس کے عرصہ دراز کے بعد رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اردو اپنی تمہید میں اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ "مجھ کو اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائے گی اگر میں اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں (اس ادب شریف یعنی) ادب اردو کا صحیح ذوق پیدا کردوں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے۔"۲ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "شروع اٹھارہویں صدی کے مصنفوں نے زبان لاطینی میں اس کو "لنگوا اندوستانیو" کا لکھا ہے۔"۳ یہ شمالی ہند اور دکن میں حیدرآباد کی عام زبان تھی نیز بنگال پنجاب اور دکنی علاقوں، بمبئی، مدراس اور دیگر علاقوں میں کم و بیش عام طور سمجھی جاتی تھی اور ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں مقامی زبانوں کی کثرت ہندوستانیوں کو کثرت گروہ میں منقسم کرتی ہے۔ یہ

۱- حیات جاوید از حالی ص ۸۹ (طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۲- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ تمہید ص ۲۰-

۳- " " " " " ص ۱۱

زبان اس کثرت کو ایک وحدت میں پرو کر اپنا ایک اہم مقام بنا چکی تھی - یہی وجہ تھی کہ سر سید نے اسے دیسی زبان کی حیثیت سے چنا - یہاں زبان کے مسئلے پر بحث نہیں مگر سر سید کی اس رائے کی صحت یا غلطی کو سمجھنے کے لئے ایک اقتباس ضروری ہے جو بابو شیو پرشاد کو سر سید نے زبان کے مسئلے پر ایک خط میں لکھا تھا "میرے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ تمام دنیا میں کوئی اصلی زبان بھی ہو - پس ناچار میں آپ کی اس تحریر سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کی شاید اصلی زبان سے آپ کی مراد ملک کی زبان سے ہوگی اور ہم لوگوں کی نسبت آپ ہندی زبان یا ان اضلاع کی موجودہ مخلوط زبانوں کو ہمارے ملک کی زبان کہتے ہوں گے جس کو میں اردو کہتا ہوں" ۱

اس میں شک نہیں کہ مغربی علوم اور جدید تعلیم کی تیز تر اشاعت کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا اور تعلیمی ترقی کے لئے لازم ہے کہ ملکی زبان میں ترقی ہو مگر یہ اسکیم کئی وجوہ سے تکمیل نہ پا سکی اور سر سید کو بعد میں اس اسکیم کو چھوڑ دینا بہتر معلوم ہوا - انگریزی سیاست نے زبان کے مسئلے کو جو ابتدا ہی میں سیاست کا رنگ دیدیا تھا، اس کی تفصیل دوسرے باب میں آ چکی ہے - سر سید کو یہ بھی محسوس ہوا کہ گورنمنٹ کلکتہ یونیورسٹی تو ذکر انگریزی کو سکنڈ لنگویج بنا دینا چاہتی ہے اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ بغیر انگریزی زبان کی پکی تعلیم کے مغربی علوم اور سائنس پر مکمل طور سے حاوی ہونا ممکن نہیں ہے - اس لئے بنارس انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسہ میں جو اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ہوا تھا، تقریر کی جس میں یہ کہا کہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے الیوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا اس کی ہرگز یہ رائے نہیں کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھائی جائے اور اس کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ وہ چاہتی ہے انگریزی تعلیم کا یہ دستور جاری رہے - اور اس کے ساتھ انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعہ بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں ۲ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں جب لفٹننٹ گورنر بنارس انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھے پھر اس تقریر کا اعادہ کیا - مجوزہ

۱- مکتوبات سر سید مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی ص ۲۲ (بنام سیوا پرشاد جی)

۲- حیات جاوید - ص ۹۱ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۳۲ء)

ورنیکولر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے "[1] اور یہ امر مسلم ہے کہ ملک میں عام تعلیمی ترقی اور Masses کی تعلیم کے لئے ورنیکولر کی تعلیم لازمی ہے۔

بنارس کے تبادلے کے بعد سرسید نے عوام کے فائدے کے پیش نظر ہومیوپیتھک علاج کی پرزور حمایت کی۔ وہ جانتے تھے کہ غریب ہندوستانی عوام کے لئے اس سے سستا اور بہتر طریقہ علاج نہیں۔ چنانچہ ہومیوپیتھک طبابت کو ہندوستان میں عام کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کے پریسیڈنٹ مہاراجہ بنارس تھے اور سیکریٹری سرسید، چنانچہ ستمبر ۱۸۶۷ء میں ان کی کوششوں سے بنارس میں ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کے نام سے شفاخانہ کھل گیا۔ سرسید نے امکان بھر لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ شخصی طور پر اپنے دوستوں کو جو کسی مرض میں مبتلا تھے، بنارس بلایا۔ بعضوں کو وہاں سے دوائیں بھجوائیں۔ "پہلے ہی مہینے میں پانچ سو سولہ بیمار معالجہ کے لئے ہاسپٹل آئے حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقہ علاج سے واقف نہ تھا"[2] اس کے علاوہ اس طریقہ علاج کے مفید اور بے خطر ہونے پر نیز ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ پر لکچر دیئے۔ اس کے اصول کے مطابق ایک رسالہ ہیضہ کے علاج پر لکھا۔ غرض جو کچھ وہ ہومیوپیتھک طبابت کی ترقی کے لئے کرسکتے تھے کیا۔

۱۸۷۸ء میں جب سرسید کو لارڈ لٹن Lord Lytton نے ویسرے کی لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا تو اپنی چار سالہ ممبری کے زمانے میں بھی وہ ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے ایک ایکٹو ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ پہلے ہندوستانی ممبر تھے جنھوں نے مفید قوانین پاس کرائے۔ چنانچہ قانون ٹیکہ چیچک منظور کرایا کہ ٹیکے کا قاعدہ لازمی کر دیا جائے۔ لفٹنٹ گورنر پنجاب اس کے سخت مخالف تھے پھر بھی یہ بل پاس ہوگیا اور اس کے مطابق عمل درآمد ہو کر عوام کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ قانون تقرر قاضیان منظور کرایا۔ قانون وقف خاندانی بھی پیش کرنا چاہتے تھے مگر بعض وجوہات سے

۱۔ حیات جاوید۔ ص ۹۱ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۲۔ اخبار پایونیر مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۷ء بحوالہ حیات جاوید ص ۹۲

پیش نہ ہو سکا۔ ۱۸۸۲ء میں سرسید ایجوکیشن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے مگر کمیشن کی کارروائیوں کا طریقۂ کار ان کی رائے کے برخلاف تھا اس لئے مستعفی ہو گئے۔ سرسید کی ادبی خدمات بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں انھوں نے اردو ادب کو جو نیا رنگ روپ اور نکھار دیا وہ اس کے لئے ایک نئے جنم کے مترادف ہے۔ ان کی ادبی خدمات کی تفصیل ایک الگ باب میں آئے گی لہٰذا یہاں ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں۔

سرسید کی تمام علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ہماری قومی اور سماجی زندگی کے ناسور کا کون سا حصہ تھا جس پر ان کا نشتر جراحی نہ چلا ہو اور جس کی صحت کے لئے دل و جان سے انھوں نے کوشش نہ کی ہو۔ اس کی اہمیت صرف یہی نہیں کہ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ بلکہ انہوں نے زمانے کی نبض پہچان لی تھی اور نبض شناسی کے ساتھ قوم کے لئے جو نسخہ تجویز کیا تھا وہ تلخ سہی مگر زود اثر ضرور تھا۔ انھوں نے وقت کی آواز سنی اور قوم کو اس سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ یوں تو وقت کی رفتار کے ساتھ زمانے کی حالت میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں مگر قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں بعض اوقات ایسا وقت بھی آتا ہے جو یکدم سے حالات کو پلٹ دیتا ہے۔ سرسید کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا ہی بحرانی دور تھا جسے نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ سرسید کی شخصی عظمت اور ان کی خدمات کی اہمیت یوں ہے کہ انھوں نے ایسے بحرانی دور میں ملک و قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا جس چیز کو اس کے لئے مفید سمجھا اس کے حصول کی کوشش کی جس بات کو فائدہ مند جانا اس میں کوشاں ہوئے۔

ایسے ہنگامی اور تیزی سے بدلتے ہوئے دور میں سرسید نے ایک طرف قوم کو زندہ رہنا سکھایا اور ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا چراغ جلایا۔ دوسری طرف آگے بڑھنے کے لئے راہ ہموار کر دی۔ اور ہماری تاریخی زندگی میں ایک نیا باب کھول کر بڑا اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ یہیں ان کی خدمات کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ انھیں کی راہنمائی کے نتیجہ میں ایک مردہ قوم میں جان آ گئی۔ اس پژمردہ اور قنوطی دور میں امید و بیم کی کرنیں چمکیں اور سب کی نگاہیں اس نئے افق پر اٹھ گئیں جہاں نئے زمانے کا آفتاب اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اس طرح ہماری سوشل زندگی میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے کے لئے صلاحیت اور اس کے پورا کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ سرسید

کی شدید مخالفت ہوئی۔ کیونکہ یہ صرف سرسید اور ان کے معترضین کی مخالفت نہ تھی بلکہ اس میں قدیم وجدید کی تاریخی کشمکش کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ ترقی اور آزادی رائے کی رجعت پسندی اور قدامت سے جنگ تھی اور یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی مخالفت کے طوفان نے خود ان کے مقاصد کی تکمیل میں بڑا کام کیا اور غیر محسوس طور پر سرسید کے خیالات کی تشہیر ہوتی رہی۔ جس کے فوائد میں جدید علوم و سائنس سے آگاہی پیدا ہوئی۔ مغربی علوم کے حصول کا ذوق بیدار ہوا۔ قدیم قدروں کی خامیوں سے نگاہیں آخرکار آشنا ہونے لگیں۔ سیاسی معاملات پر اظہار خیال کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ تعلیم کا چرچا عام ہوا۔ اور یہ سارا انقلاب اولین سرسید کی ان زبردست کاوشوں کا نتیجہ خیز اثر تھا۔ گویا ان کی آواز ایک بانگ جرس تھی کہ سوتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اور اس صدا سے سیکڑوں ایسے بیدار ہوئے جنھوں نے نئے قافلے کو تیزی سے گزرتے دیکھ لیا اور عنان سنبھال کر اس کے ساتھ لگ گئے۔

سرسید کی یہ کاوشیں بغیر سوچا سمجھا جذباتی عمل نہ تھیں بلکہ انہوں نے سوشل اصلاح کے لئے بڑی بڑی تمناؤں کے ساتھ منصوبے باندھے اور اعلیٰ خاکے کھینچے تھے۔ جن کی جزئیات میں وقتاً فوقتاً حالات کے مطابق تبدیلیاں بھی کرتے رہے۔ مثلاً پہلے وہ دیسی زبان میں تعلیم کے حامی تھے مگر بعد کو محسوس کیا کہ جس تیزی سے سائنس کی ترقی ہوتی جاتی تھی اور نئے علوم و فنون کے اضافے ہوتے تھے، اس کے پیش نظر ان علوم کی تحصیل و ترقی کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی تھی۔ لہٰذا جب گورنمنٹ نے پنجاب میں ورنیکولر یونیورسٹی کی وسکیم بنائی جس میں عربی فارسی اور قدیم مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام ہو تو سرسید نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اسی طرح سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے ترجمہ کا کام جاری کیا۔ مگر پھر انھیں خود احساس ہوا کہ نرے ترجمہ سے کام نہیں چل سکتا جب تک کہ علوم و فنون اور ادبی و تعلیمی ترقیوں کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ نہ جاری ہو۔ جس کے لئے مغربی علوم اور نئے طرز کی تعلیم کی ترقی لازمی ہے۔

چنانچہ مکمل توجہ اسی پر مبذول کر دی اور جدید اعلیٰ تعلیم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کو انھوں نے مرکزی اہمیت دی۔ مگر ملک میں اس چیز کو عام کرنے کے لئے خود انھیں ان جدید قدروں کو اچھی طرح سمجھنا لازمی تھا جو مغرب کی ترقی کا سبب بنیں۔ انہوں نے غور کیا اور محسوس کیا کہ بغیر ولایت کا سفر کئے اور وہاں جا کر قریب سے عام مغربی زندگی کا مطالعہ

گئے اور ان کے عادات و رسوم، ان کے طرز تعلیم اور ان کی ترقی کی اسپرٹ کا جائزہ لئے ہوئے وہ مکمل طور پر یہ کام انجام نہ دے سکیں گے۔ ان کی خواہش ہوئی کہ وہ خود ولایت جاکر قریب سے وہاں کی تعلیم اور اصول و طریقۂ تعلیم کی واقفیت حاصل کریں اور پھر قوم کی اعلیٰ تعلیم کا ایک خاکہ اسی طرز پر بنائیں۔ اس کے لئے وقت اور روپیہ دونوں درکار تھا۔ ملازمت کی وجہ سے فرصت بھی نہ تھی۔

ان کی اس خواہش کی تکمیل میں دو چیزیں مددگار ثابت ہوئیں۔ ان کے لڑکے سید محمود کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت جانے کو گورنمنٹ سے وظیفہ ملا دوسرے ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" نے ان کے دل میں اس کا جواب دینے کا خیال پیدا کیا مگر ہندوستان میں اس کے لئے جیسا وہ چاہتے تھے کافی مواد نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے لئے جن مستند اور قدیم کتابوں کی ضرورت تھی وہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ لہٰذا ان دونوں باتوں سے ان کے خیال میں یورپ کے سفر کی تحریک زیادہ ہوئی اور انھوں نے یورپ کے سفر کا ارادہ کرلیا۔ تاکہ اپنے اصلاحی مقصد کو پورا کرسکیں اور یہیں سے ان کی زندگی کا وہ تیسرا اہم دور شروع ہوتا ہے جس میں ان کی تمام خدمات ایک اہم تحریک کے سانچے میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر و قیام انگلینڈ کے اخراجات کے لئے اپنا سارا اثاثہ بیچ ڈالا حتیٰ کہ اپنا مکان بھی فروخت کردیا۔ ملازمت سے ایک سال کی چھٹی لی اور عازم سفر ہوئے۔

"سرسید ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انہیں کے گھروں اور انہیں کے ملکوں میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت جاکر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامی دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے لئے تھا رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔" ۱

سرسید نے آغاز سفر سے ہی اپنے اطراف جوانب اور تمام چیزوں پر غور کرنا شروع کردیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "مجھے اس بات کے دریافت ہونے سے کہ عدن تک ہندو آتے جاتے ہیں اور جہاز،

۱۔ مسافران لندن ص ۲۱۲۔ نواب محسن الملک حاجی محمد اسمٰعیل کو لکھتے ہیں۔

میں بیٹھنے سے ان کی ذات اور مذہب میں کوئی فرق نہیں آتا نہایت خوشی ہوئی۔ خدا ہمارے ملک کے ہندوؤں کو بھی یہ دن نصیب کرے۔" ۱ انگلینڈ جاتے ہوئے جہاز میں مس کارپنیٹر Carpenter سے ان کی ملاقات ہوئی۔ موصوفہ ہندو دھرم کی بہت مداح تھیں اور ساری عمر ہندوستان میں رہ کر ہندو عورتوں کی اصلاح کی کوشش کرتی رہیں۔ سرسید لکھتے ہیں۔

"بہرحال میں خدا سے چاہتا ہوں مس کارپنیٹر Carpenter کی کوششیں کامیاب ہوں اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے جو دونوں اصل میں ایک ہیں روشن ضمیری حاصل کریں۔" ۲

ان کا سفرنامہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آغاز سفر ہی سے انھوں نے ہر چھوٹی بڑی چیز کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ ہر مفید اور اچھی چیز کے لئے خواہش مند ہوئے کہ وہ ان کے ملک میں بھی ہوتی۔ علوم و فنون علم و عقل کی باتوں یا اچھے عادات و اطوار جہاں دیکھنے میں آئے سرسید بے چین ہوئے کہ کاش ان کی قوم میں بھی یہ باتیں ہوتیں۔ ان کی ان تحریروں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ملک کے سچے خیر خواہ تھے۔ بلا لحاظ مذہب و ملت ہندوستانی قوم کی بھلائی اور ترقی کے خواہاں تھے۔ مسلمانوں پر خصوصی توجہ اس لئے دی کہ وہ سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے اور بڑی حالت میں تھے۔ ان کا سفرنامۂ لندن صرف حالات سفر ہی نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ہر نئی اور عمدہ چیز کو اپنانے اور اپنے ملک میں عام کرنے کی خواہش پر مشتمل تھا۔ انھوں نے تمام چھوٹے بڑے واقعات سے جو انھیں سفر میں پیش آئے سبق سیکھا ہر عمدہ بات سے نصیحت حاصل کی اور ہر حادثہ سے عبرت آموز نتیجہ نکالا۔ اور حتی الامکان ہر ممکن کوشش کی کہ قوم مفید چیزوں کو اپنا کر ترقی کرے۔

اپنے ایک طویل خط میں راجہ جے کشن داس کو لکھتے ہیں۔" جو کچھ میں نے یہاں دیکھا اور دیکھتا ہوں۔ امکان نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں وہم و گمان میں بھی آ سکتا۔ جو کوئی میرا ہم وطن میری اس تحریر کو سچی اور واقعی حقیقت نہ سمجھے آپ یقین کیجئے کہ اس کی مثال مینڈک اور مچھلی کی سی ہے۔ . . . . . .

۱۔ مسافران لندن ص ۹۱

۲۔ " " ص ۶۲

".... میں ان باتوں پر مطلق خیال نہیں کرتا جو لسبب خاصیت ملک کے ایک دوسرے حصے میں مختلف ہیں۔ بلکہ میں صرف اخلاقی اور تعلیمی اوصاف انسانی صفائی اور خوش سلیقگی اور ہنر و کمال کا ذکر کرتا ہوں۔ جو تعلیم و تربیت سے علاقہ رکھتی ہیں"۔۱ اسی خط میں انگریزی طور طریقے کی خوبی بیان کر کے لکھتے ہیں:

"یہ تمام نتیجہ ہے زن و مرد کے عموماً تعلیم یافتہ ہونے کا"۔۲ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے حامی ہی نہیں بلکہ عورت و مرد کی برابر کی تعلیم کے قائل تھے۔ مگر یہاں تو رونا یہ تھا کہ لڑکوں ہی کی تعلیم سے قوم غافل ہے اور انھیں کی مغربی تعلیم کے لئے آفت برپا تھی۔

سرسید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور ایک سال رہ کر ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔ اس ایک سال کے عرصے میں انھوں نے کیا کچھ نہ کر ڈالا۔ ولیم میور William Muir کی کتاب کا جواب خطبات احمدیہ کے نام سے تصنیف کیا۔ کیمبرج جا کر خاص طور پہ طریقۂ تعلیم اور درس و تدریس رہن سہن اور تربیت کا بغور جائزہ لیا۔ دوسری قوموں کی ہر اچھی بات کو بنظر تحسین دیکھا۔ اور نہایت بے قراری کے ساتھ یہ تمنا کی کہ ہندوستانیوں میں بھی یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں۔ بڑے بڑے لارڈ اور ڈیوکز سے بھی ملے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دعوتوں میں بھی شریک ہوئے۔ حکومت کے انتظام اور طریقہ کو دیکھا۔ متوسط طبقہ اور عوامی زندگی کا جائزہ لیا۔ ان کی روزمرہ زندگی کا مطالعہ اور ہندوستانیوں سے اس کا موازنہ کیا۔

جب لندن کے قریب کلفٹن کے عجیب معلق پل کو دیکھنے گئے تو بے حد متاثر ہوئے۔ اور لکھا "جب یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کام جس کا انجام دینا شاید بادشاہ کی قوت سے بھی خارج تھا صرف رعایا کی ہمت، سخاوت اور علم و ہنر سے انجام پایا ہے، تو اس قوم کی اور بھی قدر و منزلت دل میں نقش پذیر ہوتی ہے اور جب خیال آتا ہے کہ یہ پل نہ کسی

۱۔ بحوالہ مکاتیب سرسید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین ص ۱۹-۱۸ (از اخبار سائنٹفک سوسائٹی مطبوعہ ۱۹ نومبر ۱۸۶۹ء)

۲۔ " " " " " " " " " " ص ۲۰

بادشاہ کا قلعہ ہے نہ کسی امیر کا محل نہ کسی کے باپ دادا کا مقبرہ نہ کسی راجہ بابو کی چھتری بلکہ صرف رفاہ عام کے لئے بنایا گیا تو کیا کچھ اثر دیکھنے والوں کے دل پر ہوتا ہو گا۔ خصوصاً اس بدبخت ہندوستانی پہ جو اپنے ملک کی بہبودی کا جوش رکھتا ہو اور اس کے عوض اپنے ہم وطنوں کی سختی سہتا ہو اور اپنے ہم وطنوں کو خودغرضی نفس پروری، حسد و تعصب کے دریا میں ڈوبا ہوا یقین کرتا ہو۔ اب میں اپنے ہم وطنوں سے نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ یہ لوگ آدمی ہیں یا ہم جو صرف حیوانوں کی طرح اپنی خودغرضی میں مبتلا ہیں اور پھر صاحب ہمت ایسے کہ ہر کام میں کہتے ہیں کہ گورنمنٹ بندوبست کرلے۔ لڑکیوں کے پڑھانے کا بھی گورنمنٹ بندوبست کرے، ان کو ان کا مذہب سکھانے کا بھی گورنمنٹ بندوبست کرے۔ افسوس صد افسوس ہزار افسوس ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ . . . . .'' ۱

یہاں پر ان کے خیال سیلف ہیلپ کی یاد آتی ہے جس کا ذکر انھوں نے اکثر جگہ کیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ حصول تعلیم کے لئے صرف گورنمنٹ کی مراعات پر نظر نہ رکھیں بلکہ اپنے شوق اور محنت سے خود آپس میں مل کر تعلیم کا بندوبست کریں۔ اس طرح عالی ہمتی سے کام لے کر ایک دوسرے کے کام آئیں اور ملکی و قومی ترقی کی بنیادوں کو مضبوط تر بنائیں چنانچہ اسی خیال کی بنیاد پر سرسید نے ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ کھولنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ انگلینڈ کے زمانۂ قیام میں کیمبرج یونیورسٹی کے طرز تعلیم و انتظام پر غور کرتے ہوئے اسی طرز پر اعلیٰ تعلیم کے لئے درسگاہ کا خاکہ ذہن میں بنایا تھا تاکہ ہندوستان لوٹنے پر اسی طرز کی درسگاہ یہاں قائم کر سکیں، جس میں اعلیٰ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی تعلیم اور ان کی خصوصی ضروریات تعلیم پر بھی نظر رکھی جائے تاکہ عام مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف توجہ اور رغبت پیدا ہو اور وہ پوری طرح اس سے مستفید ہو سکیں۔

علاوہ ازیں انگلینڈ کے زمانہ قیام میں ہی انہوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے میگزین "ٹیٹلر" Tetlor اور اسپکٹیٹر Spectator کا مطالعہ کیا اور اسی طرح کا ایک رسالہ قومی اصلاح کے لئے ہندوستان میں نکالنے کا انھیں خیال ہوا چنانچہ ایک سال کے قیام کے بعد جب وہ

۱۔ از مسافران لندن مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۲۱

ہندوستان واپس آئے تو آتے ہی انھوں نے اپنے اصلاحی مشن کو نئے سرے سے تیزی کے ساتھ عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں وہ سید حامد کے ساتھ واپس آئے اور ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا نمبر نکالا۔ اس کے اڈیٹر اور مینیجر خود سرسید تھے۔ تہذیب الاخلاق سرسید کے عظیم ادبی اور سوشل کارناموں میں شامل ہے۔ یہاں تہذیب الاخلاق کے ادبی پہلوؤں سے قطع نظر صرف اس کی سوشل خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کے ذریعہ انھوں نے عوام کے رجحانات اور خیالات کو سدھارنے کی کوشش کی اور سب سے زیادہ مذہبی عقائد اور خیالات کے اظہار پر ان کی لے دے ہوئی۔ اس کے جاری کرنے کا مقصد خود سرسید کے الفاظ میں یہ ہے۔ "تہذیب الاخلاق کا پرچہ ابتدا میں اس لئے جاری کیا گیا کہ ہندوستانیوں کے دل جو مردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جاوے۔ ہندوستان کی حالت بند پانی کی سی ہو گئی تھی جس سے طرح طرح کے نقصان اور مضرت کا اندیشہ تھا اس کے واسطے ایک چپو کی ضرورت تھی کہ وہ اس کو ہلادے اس نے اپنا کام کیا۔ اب تحریک پیدا ہو گئی ہے ہندوستانیوں کی زبانوں اور قلموں سے قومی ترقی اور ہمدردی کے الفاظ نکلنے لگے ہیں۔ اخباروں میں قومی بھلائی اور قومی ترقی کے الفاظ بلکہ آرٹیکل نکلنے لگے ہیں۔ جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس پرچہ نے اپنا کام پورا کیا۔" [1]

اس سلسلے میں مولوی نذیر احمد کی یہ تحریر دیکھنے کے لائق ہے جس میں انھوں نے تہذیب الاخلاق کی خدمات گنائی ہیں اور اس کے فوائد کا ذکر کیا ہے جو دراصل سرسید کا کارنامہ ہیں حالانکہ مولوی نذیر احمد سرسید کے مذہبی نظریات سے اتفاق نہ رکھتے تھے پھر بھی تہذیب الاخلاق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ اس کے تصرفات تھے کہ الفاظ قوم و قومی ہمدردی و قومی خیر خواہی ہمارے روزمرہ میں داخل ہوئے یہ اسی کے تصرفات تھے کہ مسلمان آپ اپنی عزت کرنے لگے۔ یہ اسی کے تصرفات تھے کہ اردو لٹریچر لفاظی، جھوٹ، مبالغہ، خوشامد اور ابتذال سے پاک ہو گیا۔ یہ اسی کے تصرفات تھے کہ ایشیائی شاعری کے ناپاک خیالات کی جگہ نیچرل شاعری نے

۱۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ از محمد امام الدین گجراتی (درجواب ایڈریس نوجوانان مسلمانان جالندھر ۶ر فروری ۱۸۸۴ء) ص ۳۱۲ (نولکشور پریس لاہور)

رواج پایا۔

یہ اسی کے تصرفات تھے کہ علوم کی قدر ہونے لگی۔

یہ اسی کے تصرفات تھے کہ لوگوں میں اپنے خیالات آزادی سے پیش کرنے کی جرأت ہوئی۔

یہ اسی کے تصرفات تھے کہ دلوں میں تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔

یہ اسی کے تصرفات تھے کہ مسلمانوں میں قوت اجتماعی کی تحریک پیدا ہوئی۔

یہ اسی کے تصرفات تھے کہ مسلمانوں نے محمڈن کالج قائم کیا اور نہ صرف قائم کیا بلکہ اس کو چلایا۔ اور ایسا چلایا کہ سرکاری کالج اس کے آگے چیں بول گئے۔

غرض اگر تہذیب الاخلاق جاری رہا تو نہ وہ محمڈن کالج کو انڈیا کا کیمبرج اور آکسفورڈ بنادے گا۔ بلکہ ایسے ایسے کتنے کالج کھڑے کر دے گا۔"[1] غرض تہذیب الاخلاق کی ادبی اہمیت کے علاوہ اس کے دیگر بے اندازہ فوائد کا نچوڑ مندرجہ بالا الفاظ میں ملتا ہے۔

اپنے انگلینڈ کے زمانۂ قیام میں سرسید نے مغربی سماج اور اس کی خوبیوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ مشرق کے محدود رواجی تصورات کے بجائے مغرب کی آزادیٔ رائے قدیم علوم کی قدر کے ساتھ نئے علوم کی تحقیق، زن و مرد کی برابری کی تعلیم، اجتماعی تصورات اور باہمی امداد حصول ترقی کا جذبہ، سیلف ہیلپ کے اصول پر ملکی و قومی فائدے کے تعمیری کام، اعلیٰ تعلیم کا عام انتظام، تعلیم عامہ کی کثرت، علم و عقل کی روشنی میں نتائج برآمد کرنا، بڑی بڑی تعلیم گاہوں میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا پورا اہتمام، قومی رہن سہن میں یکسانیت، مذہبی عقائد میں محض تقلید کے بجائے تحقیق و عقلی دلائل کا استعمال، صحافت کے ذریعہ ذہنی اصلاح و نشو نما اور روزمرہ کی خوبی، عادات، پوشاک کی صفائی، پابندی، اوقات، علم و ادب کی ترقی کی لگن، غرض یہ سب وہ خوبیاں تھیں جنھیں سرسید اپنے ملک و قوم کی سماجی زندگی کا اہم حصہ بنا دینا چاہتے تھے۔ مغربی سماج کے قریب سے مطالعے کے بعد وہ اس کی خوبیوں اور فوائد سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ وہ بہت غور کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ اعلیٰ تعلیم و تربیت ہی وہ بنیادی چیز ہے جس کے ساتھ سماج میں ہر طرح کی خوبیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور جس کے نتیجہ میں قومیں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اصلاحی خاکہ میں عملی طور پر اسی کو مرکز بنایا۔

١۔ بحوالہ تہذیب الاخلاق ١٣١٢ھ در مضمون "تہذیب الاخلاق" از مولوی نذیر احمد۔

اور انگلینڈ سے واپسی کے بعد اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز کر دی۔

اس کالج کے ساتھ ساتھ سرسید نے دیگر اصلاحات کی کوششیں بھی جاری رکھیں۔ یہ کاوشیں قلمی اور علمی ذرائع سے ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کی خصوصی اصلاح کے پیش نظر ان کی سماجی زندگی کے ہر گوشہ پر قلمی جراحی اور تنقید سے کام لے کر اپنا اصلاحی مشن جاری رکھا۔ رسمی مذہبی عقائد کی تحقیق اور ان کی تردید کھلم کھلا شروع کر دی۔ مذہبی مضامین و تفسیر القرآن کا سلسلہ جاری کیا۔ مذہب میں علم و عقل اور تحقیق سے کام لینے کی اہمیت بتائی۔ رسم و رواج اور رہن سہن، عقائد اور عادات و اطوار پر کڑی تنقیدیں کیں۔ اخلاق و عادات کو سنوارنے پر توجہ دلائی۔ تحقیقی علوم کی طرف متوجہ کیا۔ ہر نئی چیز سے اندھی نفرت کی مخالفت کی۔ نئے علوم کی خوبیوں اور ضرورت کی وضاحت کی۔ غرض ایک مسلسل قلمی معرکہ قائم رکھا جو ان کی تفسیر و مضامین کے علاوہ زیادہ تر تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انجام پاتا رہا۔ یہی نہیں اردو شعر و ادب کی ترقی میں کوشاں ہوئے اور اسے دیکھتے ہی دیکھتے عروج کی منزلوں پر پہونچا دیا۔ سرسید کی اصلاحی کاوشوں خصوصاً عقائد پر تنقید کو مسلم حلقوں میں بہت شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس کی بڑی مخالفتیں ہوئیں۔ مگر انجام کار سرسید اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنی پر خلوص کوششوں کے ذریعہ نئی فضا تیار کر دی لوگوں میں سوچنے اور غور کرنے کی عادت ہوئی۔ مسلم سماج کا کوئی گوشہ ان کی اصلاحی ضربوں سے نہ بچ سکا۔

سرسید چونکہ ایک اعلیٰ درسگاہ و تربیت گاہ کھولنے کا قصد کر چکے تھے اس لئے انہوں نے سب سے پہلے ان اسباب پر غور و خوض کرنا شروع کیا جو مسلمانوں کو جدید تعلیم میں مانع تھے اس کے لئے انہوں نے بنارس میں ایک کمیٹی "خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کے نام سے بنائی۔ جس کا پہلا جلسہ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو ہوا اور جس میں سب سے پہلے خود انھوں نے چندہ دیا۔ ایک انعامی اشتہار کے ذریعہ مسلمانوں کو اس موضوع پر لکھنے کی دعوت دی کہ انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے عام طور پر لوگ اٹھا رہے ہیں اور مسلمان اس سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب معلوم کرنے کی طرف خیال ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۳۲ مضامین اس انعامی مقابلے میں آئے اور انھیں مضامین کے ذریعے سرسید نے ایک عمدہ رپورٹ مرتب کی۔ جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) سمجھدار مسلمان قدیم خیالات اور تعصبات برائے جدید تعلیم کے خلاف ہیں۔

(۲) سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔

(۳) گورنمنٹ مسلمانوں کے لئے موجودہ طریقۂ تعلیم میں کوئی تبدیلی بھی کرے تو بھی مسلمانوں کی سب ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔

(۴) جن خیالات کے باعث وہ اپنی اولادوں کو ان مدارس میں نہیں بھیجتے ان میں سے کچھ واجب اور کچھ ناواجب ہیں۔

(۵) مسلمانوں کو قدیم علوم کے برقرار رکھنے اور جدید تعلیم کے حصول کے لئے سیلف ہیلپ کی ضرورت ہے۔

اس طرح سرسید نے صحیح طور پر ان اسباب کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی جن کی وجہ سے مسلمان جدید تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ یقیناً سرسید کی یہ کوشش بارآور ہوئی۔

۱۸۷۲ء میں انہوں نے "خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم" بنارس میں چندہ جمع کرنے کے لئے قائم کی اس کے سکریٹری خود بنے اور چندہ جمع کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ وائسرائے اور گورنر جنرل ہند نے ذاتی طور پر مغربی علوم کے لئے دس ہزار دینے کا وعدہ کیا ولیم میور William Muir نے ایک ہزار دیا۔ اس غرض کے لئے باوجود عظیم مصروفیات کے سرسید نے خود تمام شمالی ہندوستان کا دورہ کیا۔ شہر بہ شہر تقریریں کیں نیز چندہ کے لئے لوگوں کو تلقین کی۔ پٹنہ کے ایک جلسہ عام کی تقریر میں فرماتے ہیں "بے علمی، مفلسی کی ماں ہے جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ اب تم اپنی قوم کے حال پر غور کرو کہ یہ بدبخت دن ان پر آگئے ہیں۔ بڑے بڑے قدیمی خاندان سب گر پڑے ہیں۔ تمام قوم پر مفلسی اور محتاجی اور قرض داری اور ذلت چھا گئی ہے"۱ اس وقت سرسید نے اپنے اصلاحی کاموں کو منظم صورت میں ڈھالنا شروع کیا۔ اپنے بنیادی اصول قومی تعلیم و تربیت کا سامان بہم پہنچانے کی طرف توجہ مبذول کردی کیونکہ قوم کی صحیح تعلیم اور ذہنی تربیت ہی دوسری تمام کمزوریوں کا صحیح علاج تھا۔ اس بنیادی مقصد کے لئے کیمبرج اور آکسفورڈ کے طرز پر ایک اعلیٰ قومی درسگاہ کھولنے کا عزم کرلیا اور آخر کار بے پناہ محنت اور کوششوں سے بمقام علی گڑھ ایک اعلیٰ تعلیم گاہ و تربیت گاہ کے قیام میں کامیاب ہوئے جو ایم۔ اے۔ او کالج کی صورت میں وجود میں آئی۔

۱۔ تہذیب الاخلاق ۵ اربیع الثانی ۱۲۹۰ھ ہجری۔

اس کالج کے اثرات اتنے وسیع اور گہرے تھے کہ سرسید کا پر زور اصلاحی مشن علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوگیا۔

علی گڑھ تحریک کی نوعیت ایک خالص اصلاحی مشن کی تھی۔ ایم اے او کالج اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں کو مرکزی حیثیت تو دی جاسکتی ہے مگر اس کی حد بندی اتنی آسان نہیں۔ یہ وہ تحریک تھی جس نے پہلی بار شمال مغربی ہندوستان میں نئے مغربی علوم و سائنس کا چرچا عام کیا انگریزی تعلیم کی ضرورت و اہمیت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ایک اعلیٰ درسگاہ ہی نہیں، پہلی بار ایک قومی تربیت گاہ ملک کے لئے تعمیر کر دی اور تہذیبی وحدت کا احساس دلایا۔ نئے قومی تصورات اجاگر کئے۔ انیسویں صدی کی یہی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں ایک خصوصی انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی نئی ذہنی نشو و نما میں پورا حصہ لیا۔ عقائد مذہبی میں سوچنے اور سمجھنے کی نئی راہ بنائی۔ افکار و اعمال کا نیا خاکہ پیش کیا۔ زبان و ادب کی ترقی کے دروازے کھول دئے۔ علم و ادب میں تحقیق و تنقید کو اور فکر و عمل میں اجتماعی تصورات کو مطمح نظر بنایا۔ جمہوری نظام اور اس کی ضرورتوں سے عام آگاہی پیدا کی۔ تقلید محض پر (خواہ وہ قدیم کی ہو یا جدید کی) عقل و شعور کی مہریں ثبت کر دیں۔ غرض یہ تحریک ملک کے لئے ایک اہم نشان راہ اور مسلمانوں کے لئے نئے دور کا پہلا روشن چراغ تھی۔

علی گڑھ کی اس مشہور درسگاہ کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے لئے کھلا تھا مگر مسلمانوں کی خصوصی ضرورت کے پیش نظر ان کی وقتی ضروریات تعلیم کا پہلی بار اس درس گاہ میں خاص خیال رکھا گیا تاکہ مسلمان نئی تعلیم کی طرف توجہ کریں۔ اس طرح مسلمانوں میں جدید تعلیم کا چرچا ہونے لگا۔ دورۂ پنجاب کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

"میری مراد قومی عزت سے ایسی حالت کا ہونا ہے جس میں قوم درجہ بہ درجہ آسودہ حال ہو۔ اکثر لوگ زیور علم و ہنر و اخلاق سے آراستہ ہوں۔ علوم و فنون جو دنیا میں جاری ہیں صنائع و بدائع جو روز بروز دنیا میں پھیلتے جاتے ہیں اس قوم میں موجود ہوں۔"[1] غرض سرسید نے اعلیٰ اور جدید تعلیم ہی کو قوم کے مرض کا اصلی نسخۂ شفا تجویز کیا۔ ایسے مدرسۃ العلوم کے لئے ہر ممکن کوشش میں لگ گئے جس کا نصاب اپنے اختیار میں ہو، ایسی درس گاہ جہاں تمام مغربی علوم

۱۔ روئداد جلسۂ پنجاب (از تہذیب الاخلاق ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۹۰ ہجری)۔

اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی ہو اور مفید مشرقی علوم بھی سکھائے جاسکیں۔ جہاں تعلیم ہی نہیں ذہنی اور اخلاقی تربیت اور محبت و اخوت کا سبق بھی دیا جاسکے۔ یہی خاکہ ذہن میں لے کر انھوں نے مدرسۃ العلوم کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور آخر دم تک سچے درد و خلوص اور عزم و ہمت سے کام کیا اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک قلیل عرصہ میں لوگوں کو ایک عظیم تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔

۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلہ تعلیم بہ طرز مغربی مرتب کر کے مجوزہ کالج کے لئے پیش کی جو متفقہ طور پر کمیٹی کے تمام ممبران نے پسند کی اور علی گڈھ کا مقام اس مدرسہ کے لئے تجویز ہوا چونکہ کالج کے لئے زیادہ رقم کی ضرورت تھی جس کے لئے موجودہ چندہ ناکافی تھا اور مسلمانوں میں اس بات پر بحث چل رہی تھی کہ آیا سرسید جیسے مذہبی عقیدہ رکھنے والے کا کھولا ہوا کالج مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لئے جائز ہوگا؟ کیا ایسے کالج میں مسلمان اپنے بچوں کو بھیجیں؟ سرسید ایک طرف تو برابر مضامین کے ذریعہ یہ خیال ظاہر کرتے رہے کہ ان کے شخصی عقیدہ کو کالج کی تعلیم سے بالکل سروکار نہ ہوگا۔ دوسرے مدرسہ کی تعلیم کا مکمل نصاب اور طریقۂ تعلیم و تربیت کا خاکہ شایع کیا تاکہ لوگوں کو اس سے تشفی ہو۔ تیسری طرف یہ تجویز ہوئی کہ اسی خاکہ کے مطابق ابتدائی مدرسہ کھول دیا جائے۔ تاکہ اس کے طریقۂ تعلیم سے لوگوں کو اطمینان ہوجائے۔ لہٰذا مئی ۱۸۷۵ء میں ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے روز اس مدرسہ کا افتتاح کر دیا گیا۔ اور یکم جون سے جماعت بندی بھی ہوگئی۔

۱۸۷۶ء میں سرسید پنشن لے کر علی گڈھ آگئے کہ سرکاری ذمہ داریاں اس کام میں حارج تھیں۔ اس وقت سے لے کر آخر دم تک تن من دھن سے قومی خدمت انجام دیتے رہے اور خصوصی طور پر قومی تعلیم کی بنیادی ضرورت کی تکمیل و اشاعت میں لگ گئے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "یوں تو عمر کے ساتھ ان کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر ان کی پوری ہمت اور توجہ صرف ہوئی تعلیم تھا" [۱] ۱۸۷۷ء میں سرسید کے خواب کی ابتدا کالج کے قیام کی صورت میں ہوئی اور ان کی ازحد کوششوں

۱۔ سرسید احمد خاں از مولوی عبدالحق ۔ ص ۱۶

کے نتیجہ میں لارڈ لٹن Lord Lytton کے ہاتھوں آخر کار محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد پڑی۔ قوم کی تعلیمی غفلت اور بے پروائی اور پیسہ کی از حد کمی، اس کام کی تکمیل میں حارج تھی سرسید نے چندہ کی وصولیابی کے لئے شہر شہر دورے کرکے تقریریں کیں۔ دوستوں سے کبھی حق جتا کر کبھی سمجھا کر روپیہ وصول ہے۔ خوشی کی تقریبات کے اخراجات کو کالج کے چندہ میں دے دینے کی تلقین کرتے۔ امام ضامن کے روپے دو روپے، دو چار آنے بھی نہ چھوڑتے۔ حتیٰ کہ انھیں کوئی دعوت پر مدعو کرتا تو دعوت کے اخراجات نقدی کی صورت میں کالج کے لئے وصول کرتے اور کہتے کہ یہی میری دعوت سمجھئے۔ حد یہ کہ اس کے لئے ڈرامہ کر کے خود اسٹیج پر آئے اور اس طرح بھی کالج کے لئے چندہ جمع کیا پھر بھی یہ رقمیں ناکافی ہوتی تھیں۔ اس کے لئے قومی توجہ کی ضرورت تھی۔ ایک مشکل یہ بھی حائل تھی کہ چندہ دینے والے بعض دفعہ اپنی رقم کسی خاص مد کے لئے دیتے۔ ایسی صورت میں کالج کی کوئی دوسری ضرورت یا تعمیر کتنی ہی اشد ضروری ہوتی مگر وہ رقم اس کے لئے نہیں صرف کی جاتی تھی۔

علاوہ ازیں کالج کی عمارات اور تعلیمی اخراجات ہی نہیں بورڈنگ ہاؤس، لائبریری، مسجد، کالج کے ہال وغیرہ کی تعمیر کیلئے کثیر رقم کی ضرورت تھی۔ ہر موقع پر چھوٹی بڑی رقمیں وہ خاص اپنی جیب سے شامل کرتے رہتے تھے۔ جس کا کوئی حساب کبھی نہ رکھتے تھے مگر دیگر چندوں اور عطیوں کا پیسہ پیسہ حساب مع نام شائع کر دیا کرتے تھے تاکہ ایک طرف لوگوں کی تشفی خاطر ہو، دوسری طرف ہمت افزائی۔ پیسہ کی یہ کمی ایک طرف اور سرسید کی دلی خواہش اور تمنا دوسری طرف لہٰذا سرسید خود ہی نقشہ نویس بھی تھے اور انجینیر بھی، خود ہی پیمائش کرتے حتیٰ کہ مزدوروں کی مزدوری کا حساب بھی انھیں کے ذمہ تھا اور انھوں نے وہ عمدہ عمارت تعمیر کرائیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ یہی نہیں کالج کے لان اور باغ بغیچے بھی اسی خوش اسلوبی اور شوق سے بنواتے۔

یہ مصروفیات تو ایک طرف تھیں دوسری طرف کالج کے قیام کے ساتھ تعلیمی ضروریات اور مصروفیات کا اضافہ ہوتا رہا۔ تعلیمی نصاب کے لئے کمیٹی بنانے کی ضرورت ہوئی۔ بورڈنگ ہاؤس کے انتظام کی ضرورت اور اساتذوں کی رہائش گاہ کی ضرورت پیش آئی۔ کالج کے لئے قانون کمیٹی کی ضرورت ہوئی غرض اول تا آخر ہر چھوٹے بڑے کام میں سرسید خود حصہ لیتے اور تمام مسائل کو بہترین اور مفید ترین صورت میں حل کرنے میں کوشاں رہتے۔ کیونکہ قومی درسگاہ کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا وہ اسی نمونہ کی ایک اعلیٰ درسگاہ کی تکمیل چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ملک

کے لئے نمونہ بن جائے۔ لہذا ۱۸۹۱ء کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں "میں قبول کرتا ہوں کہ جو کام شروع ہوگیا ہے اور ایسے درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ جس کو دیکھ کر تعجب آتا ہے کیونکہ پہنچا، اول اس کو متفق ہو کر پورا کر دو اور اس کے بعد دوسرا شروع کر دو اور سب متفق ہو کر اسے پورا کر دو۔ اور پھر اسی طرح تیسرا شروع کر دو اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنی قوتوں کو متفرق رکھا تو کوئی ایک کام بھی پورا نہ ہوگا۔ اور سب کے سب ناقص رہیں گے۔ اور سب کے سب برباد معدوم ہو جائیں گے"[1]

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ گو بعد کے زمانے میں ان کی زیادہ تر مصروفیات کالج اور اس کے کاموں کی طرف مبذول ہو گئی تھیں مگر صرف یہ کالج ہی ان کا منتہائے نظر نہیں تھا۔ بلکہ تعلیم کی بنیادی اور اشد ضرورت نے ان کی مصروفیات اس طرف مرکوز کر دی تھیں۔ ۱۸۹۴ء کے ایجوکیشنل کانفرنس کے لکچر میں فرماتے ہیں۔ "انسان کے قویٰ جب ضعیف ہو جاتے ہیں اور اعتدال مزاج درہم برہم ہو جاتا ہے تو وہ متعدد اور متضاد بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہی حال قوم کا ہوتا ہے جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا بلکہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راستبازی، دیانتداری سیویلزیشن، دولت، تمکنت، متانت ہر چیز میں تنزل ہوتا ہے اور جو لوگ اس کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ کس کس چیز کا علاج کریں۔ مگر جب غور کیا جاتا ہے تو بجز تعلیم و تربیت کے اور کوئی اس کا علاج نظر نہیں آتا۔"[2] ۱۸۸۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام اور ہر سال اس کے سالانہ اجلاس کا اہتمام بھی ان کی وہ خدمت ہے جو ان کی تعلیمی اسکیم کی اشاعت، استحکام اور کوششوں کے لئے بڑی معاون ثابت ہوئی۔ اس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں ہوتا تھا جس میں دور دراز سے ممبران آکر شریک ہوتے اور تعلیم کے مختلف ذرائع اور مفید اثرات کے حصول پر غور و خوض کیا جاتا۔ مختلف ضروریات تعلیم اور مقامی ضرورتوں پر اظہار رائے اور مباحثے ہوتے۔ اس کمیٹی اور اس کے سالانہ جلسوں نے پہلی بار ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں مغربی تعلیم کا زور شور سے چرچا کیا نیز مسلمانوں میں تعلیمی شوق کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور یقیناً مغربی تعلیم سے دلچسپی کے ساتھ ایم۔ اے۔ او۔

۱۔ مجموعہ لکچرز و اسپیچز مرتبہ محمد امام الدین گجراتی۔ ص ۳۹۴

۲۔ " " " " ص ۴۲۵

کالج کی طرف مسلمانوں کی توجہ زیادہ ہوئی۔

اس کالج کی صورت میں نئے طرز پر اعلیٰ درسگاہ قائم کرکے سرسید نے یقیناً مسلمانوں کے لئے تعلیمی ترقی کی راہ کھول دی لیکن یہ لازمی اور وقتی ضرورت ان کی تنگ نظری نہ تھی بلکہ وہ پرخلوص جذبات کے ساتھ تمام ہندوستانیوں کی ترقی و اتحاد کے ہمیشہ خواہاں رہے۔ فرماتے ہیں۔

"مدرسۃ العلوم جس کا آپ نے بہت تعریف سے ذکر کیا ہے واقعی ہماری قوم کے لئے جس میں ہندو مسلمان سب شامل ہیں ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آپ نے خیال کیا ہے مگر خدا اس کو پورا کرے۔ میری دعا ہے کہ خدا ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی مدد کا خیال پیدا کرے اور ایک کو دوسرے کا حامی کرے۔ آمین" ۱ وہ اسے دراصل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے اور ایسے اعلیٰ تعلیمی مقاصد بھی رکھتے تھے جو بعض وجوہات کی بناء پر تکمیل نہ پاسکے۔ ایک طرف حکام کی پالیسی نہ تھی کہ ان کے تعلیمی مقاصد پورے ہوں یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ نے یونیورسٹی کی تجویز سے اختلاف کیا اور صرف اسی صورت میں منظوری دی کہ یہ صرف کالج ہو جو کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق ہو۔ دوسرے مشرقی علوم اور مذہبیات کی تعلیم جس نئے انداز پر اس درسگاہ میں چاہتے تھے وہ بھی پورا نہ ہوا کیونکہ لوگ انھیں لامذہب اور بے دین سمجھ کر ان کی قائم کردہ درسگاہ سے بھڑکتے تھے۔ لہٰذا مذہبی نصاب کے تیار کرنے میں قدیم خیال کے علماء سے مدد لینی پڑی جو سرسید کی خواہش کے مطابق نہ تھی۔ سرسید کو اس سے بالکل الگ رہنا پڑا حالانکہ سرسید قدیم طرز تعلیم اور مذہبی نصاب کو موجودہ زمانے کے لئے ناکافی اور پرجمود سمجھتے تھے۔

چنانچہ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:"۔۔۔۔۔ مسلمانوں میں کچھ تعلیمی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اسی بات پر مقصود ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلۂ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ اس زمانے میں اسی پرانے طریقہ پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لئے جون پور، علی گڈھ سہارن پور، کان پور، دیوبند، دہلی و لاہور میں جاری کئے ہیں مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں۔ ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں ۲"

۱۔ سفرنامۂ پنجاب از اقبال علی ص ۸۵ (بموجب سپاسنامہ منجانب باشندگان گورداسپور)

۲۔ تہذیب الاخلاق ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ پرچہ اولین در مضمون تعصب۔

پھر بھی چونکہ اس وقت مسلمانوں میں عام تعلیم و مغربی تعلیم کی اشد ضرورت تھی اس لئے ان گراں طبیعت چیزوں کو بھی گوارا کر لیا تاکہ جلد از جلد کالج قائم ہو جائے ۔ یہاں ایک شعبہ انگریزی زبان میں مغربی تعلیم کا، دوسرا ہندوستانی زبان میں مغربی و مشرقی نیز مذہبی علوم کا قائم ہوا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستانی زبان کا شعبہ ٹوٹ گیا کیونکہ طلبہ کی تعداد اساتذہ سے بھی کم ہو گئی ۔ مذہبی نصاب کا بھی جہاں تک محسوس ہوتا جدید طلباء پر سرسید کی منشاء کے مطابق زیادہ مفید اثر نہیں ہو سکا ۔ وجہ صاف ظاہر ہے مغربی اور انگریزی تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور قدیم طرز تعلیم و نصاب نیز مذہبی طریقہ تعلیم کا جمود اور اس کی کہنگی جو وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تھیں ۔ سرسید کا خیال قدیم نصاب اور طرز تعلیم کے متعلق خود ان کے الفاظ میں یہ تھا کہ جو طریقہ تعلیم بالفعل مقرر ہے وہ بلا شبہ تبدیلی کے لائق ہے بہت سی کتابیں ایسی درس میں داخل ہیں جن سے عمر ضائع ہوتی ہے بعض علوم ایسے پڑھائے جاتے ہیں جو نہ دین کے کام کے ہیں نہ دنیا کے ۔ جو شخص فارغ التحصیل ہو گیا ہے اگر اس کے حال پر غور کرو تو صاف معلوم ہو گا کہ دین کے کام کا ہونا تو معلوم دنیا کے بھی کسی کام کا نہیں "۔ ۱

سیکڑوں سال پہلے کی تصنیف کردہ مشہور کتابوں کو پڑھا دینا ہی تعلیم اور زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا یہاں ضرورت تھی نئے علوم کو ان زبانوں میں لانے کی، مذہبی علوم میں زمانے کی ہر تحریک کا جواب بہ دلائل دینے کی، نئے موضوعات پر بڑے اور مشہور علماء کی تصنیف کردہ ایسی کتابوں کی جن میں اجتہادی عناصر پائے جاتے ہوں ظاہر ہے کہ سرسید کی تنہا تصنیفی کوششیں اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھیں گو وہ اعلیٰ اور غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے ۔ مگر ان کا مذہبی علم ایک عالم مذہب کا نہ تھا بلکہ صرف ان کے ذوق مطالعہ کا مرہون منت تھا ۔ علاوہ ازیں ان کے صحیح خیالات اور ان کے فوائد سے بھی اندھی مخالفت نے لوگوں کو محروم کر رکھا تھا ۔ دینی مسائل صرف فقہ کی بنیادوں پر اور اسلامی تاریخ و سیرت رسول ؐ صرف قرآن شریف و حدیث پاک یا مسلمان علماء و فقہا اور صحابہ کے مطابق بیان ہوتی تھی ۔ یہاں ضرورت تھی فقہ میں نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کو سمجھنے اور سامنے لانے کی ۔ سیرت و تاریخ کی باتوں کو دیگر تاریخوں اور غیر اقوام کی کتابوں اور تاریخی واقعات کی روشنی

---

۱ ۔ تہذیب الاخلاق ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۹ ہجری ۔

میں بھی یہ دلائل ثابت کرنے کی، جس کی تردید مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذہب والے بھی نہ کرسکتے۔

لہذا بعض باتوں میں سرسید کے خیالات ونظریات کے مطابق کالج کا بھی خاکہ پورا نہ ہوسکا۔ ایک طرف سرکاری دباؤ انگریزی شعبہ کو پوری آزادی نہ دیتا تھا۔ دوسری طرف اندھی مخالفت سرسید کی وسعت خیال کو آزادانہ کالج کے مشرقی تعلیمی نصاب میں بھی داخل کرنے میں مخل تھی۔ لہذا شدید تعلیمی ضرورت کے پیش نظر سرسید نے جدید تعلیم کی مسلمانوں میں ابتداء ہو جانے ہی کو غنیمت سمجھا۔ مسلمانوں میں مکمل اور مفید تعلیم کے لئے سرسید کے ذہن میں جو خاکہ تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید مدرسۃ العلوم کے علاوہ کن مختلف قسم کی تدبیروں کو مسلمانوں کی عام وخاص نیز مفید تعلیم کے لئے ضروری جانتے تھے اور مدرسۃ العلوم میں کس قسم کی تعلیم کے خواہش مند تھے۔ (نث نوٹ نمبر۸) ۱ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں بعد سرسید کے خیالات کی صحت کا اندازہ مشرقی علوم کے شعبہ کے ٹوٹ جانے سے ہوگیا۔ یہ محض ایک اتفاقی امر نہ تھا اور نہ مسلمانوں کا صرف سرکاری ملازمت کی طرف رجحان تھا بلکہ یہ اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔ یعنی قدیم مذہبی ومشرقی علوم میں جمود کی کیفیت اور ماس کانئے تقاضوں کو پورا نہ کرنا جس کے باعث یہ غیر مفید ہوتے جارہے تھے۔

سرسید کی سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آواز ایک بانگ دہل تھی۔ پھر بھی اکثر مخالفوں کی اندھی مخالفت ان کے صحیح نظریات اور مفید خیالات کو پھیلنے کا موقع نہ دیتی تھی خصوصاً مذہبی مسائل میں۔ لہذا ان کی اصلاحی کوششیں مکمل طور پر پنپنے نہ پائیں۔ اول تو سرسید کی یونیورسٹی قائم کرنے کی خواہش ہی ان کی زندگی میں ان کی منشاء کے مطابق پوری نہ ہوسکی اور مجبوراً انھیں کالج کے قیام پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ حالی لکھتے ہیں۔ "مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے دونوں معزز سرکاری ملازم یعنی مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع ان ہی دو صاحبوں کی تحریریں تھیں اور ان کی مخالفت کی

۱۔ (تفصیلی نث نوٹ نمبر ۸ باب چہارم) ۔ ص ۲۲۳۔

کی ایک وجہ یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرستہ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دو صاحبوں کو خاص تعلق تھا۔ اس لئے سر سید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا۔ ۔ ۔ ۔ سر سید نے بعض مضامین میں علی گڈھ کے کلکٹر اور صوبہ کے ڈائرکٹر محکمہ تعلیم کو مدرستہ العلوم کا مخالف قرار دیا ہے۔"۱

سر سید کی مغرب پسندی ان کی سرکار پرستی اور الحاد سے تعبیر کی گئی یہ غلط فہمی مذہبی عقائد پر ان کی تنقید، مغربی تعلیم و تہذیب پر بہت زیادہ روز دینے خود لیے برتنے اور اس مقصد کے لئے انگریزوں سے رابطہ بڑھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ سر سید صرف تعلیم ہی نہیں مغربی تہذیب کے سبھی صحت مند اور مفید عناصر کو اپنا لینا لازمی جانتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت پر بہت زور دیتے تھے۔ چنانچہ علی گڈھ کالج ہندوستان کی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں صرف تعلیم ہی نہیں تربیت کا بھی چرچا تھا اور یقیناً یہ بعض مغربی اصولوں کی بنیاد پر تھی۔ سر سید فرماتے ہیں۔ "اکیلی تعلیم آدمی کو انسان نہیں بناتی ہے دوسرا حصہ اس کا تربیت ہے اور اگر وہ نہیں ہے تو تعلیم بھی اکارت ہے۔ مجھ کو افسوس ہے کہ تعلیم خواہ عربی، سنسکرت انگریزی کی ہو مگر میں ان تعلیم دینے والوں سے پوچھتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان میں خواہ گورنمنٹ کالج یا اسکول یا مشنریوں کی تعلیم گاہیں یا پرائیوٹ انسٹی ٹیوشن ہوں ان سب میں اولاد کی تربیت کا کیا بندوبست ہے؟"۲ چنانچہ ایم، اے، او کالج علی گڈھ میں پہلی بار اس کا خاص خیال رکھا گیا تھا جو ہندوستان کی کسی اور درسگاہ میں آج تک نہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں طلباء کی رہائش، یکسانیت لباس، خوش وضعی، عادات و اخلاق نیز مختلف قسم کی سوسائٹیوں پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا جس سے ذہنی و جسمانی تربیت ہو۔ صحت کے لئے کھیل کود کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی حتیٰ کہ وہاں کے طلبہ اس ضمن میں عرصہ دراز تک دوسری درسگاہوں کے طلباء سے پیش پیش رہے بلکہ اس وقت دوسری درسگاہوں میں سوائے انگریزی تعلیم کے ان باتوں کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ کھیل

۱۔ حیات جاوید حصہ دوم۔ ص ۲۷۷ (پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۰۱ء)

۲۔ مجموعہ لکچرز و اسپیچیز از محمد امام الدین گجراتی (لکچر ٹاؤن ہال امرتسر ۱۸۸۴ء) ص ۲۶۱۔ (مصطفائی پریس لاہور)

کو اور اس کا اہتمام علی گڈھ کالج میں اسی جسمانی تربیت اور ذہن کی تازگی کے لئے تھا نہ کہ انگریزوں سے رابطہ پیدا کرنے کا ذریعہ۔ البتہ چونکہ یہ ہندوستانی درس گاہوں میں اس قسم کی اولین چیز تھی اس لئے انگریز حکام بھی اس میں دل چسپی لیتے تھے بلکہ غیر محسوس طور پر اپنا دباؤ رکھنے کے لئے بھی کھیلوں کے ذریعہ سوشل ملاپ بڑھاتے تھے جو کلاسوں میں ناممکن تھا۔ بیک اور مارلین کی دل چسپیاں اس کی مثال ہیں مگر اس سے گریز بھی مشکل تھا۔ غرض اس قسم کی ذہنی وجسمانی تربیت علی گڈھ کے صباح کا خاص طرۂ امتیاز تھا اور اس پر سر سید کو فخر تھا۔

چنانچہ سید حسین بلگرامی کو کالج کے بارے میں لکھتے ہیں:- "علاوہ معمولی تعلیم کالج کے یونین کلب ہے جس میں وقتاً فوقتاً انگریزی زبان میں تقریریں اور مباحثہ ہوتا ہے۔ . . . . پھر ایک لجنۃ الادب ہے جس میں عربی خواں طلباء اور مدرس اور دیگر احباب شریک ہوتے ہیں اور کل گفتگو و مباحثہ عربی زبان میں ہوتا ہے اور جو عربی زبان میں نہایت شستہ اور عمدہ گفتگو کرتا ہے اس کو انعام دیا جاتا ہے۔ عربی کے اخبارات مصر و بیروت اس سوسائٹی میں لئے جاتے ہیں۔ جو اس کے ممبران کے لئے مفید ہیں۔ . . . علاوہ اس کے ایک مجلس اخوان الصفا ہے جس کے پریزیڈنٹ مسٹر آرنلڈ Mr. Arnold ہیں اور مختلف طلباء اس کے ممبر بھی ہیں۔ یہ خاص مجلس ہے ہر طالب علم کے دل میں جو سچی بات ہے اس پر گفتگو کرتا ہے۔ اور طالب علم صدق دل سے اس کی اصلاح اور ترمیم یا تصدیق و تردید کرتے ہیں۔ اس مجلس نے میری دانست میں طالب علموں کے اخلاق پر نہایت عمدہ اثر کیا ہے۔ . . . علاوہ اس کے چار پانچ کلب جسمانی ورزشوں جمناسٹک کرکٹ، فٹ بال، قواعد، گھوڑے کی سواری وغیرہ کے ہیں"[1] اعلیٰ اور تمام مفید علوم کے حصول کے ساتھ قومی تربیت اور قومی وحدت کی تشکیل پر سر سید بہت زور دیتے تھے لہٰذا علی گڈھ کالج کی تعلیم و تربیت اور انتظام میں اس کا پورا خیال رکھا تھا۔ نئے تقاضوں کا احساس دلانے کی کوشش اعلیٰ مغربی تعلیم کی اشاعت، ذہنی و اخلاقی تربیت، پوشاک، رہن، سہن، حور طریقوں میں یکسانیت، تہذیبی یک رنگی، قومی وحدت اور اجتماعی تصورات یہ سب علی گڈھ تحریک کی خصوصیات میں سے ہیں۔

۱۔ مکتوبات سر سید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۴۹ - ۳ (مکتوب ۳ مئی ۱۸۹۵ء)

علی گڈھ تحریک کی بنیادوں کو سمجھنے اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لئے سرسید کے خیالات اور زمانے کی ضروریات کو ساتھ ساتھ دیکھنا لازمی ہے ورنہ یہ سرسید اور ان کی تحریک دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ انیسویں صدی کے وسط تک مسلمان انگریزوں کی آمد کے بعد سے دو صدیوں کی تاریخی دوڑ میں اپنا سب کچھ کھو چکے تھے۔ بنگالی مسلمان پلاسی کی جنگ کے بعد ہی اقتصادی، سماجی و تہذیبی پستی کا شکار ہو کر مفلسی و بربادی و تباہی کا مسلسل نشانہ بن گئے تھے۔ (نوٹ) ا تمام پرانی قدریں ٹوٹ چکی تھیں۔ نئی قدریں اور نئے تقاضے جو زاد دیئے بنا رہے تھے اس سے مسلمان نفرت اور غفلت کی وجہ سے بالکل بیگانہ رہ گئے تھے۔ اس حالت میں غدر ۱۸۵۷ء نے ایک زبردست سیاسی شکست کے ساتھ انھیں تباہی کے اس اندھیرے غار میں ڈھکیل دیا جہاں مایوسی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا البتہ ماضی کی شاندار یاد سینوں سے چمٹی ہوئی تھی اور یہی ان کا رہا سہا دہ قومی سرمایہ تھا جس پر وہ ناز کرتے تھے۔ انگریز اپنے ساتھ جو نئی مغربی اقدار لائے وہ نئے زمانے کا رنگین افق تھیں مگر ان کی (مسلمانوں کی) نظروں میں ہر نئی چیز حریف کا سرمایہ تھی لہذا قابل نفرت بھی تھی۔ یہ صرف مشرق و مغرب کی سیاسی و تمدنی ٹکر نہیں بلکہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی کشمکش بھی تھی جو اس وقت بین الاقوامی تمدن اور سیاست میں اہم نتائج پیش کر رہی تھی۔ یہ کشمکش ہندوستان ہی نہیں دیگر ممالک میں بھی جاری تھی اور ہندوستان میں اپنی اولین اور ابتدائی صورت میں انگریزوں کی تعارف کردہ تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں کی سیاسی جیت میں اس کشمکش کا بھی حصہ تھا کیونکہ سائنس کی تیز ترقیوں اور کارخانوں کی تعمیر کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کا عروج وابستہ تھا۔ اور یقیناً یہ مختلف پہلوؤں سے قدیم جاگیردارانہ نظام پر فوقیت رکھتا تھا۔

غدر کے بعد مسلمان سماجی اور سیاسی اقدار کے اس چوراہے پر پہونچ چکے تھے جہاں پیچھے شاندار ماضی تھا اور سامنے اندھیرا اور مایوس کن مستقبل۔ ایک طرف فتح مند انگریز جن کے مظالم اقتصادی و سماجی حیثیت سے ان کو مسلسل نشانہ بنائے ہوئے تھے دوسری طرف دیگر ابنائے وطن کا نیا راستہ بھی ان پر بند تھا وہ جدیدیت اور مغربیت کے

ا۔ نوٹ:۔ تفصیل کے لئے دیکھیں "انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ" از عبداللہ یوسف علی اور اٹھارہ سو ستاون از خورشید مصطفیٰ رضوی۔

اس میدان میں بہت آگے نکل چکے تھے جو حریفوں کا تعارف کردہ سرمایہ خاص تھا اور جس کی نئی قدریں قدیم نظام پر ایک ضرب کاری تھیں۔ مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت اور صلاحیت باقی نہ تھی بلکہ اس سے بدکتے تھے۔ پیچھے پلٹنا ممکن نہ تھا پھر بھی لے دے کر ماضی کی قدیم عظمت ان کی زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ تھی۔ اس لئے پیچھے پلٹ کر دیکھتے اور اسی پر ناز کرتے۔

ایسے پر آزمائش اور سنگین تباہی کے دور میں سرسید کی شخصیت تھی جس نے مسلمانوں کی اس قابل رحم حالت کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ اگر چند دنوں اور یہ جمود کی کیفیت باقی رہی تو ہندوستانی مسلمانوں میں جو ماضی کا ایک مبہم احساس از قسم غیرت و حمیت باقی ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا اور پھر وہ کبھی سر اٹھانے اور ترقی کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔

یہ غور کرنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کی یہ بربادی صرف ان تک کیسے محدود رہ سکتی تھی۔ ملک کی ایک بڑی آبادی جو ملکی دولت پر جی رہی ہو اور جس پر ملک کا سرمایہ صرف ہو رہا ہو جب ملکی ترقی میں کچھ حصہ لینے اور ملک کو اپنے ذہن اور صلاحیت سے کچھ دینے کے قابل نہ رہے تو گویا وہ ایک عضو معطل ہے۔ ظاہر ہے یہ پورے ملک کا ایک بڑا نقصان اور متحدہ ہندوستانی سماج کی ایک اہم کمزوری تھی۔ سرسید نے اپنی کاوشوں میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھی کہ مسلمانوں کی اصلاح، ملک کی ترقی اور مفاد کا ایک اہم جز ہے۔

چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی اس قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا علی گڈھ تحریک اس کی عملی صورت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ علی گڈھ تحریک ہی وہ پہلا چراغ راہ ہے جس نے انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کی طرف نئی روشنی دکھائی، اس قافلے کو آگے بڑھنا اور اپنی راہ میں چراغ روشن کرنا سکھایا۔ اور اس طرح ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ میں جس کا افق ایک صدی قبل ابھر چکا تھا مسلمانوں کی تاریخی اور سماجی حیثیت متعین کر دی۔ یہی علی گڈھ تحریک وہ ہمہ گیر تحریک تھی جس نے دور بیداری میں آگے بڑھنا اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا سکھایا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

علی گڈھ تحریک نے صحیح طور پر مسلمانوں کو ایسی ہی کٹھن منزل کو عبور کرنا سکھایا اور آئین نو کی روشنی کے لئے ان کی ذہنی اور سماجی زندگی کے تمام دریچے کھول دئے۔ تہذیب و تعلیم کے ہر گوشہ میں مغرب اور جدید علوم سے مستفید ہونا جدید کی خوبیوں کو قدیم کے حسن میں سمونا سکھا دیا۔ اس طرح یہ تحریک ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی وہ دوسری اہم کڑی بن گئی جس کی پہلی کڑی بنگال میں ایک صدی قبل راجہ موہن رائے اور ان کے بعد دیگر اکابرین کی قیادت میں رونما ہو چکی تھی۔

جو ضرورت ایک صدی قبل راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی سماجی، مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی محسوس کی تھی وہی سرسید نے غدر کے بعد مسلمانوں کے لئے محسوس کی۔ سرسید کی یہ تحریک گو خاص طور پر مسلمانوں کی سماجی و ذہنی اصلاح سے وابستہ تھی۔ مگر یہاں پر یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ پورے ہندوستان کی تاریخی و سماجی ترقی کے لئے ایک اہم سنگ میل تھی جس نے ہندوستان کی تاریخی کشمکش کے اس پر آشوب دور میں ہندوستانی قوم کے ایک بڑے حصہ کو زندہ رہنا اور ملکی مفاد کے لائق بننا سکھایا۔ مصنف موج کوثر لکھتے ہیں۔ "علی گڈھ تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا مقامی نقطۂ نظر تھا۔ اس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور اقتصادی پستی کو دور کرنا تھا۔ باہر کے مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا"۱ اس طرح یہ تحریک ہندوستان کے دور بیداری کا وہ اہم جزو بنی جس نے مسلمانوں کو غفلت سے جگانے اور ان میں زمانہ اور وقت کے مقابلہ کی طاقت پیدا کرنے میں شہ اور دل ادا کیا۔ مندرجہ بالا پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے سرسید کی تحریک کی بنیادی اہمیت اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں اس کے اہم رول سے انکار ناممکن ہے۔ یہ کوئی محدود تعلیمی اسکیم نہ تھی جس کا منتہائے نظر ایک علی گڈھ کالج ہی رہا ہو۔ بلکہ سرسید کے اس عظیم اصلاحی مشن نے مسلمانوں کی ذہنی صلاحیتیں ابھاریں اور تمام سماجی پہلوؤں کی اصلاح کرکے تاریکی سے روشنی کی طرف ان کی رہبری کی تاکہ ملک کے لئے کارآمد بن سکیں۔

تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچا دیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم

۱۔ موج کوثر مصنفہ محمد اکرام ص ۲۸۶

کو بنظر حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بہ نظر تحقیق دیکھیں جو بری ہوں ان کو چھوڑ دیں جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔" ۱ مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرسید مغرب پسندی کے باوجود اندھی تقلید کو بہت برا سمجھتے تھے ان کی نظر عمیق تھی اور وہ مغرب کی صرف اچھی چیزوں کو اپنا توی سرمایہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت حماقت اور نادانی کا ہوتی ہیں۔" ۲ سرسید اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ تہذیبوں پر مذہب کی گہری چھاپ ہوتی ہے اسی لئے وہ اسلام کی حقیقی روح کو رسمی تصورات اور پابندیوں سے الگ کر کے منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کا قدیم طبقہ دنیا اور اس کے تمام فوائد سے منہ موڑ لینے کو مذہب کی جڑ بنیاد سمجھتا تھا اور نئی نسل قومی پستی کے زیر اثر مذہب کو پستی کا سبب بننے کا الزام دیتی تھی ایسے نازک دور میں سرسید نے عقلیت کی ترازو میں مذہب کو پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اس طرح نوجوانوں سے مذہب بیزاری دور کی۔ حبیب اللہ خاں اپنے مضمون تہذیب الاخلاق کا کام' میں لکھتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں میں مذہب سے بیزاری کی دو وجوہ ہیں۔ (۱) انگریزی تعلیم کے ساتھ تربیت کا کافی بندوبست نہ ہونا۔ (۲) زمانے کی حالت کے مطابق مذہبی تعلیم کا نہ ہونا۔" ۳

یقیناً سرسید نے اس مقصد کے لئے ان ہر دو باتوں میں پوری کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ علاوہ ازیں عقل و علم کو مذہب کا بنیادی اثاثہ بنا کر اس کو تمام رسمی غلط عقائد و رسوم سے پاک کرنے کی سعی کی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جمودی عقائد کو توڑنے میں ان کی تمام مذہبی تصانیف اور مضامین نے نمایاں حصہ لیا۔ تحریک سرسید کی یہ وہی سعی ہے جس نے ندوۃ اور دار المصنفین جیسے علمی و مذہبی اداروں کو جنم دیا۔ شبلی اور سلیمان ندوی جیسے محقق مورخین اسلام پیدا کئے۔ تعلیمی کوششوں میں یہ تحریک جس کامیابی

۱۔ تہذیب الاخلاق یکم شوال ۱۲۸۷ھ یوم جمعہ عید الفطر از مضمون رسوم و عادات۔

۲۔ " " " " " " " " " "

۳۔ تہذیب الاخلاق یکم ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ ہجری۔

سے آگے بڑھی وہ اظہر من الشمس ہے اور علی گڑھ ایم، اے، او کالج اس کا شاندار باب۔ گو سرسید کے تعلیمی مشن کی وسعت و گہرائی اس میں مکمل نہ ہو گی پھر بھی مسلمانوں میں اعلیٰ جدید تعلیم کی تیز ترقی میں علی گڑھ کو نمایاں اور اہم ترین مقام حاصل ہے۔ اس طرح ایم، اے، او کالج علی گڑھ کو ہندوستانی مسلمانوں کی جدید تعلیم کا سنگ بنیاد اور عظیم تعلیمی ترقی کی اہم کڑی کہا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی تشریح سرسید کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتی ہے۔ تہذیب الاخلاق میں خود لکھتے ہیں "اس پرچہ کے اجزاء سے مطلب ہے ہندوستانی مسلمانوں کو کامل درجہ کی سیولزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سیولائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔ سیولزیشن سے مراد انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت و تمدن اور طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکن و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔ یہ بات نہایت سچ ہے کہ قوم کے مہذب ہونے میں اس کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے۔" ۱

گو علی گڑھ کالج مکمل طور پر سرسید کے خوابوں کی تعبیر نہ بن سکا مگر ہندوستان کی عظیم نشاۃ ثانیہ میں اس کا جو اہم رول ہے اس سے بھی انکار ممکن نہیں۔ "اس میں شبہہ نہیں کہ ایم، اے، او کالج جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی بنا سرسید احمد خاں کی قومی خدمات میں سب سے نمایاں اور سب سے پائدار کارنامہ ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے اس نقشے میں جو سرسید نے بنایا تھا صرف ایک جز کی تعمیر ہے اور وہ بھی پوری طرح ان کے نقشے کے مطابق نہیں ہے۔" ۲ علاوہ تعلیمی کارنمایاں

۱۔ تہذیب الاخلاق پہلا پرچہ۔

۲۔ سید کا خواب اور اس کی تعبیر از ڈاکٹر سید عابد حسین در علی گڑھ تحریک ص ۱۱

کے اس تحریک نے مسلمانوں کی سماجی اصلاح و مذہبی فلاح کے لئے حیرتناک خدمات کیں۔

اس تحریک نے ملکی بیداری عام تعلیمی رجحان اور نئے خاکوں کی تشکیل میں جو رول ادا کیا وہ بھی ظاہر ہے علمی میدانوں، ادبی شاہراہوں، صحافت، سیاست اور تمام سماجی اصلاحات میں پورے شمال مغربی ہندوستان کی جدید ادلین کاوشیں علی گڈھ تحریک اور اس کے گہرے اثرات کا حصہ ہیں۔ اس تحریک کی ادبی و تعلیمی خدمات اور ان کے مفید اثرات کا سب ہی اعتراف کرتے ہیں۔ مگر اس کے سیاسی رجحان پر اختلاف رائے ہے۔ یہاں سیاست ہمارا موضوع نہیں اور نہ مجھے سرسید کے سیاسی رجحانات کی صفائی پیش کرنا ہے مگر علی گڈھ تحریک اور اس کے اثرات کو سمجھنے کے لئے اسکے تمام رجحانات اور اثرات کی وضاحت ضروری ہے۔

یہ طے شدہ امر ہے کہ سرسید اعلیٰ تعلیم کے ساتھ حصول سائنس اور ذہنی و اخلاقی تربیت کو ہی تمام ترقیوں کی بنیاد سمجھتے تھے اور اسی لئے رفتہ رفتہ اپنی خدمات کو خاص طور پر اسی طرف مرکوز کرتے گئے۔ وہ علی گڈھ کو اس کی اعلیٰ مثال بنا کر سارے ہندوستان میں ایسے ہی تعلیمی اداروں کے قیام کی شدید خواہش رکھتے تھے ایک قومی امداد کے لئے ایک تمثیل بیان کرتے ہیں کہ انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور سب نے خود غرضی اختیار کی اور معدہ نے کھانا پکانے سے انحراف کیا پھر دو ہی چار روز میں شدت ضعف سے سب کی بری حالت ہوگئی جس کا سبب خود غرضی تھی پھر کہتے ہیں اسی طرح سمجھو کہ "اگر ہر ضلع کے مسلمان یہ خیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہم کو کیا فائدہ تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے"۔[۱] جدید مغربی تعلیم کے حصول کے لئے انگریزوں سے دوستانہ روش لازمی تھی یہ چیز کم از کم اتنے عرصہ کے لئے ضروری سمجھتے تھے جب تک کہ قوم میں اعلیٰ تعلیم اور ذہنی و اخلاقی تربیت نہ ہو جائے اور قوم اس قابل نہ ہو جائے کہ ترقی و آزادی کی راہ تعمیر کر سکے۔ اس وقت زبان سے یہ ظاہر کرنا کہ انگریز دوستی ایک خاص عرصہ کے لئے ہے۔ مصلحت نہ تھی چنانچہ سرسید مستقل انگریزوں سے دوستانہ سلوک کا اظہار بھی کرتے رہے اور تعلیمی ترقی و قومی تربیت میں کوشاں رہے اور ہر اس چیز کی مخالفت کی جو اس راہ میں حائل ہوتی۔ کانگریس کی

۱۔ بحوالہ حیات جاوید از حالی ص ۲۴۴ (حصہ دوم پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

مخالفت بھی انھوں نے اسی بنا پر کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی ہماری تعلیمی حالت اور ذہنی تربیت اس درجہ کی نہیں ہے کہ ہم کھلم کھلا انگریزوں کی ترقی یافتہ قوم سے ٹکر لیں کیونکہ حصول ترقی کے لئے ابھی ہمیں انھیں کے علوم اور تمدن سے بہت کچھ اپنانا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب قومی تنظیم، اعلیٰ تعلیم، ذہنی اور اخلاقی تربیت، اتحاد کی بنیادوں پر ایک بار درجہ تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر کوئی طاقت ایسی قوم کو غلام نہیں رکھ سکتی۔ ایسی مضبوط ہندوستانی قوم اپنی راہ خود تعمیر کرے گی۔

علی گڈھ کی تربیت یافتہ نسل بڑی حد تک سرسید کے اس خیال کی صحت کا ثبوت ہے۔ اس نئے دور کے مسلمانوں میں تعلیم وادب، سیاست وصحافت میں جو نمایاں ہستیاں سامنے آتی ہیں وہ سب علی گڈھ کالج کی تربیت یافتہ یا علی گڈھ تحریک سے بالواسطہ اور بلا واسطہ تعلق رکھنے والی تھیں۔ خان عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) مولانا محمد علی، امولانا شوکت علی، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، شیخ عبداللہ شعیب قریشی، خلیق الزماں (جو ۱۹۴۶ء تک کانگریس میں رہے) پروفیسر عبدالباری، ۲ شاہ عمید، شاہ زبیر، عبدالمجید سندھی، سید حسین، ڈاکٹر سید محمود، ۳ حسرت موہانی، ۴ یہ سب علی گڈھ کالج کے وہ سپوت ہیں جنھوں نے خاص قربانیاں دیں اور کانگریس کے سرگرم کارکن رہے۔ اور جنگ آزادی میں جاں بازی سے ہمیشہ شریک کار رہے۔ حتیٰ کہ کانگریس کے عظیم رہنما ابوالکلام آزاد کی ذہنی رہنمائی میں سرسید کے خیالات ورجحانات

خوشنما۔

۱۔ جنھوں نے ۱۹۲۸ء میں ہی نہرو رپورٹ میں مکمل آزادی کے مطالبہ کو داخل کرنے پر بہت زور دیا تھا۔

۲۔ آخر دم تک سرگرم کانگریسی کارکن رہے۔

۳۔ بہ زمانہ طالب علمی میں ہی جن چند طلبا نے آزادی کے لئے خود کو وقف کر دینے کی سرسید کے مزار پر قسم کھائی تھی آپ ان میں سے ایک ہیں اور ہمیشہ سے کانگریس کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔

۴۔ انھیں نے ۱۹۲۱ء میں سب سے پہلی بار کانگریس میں یہ تحریک پیش کی کہ مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جائے اس کے علاوہ سودیشی تحریک میں خاص اور نمایاں حصہ لیا۔

کا بڑا حصہ ہے اگرچہ مولانا نے علی گڈھ تحریک کے بعد کے کردار سے شدید اختلاف کیا۔ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کی پکار پر کہ ہر طرح گورنمنٹ کا بائیکاٹ کیا جائے ان ہزاروں مسلمانوں کے علاوہ جنھوں نے اس میں حصہ لیا علی گڈھ کالج کے طلبار کی کثیر تعداد نے اس بنا پر کالج چھوڑ دیا کہ ٹرسٹیان کالج گورنمنٹ کی امداد چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کالج چل نہ سکے گا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین انھیں طلبار میں سے تھے اور جامعہ ملیہ اسی وقت کی یادگار ہے جس نے گورنمنٹ ایڈ سے بالکل الگ رہ کر تعلیمی تنظیم میں نمایاں حصہ لیا۔ جامعہ ملیہ کا تصور مولانا محمد علی نے دیا۔ مولانا محمد علی سے متاثر ہو کر پانچ سو مذہبی علماء نے مکمل آزادی کی تحریک میں حصہ لیا اور جمعیتہ العلمائے ہند ہمیشہ کانگریس کے شانہ بہ شانہ آزادی کی جدوجہد میں شریک رہی۔

ان سیاسی شخصیتوں کے علاوہ ہمارے ادب و صحافت کے میدان میں جو قابل قدر ہستیاں نظر آتی ہیں ان کا بھی علی گڈھ تحریک سے نمایاں تعلق ہے۔ عبداللہ بریلوی (ایڈیٹر بامبے کرانیکل) قاضی عبدالغفار، جالب دہلوی، ظفر علی خاں لاہور (ایڈیٹر زمیندار) مولانا محمد علی (ایڈیٹر کامریڈ) شعیب قریشی (ایڈیٹر ینگ انڈیا) یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے علی گڈھ میں تعلیم پائی اور جنھوں نے صحافت کے ذریعہ ملکی بیداری اور آزادی کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی تحریک کے عظیم اثرات اور برکات نے محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، حالی، شبلی، اقبال، ذکا اللہ، نذیر احمد راشد الخیری، امتیاز علی تاج، عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی، مہدی حسن جیسی قابل قدر ہستیاں پیدا کیں جن کے علمی و ادبی کارنامے اور قومی ہمدردیاں یقینی طور پر علی گڈھ تحریک کے اثرات کی مرہون منت ہیں۔ یہ تو ہے سرسید کے صرف ادھورے خواب کی تعبیر جو علی گڈھ تحریک کے ذریعہ ہندوستان کو ملی۔ اگر تعلیم پر انگریزی حکومت کی شاطرانہ مصلحتوں کا یہ دباؤ نہ ہوتا اور سرسید اپنی زندگی میں یونیورسٹی کے وجود کے ساتھ اسے اپنے تمام مقاصد کی تکمیل کا مرکز بنا سکتے تو پھر علی گڈھ تحریک کیا ہوتی یہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ مندرجہ بالا باتوں پر دلالت کرتا ہے۔ وہ سرسید جو سرکار پرست بھی کہلائے اور وہ طلبائے علی گڈھ جو اکثر وفادار گورنمنٹ کہے گئے خود انگریز ان کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ نیز سرسید کے سیاسی اور تعلیمی نظریہ کی تشریح ان کی نظر میں کیا تھی۔ مولانا محمد علی یہ واقعہ یوں بیان کرتے ہیں۔" جب کہ طاعون کے ابتدائی زمانے

میں پونا میں دو انگریز قتل کر دئے گئے تھے۔ اور لوگ نا یہ تلک سے انگریز بے حد بیزار تھے۔ مولانا شوکت علی خود بھی اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ اور بود و ماند کا طریقہ انگریزوں سے بہت ملتا جلتا تھا ایک تجربہ کار انگریز افسر نے ان سے پوچھا کہ تمہاری رائے میں آج ہندوستان میں سب سے بڑا باغی کون ہے؟ جو جواب میرے بھائی نے دیا اس پر وہ گرگ باران دیدہ ہنس پڑا اور کہا ہندوستان میں سب سے بڑا باغی وفاداروں کا وفادار سید احمد خاں ہے۔ جب میرے بھائی نے اس تعجب انگیز فیصلہ پر تعجب کا اظہار کیا تو اس فرتوت نے کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ وہ نوجوان مسلمان جو علی گڈھ میں وہی تعلیم پا رہے ہیں جو ہمارے بچے ہیرو اور ونچسٹر میں پاتے ہیں جو انھیں کی سی زندگیاں بسر کرتے ہیں اور انھیں کے کھیلوں میں انھیں ہرا سکتے ہیں اس بات پہ قانع ہوں گے کہ جب وہ سویلین بن کر ہندوستان آئیں اور بڑے بڑے عہدوں پہ فائز ہوں تو ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہوں اور "جی حضور" اور بجا ارشاد ہوا" ان کے روبرو کہا کریں۔ . . . یہ آپ کا چوٹی کا وفادار سید احمد خاں ہی ہے جو آج سب سے بڑا باغی ہے"۱

اس میں شک نہیں کہ علی گڈھ تحریک سر سید کا وہ کارنامہ ہے جس نے ایک پورے دور کو پلٹ کر رکھ دیا۔ مولانا محمد علی اپنے ایک مضمون میں سر سید کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں "مجھے یقین واثق ہے کہ گو سر سید احمد خاں کی نظر میں ہندوستان کا ایسا کوئی قریبی مستقبل نہ رہا ہو جس میں ان کے مدرسے کے طلبا بجز سرکاری وفادار رعایا کے کچھ اور ہو سکیں لیکن ان کا مطمح نظر اس کالج سے ہمیشہ ایسے نوجوان پیدا کرنا تھا جو راسخ الاعتقاد مسلمان اور سچے محب وطن ہندوستانی ہوں"۲

ہر تحریک کسی نہ کسی حد تک مخالفتوں سے دوچار ہوتی اور دشوار گذار مراحل طے کرتی ہے البتہ مخالفتوں کی نوعیتوں اور شدت میں یقیناً فرق ہوتا ہے۔ سر سید کو اپنی عملی کاوشوں میں جن شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ یک طرفہ نہیں سہ طرفہ تھیں۔ پھر بھی انھوں نے اس کو بڑی حد تک کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔ مثلاً باوجود ظاہری طور پر مدد دینے کے بھی گورنمنٹ نے ان کی زندگی میں مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی نہیں بننے دیا، جس کا نصاب

۱۔ مضامین محمد علی حصہ اول ص ۲۹۰

۲۔ مضامین محمد علی حصہ اول ص ۲۹۱

خود ہندوستانیوں کے اختیار میں ہوتا۔ یہ سرسید کی عین تمنا تھی۔ اس طرح ان کے بنیادی اور تعلیمی مقاصد کو اندرونی ٹھیس پہونچائی۔ انگریزی گورنمنٹ دراصل وہیں تک ساتھ دیتی تھی جہاں تک اس کے سیاسی مقاصد سے ٹکر نہ ہوتی ہو۔ حالی لکھتے ہیں" جس زمانے میں انھوں نے مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اکثر یورپین افسران کے مخالف ہو گئے تھے۔ کمیٹی نے جس قطعہ زمین کے (کالج کے لئے) ملنے کے لئے درخواست کی تھی ضلع کے حکام اس کا ملنا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصاً ڈائرکٹر تعلیم اضلاع شمالی و مغرب اور صاحب کلکٹر ضلع علی گڈھ سخت مخالف تھے" ۱

ایجوکیشن کمیٹی کی شہادت میں اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے' جواب دینے کے سلسلے میں سرسید یہ واقعہ لکھتے ہیں۔

"جس زمانے میں محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج علی گڈھ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یورپین افسر سے اس کی امداد کی درخواست کی۔ اس نے جواب دیا۔ ہم پر اس کی مدد کرنا فرض نہیں ہے وہ تمہارا بچہ ہے ہمیں اس کو دھکا دے دینا چاہئے اگر ہمارا بچہ ہوتا تو البتہ اس کو والدین شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے" ۲ اس کے علاوہ سرسید کی تعلیمی کاوشوں کے ساتھ اینگلو مسلم دوستی کو ایسا رنگ دیا گیا اور سرکاری سرپرستی کے روپ میں ان کا ایسا چرچا ہوا کہ مسلمان خود اپنے ہم وطنوں کی نظر میں مشتبہ ہو گئے۔ وہی سرسید جن کی قدر و منزلت ایک محب وطن کی حیثیت سے سارے ملک میں تھی مشکوک ہو گئے۔ سرسید ایک موقع پر کہتے ہیں" میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں" ۳
علی گڈھ تحریک کے تحت مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بیداری کے ساتھ ہندوستانیوں کی قومی وحدت کا خطرہ محسوس کر کے زبان کے مسئلہ پر بھی غیر ملکی سرکار نے وہ پالیسی اختیار کی

۱۔ حیات جاوید از حالی۔ ص ۲۰۸ (حصہ دوم پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

۲۔ " " " ص ۱۶۶ (حصہ اول طبع سوم ۱۹۲۲ء)

۳۔ سفرنامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی۔ ص ۱۶۷

جس سے سرسید کے مقاصد اور ملکی اتحاد دونوں کو زبردست ٹھیس لگی۔ مولانا محمد علی فرماتے ہیں "وہ ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلمان دونوں کے حقوق کے حامی تھے مگر مظلوم مسلمانوں کے تحفظ کے باعث ہندو بھی ان سے بدظن ہو جاتے تھے۔" ۱

تاریخ اب اس موڑ پر تھی جہاں ہندوستانی وحدت انگریزی سرکار کی مصلحتوں کا شکار ہو کر ہر حیثیت سے مختلف خانوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ سرسید ایک مصلح ہونے کی بناء پر قومی و سماجی اصلاح کو اپنے افکار و اعمال میں اولین حیثیت دیتے تھے اور اس کی اہمیت کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے تھے مگر تاریخی انتشار کا یہ دور شک و شبہہ، خوف و یقین، اقتدار و غلبہ اور حق و مطلب کی رسہ کشی کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ لہذا سرسید کے افکار کی وسعتیں اور پرخلوص کوششیں اکثر اسی رسہ کشی کا شکار ہوئیں۔ انگریز ان کی قومی و ملی خیر خواہی اور اس کے اثرات کو محسوس کر کے اندرونی طور پر اس تحریک کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے درپے ہوئے۔ مسلمان کرسٹان اور نیچری سمجھ کر ان پر شبہہ اور نفرت کرتے اور مخالفت کا طومار باندھتے۔ ہندو انھیں آزادی کا مخالف اور صرف مسلمانوں کا بہی خواہ سمجھتے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ نظریاتی اختلافات یا غلط فہمیوں کی بناء پر جو بھی خامیاں سرسید کے طرز فکر میں نکالی جائیں یا ان کی عملی کاوشوں میں کسی غلطی کی تلاش کی جائے، سرسید پر تعصب اور بدنیتی کا الزام لگانا ممکن نہیں۔ انڈین ایسوسی ایشن لاہور کی طرف سے ایک ایڈریس میں سرسید کے متعلق یوں اظہار خیال کیا گیا تھا: "آپ کا برتاؤ ابتداء سے انتہا تک تعصب یا خود رائی کے دھبہ سے بالکل مبرا رہا ہے۔" ۲ وہ نہایت حق پسند اور صاف گو تھے جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کے اظہار سے انھیں کوئی چیز روک نہیں سکتی تھی۔ سرسید کے سیاسی اصولوں کو بھی ان کے نقاد بدنیتی اور تعصب پر محمول نہیں کر سکتے۔ ایم۔ ایس۔ جین سرسید کی کانگریس سے مخالفت کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ "مسلمانوں کی پست حالی بھی ان کو مخالف کیمپ میں لے جانے کا ایک سبب تھی۔" ۳

۱۔ مضامین محمد علی حصہ اول از مولانا محمد علی ص ۲۸۲

۲۔ سفرنامہ پنجاب مرتبہ اقبال علی ص ۱۶۳

۳۔ علی گڑھ موومینٹ (انگریزی) ص۔ ۱۲۰

مسلمانوں میں ان کی جتنی بھی مخالفت ہوئی مذہب کے قدیم تصور کے تحت ہوئی۔ مذہب کے سلسلے میں ان کے اجتہادی رویہ کو مخالفین، مذہب سے انحراف کہتے تھے۔ چنانچہ علماء کے اختلاف کے ساتھ عام لوگ بھی مذہب کے نام پر بغیر سمجھے اس مخالفت میں حصہ لیتے تھے۔ اور ان کے تمام اقدامات کو شک وشبہ اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس مخالفت کی رو میں سیکڑوں مضامین، متعدد فتاویٔ کفر اور کتنے ہی رسالے نکالے گئے ایسے رسالوں میں نور الانوار اور نور الافاق وہ خاص رسالے ہیں جو ان کی مخالفت میں ہمیشہ شدت کے ساتھ پیش پیش رہتے تھے۔ حتیٰ کہ مولوی علی بخش مکہ شریف اور مدینہ شریف سے ان کے لئے کفر کے فتوے لکھوا لائے، جن کا بہت زور شور سے عوام میں چرچا کیا گیا یہ اعتراضات صرف مذہبی نظریات تک ہی نہ تھے بلکہ ان کی شخصیت پر حملے ہوتے۔ جی بھر کر انھیں برا بھلا کہا جاتا۔ میز کرسی اور کانٹے چھری کے استعمال پر انھیں بے دین اور عیسائی کہا جاتا۔ انگریزی لباس اور جوتے کے استعمال پر انھیں دشمن دین بتایا جاتا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ جو شخصی طور پر ان سے ناواقف تھے، بہت سادگی سے انھیں عیسائی سمجھتے۔

سرسید محققانہ مخالفت سے کبھی نہ گھبراتے تھے اور نہ اسے برا سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی انھیں اس قسم کی اندھی مخالفت اور شور وشغب کی ذرا بھی پرواہ نہ ہوتی تھی اور نہ وہ ایسی مخالفتوں کے باعث جس چیز کو صحیح سمجھتے اس کے کرنے سے جھجکتے تھے۔ مگر ایسی مخالفتوں کے باعث جب ان کے تعلیمی مقاصد کو نقصان پہنچتا تھا یا ان میں تاخیر ہوتی تب وہ بہت رنجیدہ خاطر اور پریشان ہو جاتے تھے۔

مدرستہ العلوم کی تکمیل میں سب سے زیادہ رکاوٹیں انھیں علماء کی مخالفتوں کے باعث پیدا ہوئیں یہ لوگ مشہور کرتے تھے کہ وہاں کی تعلیم سے لڑکے دہریئے اور بے دین ہو جائینگے اور سرسید اپنے مذہبی نظریات کی تعلیم اس مدرسہ میں دیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے چندہ دینا حرام اور لڑکوں کو برائے تعلیم وہاں بھیجنا مذہبًا ناجائز ہے۔ پھر بھی ہر مخالفت ان کا جذبہ عمل تیز کر دیتی تھی۔ یہ سرسید کی اولوالعزمی اور بیدار مغزی تھی جس نے ان تمام پہاڑوں کو اپنے راستے سے ہٹا کر چھوڑا۔ مذہبی وسماجی بیداری میں انقلاب پیدا کر کے کایا پلٹ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند سال کے عرصہ میں جن چیزوں کی مخالفت ہوا کرتی تھی وہ سب عمومًا غیر محسوس طور پر قبول کی جانے لگیں۔ انھوں نے ادبی میدان میں جو کارنامے انجام دیے

اسے اردو کے جدید ادبی انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سرسید کا تحریکی مشن کس حد تک کامیاب و ناکام ہوا اس کا اندازہ ان باتوں سے ہو سکتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شدید مخالفتوں کے باوجود سرسید کی شخصیت و عظمت کا سکہ دوستوں پر ہی نہیں مخالفوں پر بھی جما ہوا تھا۔ جو لوگ ان کے نظریات سے اختلاف کرتے تھے لیکن ان کی شخصیت سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے تھے وہ بھی ان کی نیک نیتی اور سچی لگن کے معترف تھے۔ سرسید سے اختلاف یا تو ان کے مذہبی نظریات کی جدت سے کیا گیا یا ان کے سیاسی نظریات کی بنا پر جواب تک زیر بحث آ جاتے ہیں۔

مولانا قاسم نانوتوی سے جب مدرسۃ العلوم کے درس مذہبی کے لئے کورس تیار کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ سرسید اپنی مداخلت سے بالکل باز آئیں تب ہی وہ اس ذمہ داری کو اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ مدرسۃ العلوم کے قیام کی شدید ضرورت کے پیش نظر سرسید کو یہی کرنا پڑا۔ شیخ محمد اکرام ٹرسٹیان کالج کے نزاع کے سلسلے میں لکھتے ہیں "اگرچہ سید محمود کی جوائنٹ سکریٹری شپ پر نکتہ چینی کا بڑا موقع تھا لیکن سرسید کے کسی ذمہ دار مخالف نے ان پر خودغرضی کا الزام نہیں لگایا۔ مولوی سمیع اللہ نے بل کی اس دفعہ کی سخت مخالفت کی اور اس کشمکش نے بڑی تلخ صورت اختیار کی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مولوی سمیع اللہ نے پھر بھی یہ نہیں کہا کہ سرسید اپنے بیٹے کی محبت میں سرشار ہو کر اسے جوائنٹ سکریٹری بنا رہے ہیں، بلکہ اصولی اختلاف اور یوروپین اسٹاف کے مسئلے پر اپنی مخالفت کی بنیاد رکھی۔" ۱

جہاں تک مذہبی اختلاف کا تعلق ہے "سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے انداز تحریر میں ایک بات اہل علم کو ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ معذرت آمیز طرز بیان اختیار کرتے تھے۔ اور ہر حالت میں اسلام کو مغربی علوم و خیالات کے مطابق ثابت کرنے کے درپے تھے۔" ۲ شبلی کا ان سے اختلاف نظریہ اسی بنیاد پر تھا۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔ "علی گڈھ میں رہ کر اور کالج کی پیداوار کو دیکھ کر مولانا شبلی

۱۔ موج کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۹۶

۲۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، از عبدالمجید سالک ص ۶۴۴ - ۶۴۱

سرسید کی تحریک کے بعض حصوں سے سخت بیزار ہو گئے تھے۔"[1] شبلی کو ان کے اس طرز سے اختلاف تھا کہ وہ قدیم کو جدید میں سمو دینے کے قائل تھے اس کے برعکس شبلی جدید کو قدیم کے ڈھانچے میں ضم کرنا چاہتے تھے۔ اسی بنا پر شبلی کو حیات جاوید فقط مدلل مداحی نظر آئی مگر اس رائے سے کلی اتفاق کیا گیا ہے کہ شبلی خود ان کی اعلیٰ شخصیت اور اس کے عظیم اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خود دارالمصنفین بھی سرسید کے جدید خیالات کے فیض سے وجود میں آیا۔ وہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی ملی و قومی زندگی کو ایک نیا موڑ دے چکے تھے۔

خود ان کے زمانے اور مابعد کے زمانہ قریب میں شبلی کے علاوہ ابوالکلام آزاد ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور مولانا محمد علی وغیرہ نے ان کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا اور جنگ آزادی میں فوری حصہ لینے کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے ان کی شخصیت پر حملہ کرنے کی جرأت کی ہو یا ان کی نیت پر شبہ کیا ہو یا ان کے خلوص اور سچی ہمدردی قوم و وطن پر معترض ہوا ہو۔ ان حضرات اور سرسید میں بنیادی فرق یہ تھا کہ یہ لوگ سیاست داں تھے اور سرسید مصلح قوم۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قومی اصلاح کو ہمیشہ اولیت دیتے تھے اور سب ضرورتوں پر اس کو ترجیح دیتے تھے مگر در اصل ان حضرات کو بھی سرسید کی عظیم تحریک سے ہی ذہنی غذا ملی تھی جن میں مولانا آزاد کے علاوہ باقی سب علی گڑھ اور ایم، اے، او کالج کے تربیت یافتہ اور مستفیض تھے۔ مولانا آزاد جو ہمیشہ کانگریس کے سرگرم اور مشہور کارکن رہے، ایک جگہ سرسید کے فیضان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" سرسید کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کر لی۔" آگے چل کر لکھتے ہیں: "سرسید کی تصنیفات کے مطالعے نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا بلکہ شائق و گرویدہ بنا دیا تھا اب وہ دن تھا کہ عقائد و افکار میں ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔ میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی۔ تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں۔ علوم جدیدہ اور یہ ترکیب سرسید

---

[1] مسلم ثقافت ہندوستان میں از عبدالمجید سالک۔ ص ۶۴۴ - ۶۴۱

مرحوم ہی کی ہے۔"۱

مولانا محمد علی لکھتے ہیں:۔"میں نے آٹھ برس علی گڑھ میں تعلیم پاکر ان کی افتاد طبع کا مطالعہ کیا ہے اور یہ مطالعہ مجھے اس امر کے اعلان پہ مائل بلکہ مجبور کرتا ہے کہ تملق اور چاپلوسی جن کا ان کے سیاسی معترضین ان پر الزام رکھتے ہیں ان کی فطرت سے کوسوں دور تھی۔ یہی نہیں بلکہ وہ زمانہ سازی بھی جس کی کسی قدر جھلک ان کی پالیسی میں نظر آتی ہے۔ ان کی آزاد طبیعت کو بہت ناگوار تھی اور گو اخباروں کی سرخیوں میں یہ ناگواری سرسید کے نام کے ساتھ نظر نہ آتی ہو لیکن ہم لوگ جو اس وقت علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے خوب جانتے تھے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت تھی۔ جس سے کالج کا یورپین اسٹاف اور حکومت کے افراد ہرگز ناواقف نہ تھے۔"۲

سرسید کی حد درجہ صاف گوئی مذہب سے سچی عقیدت خدا و رسولؐ سے والہانہ محبت واستقلال ان کے وہ خاص اوصاف تھے جو ان کی تمام عمر کی عملی کاوشوں میں نمایاں ہیں۔ بے غرضی اور خلوص ان کی فطرت میں بھرا ہوا تھا:"ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ برائی کرنے والوں کی برائی سے ہم کو کیا کام ہے۔ ہم کو اپنا دل اپنا کام اپنی زبان بھلی رکھنی چاہئے۔ برائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہئے ...... میرے نزدیک منشی ... ۔ کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہئے۔ خدا کی دنیا میں بہت مختلف قسم کی خلقت ہے ہر ایک اپنا کام کرتا ہے تم اپنا کام کرو۔ مگر جان لو کہ تمہارا کام کیا ہے۔ نیکی بھلائی اور اپنے کام سے مطلب دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں جس سے دل رکا ہے اس سے مت ملو کیونکہ اس سے مل کر خوشی نہ ہوگی یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑیگی۔"۳

سرسید کی ایسی ہی پرخلوص بے غرض اور بے لوث خدمت اور خیالات نے باوجود مخالفتوں کے بھی عام دلوں میں ان کی شخصیت کا احترام پیدا کر دیا تھا اور ہر وہ شخص جو ذرا بھی ان سے

۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی ص ۲۵۲-۲۵۷۔

۲۔ مضامین محمد علی ص ۲۸۹

۳۔ بحوالہ حیات جاوید ص ۵۶۳ (خط بنام منشی سراج الدین) حصہ دوم طبع سوم ۱۹۲۲ء

اور

مکتوبات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۴۸۶ و ۴۸۷۔

ذاتی واقفیت رکھتا تھا ان کے اوصاف سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سرسید کا جو احترام عام دلوں میں گھر کر چکا تھا اور حکام کی نظروں میں جتنی ان کی قدر و منزلت تھی اس کے پیش نظر وہ قدم قدم پہ ذاتی فوائد حاصل کر سکتے تھے۔ مگر یہ سچا خادم قوم و وطن جب اس دنیا سے گیا تو بقول آرنلڈ Arnold "نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو اور جب وہ مرا تو اس کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسہ گھر سے نہ نکلا" ۱

یہ سرکار پرستی نہیں بلکہ ان کی مخلص اور بلند شخصیت تھی جس نے بڑے بڑے انگریز عہدیداروں کو مرعوب کر دیا اور سرسید کی عزت اور قدر و منزلت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ ہمیشہ ان کے ساتھ بھائی چارہ رکھتے تھے اور برابری کا سلوک کرتے تھے سرسید کسی انگریز افسر کی بے جا بات کو ہرگز گوارا نہ کرتے تھے اور نہایت صاف گوئی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے تھے۔ مثلاً۔ ولیم میور کی کتاب کے جواب میں انھوں نے خطبات احمدیہ لکھی۔ اس نظریاتی اختلاف کے باوجود اس سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ مگر انگلینڈ کے زمانۂ قیام میں ولیم میور کی کسی اسپیچ سے انھیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس نے ایک معاملہ میں ان پر غلط الزام لگایا ہے تو واپسی پر وہ اس سے ملنے بھی نہ گئے۔ حتیٰ کہ خود ولیم میور نے خط لکھا کہ وہ ملنے کا منتظر ہے۔ اس قسم کے کتنے ہی واقعات ان کی زندگی میں ملتے ہیں۔ مولانا حالی نے اس قسم کے قبل از غدر کے چند دلچسپ واقعات کا ذکر حیات جاوید میں کیا ہے جو ان کے اور انگریز افسران کے ضمن میں ہیں۔ یہ افسران سرسید کی بے باک، بے غرض، سچی اور خود دار شخصیت کے قائل ہو جاتے تھے اور ان کے اصول کی سچائی کی بنا پر ان کی باتیں مان لینی پڑتی تھیں۔ (نوٹ) ۲ سرسید باوجود افسران کی عزت و احترام کرنے کے ان لوگوں سے دبتے نہ تھے اور سچائی کے اظہار میں ذرا نہ جھجکتے تھے۔ حالانکہ سرکار کے وفادار خوشامدی امراء اور ملازمین کی اس وقت کمی نہ تھی جن سے معمولی انگریز افسر بھی ہمیشہ برتری جتاتے ہوئے غرور سے ملتے تھے۔

سرسید کی تحریک اس کے عظیم نتائج اور ان کی قابل قدر شخصیت کے مطالعہ کے بعد ہمیں

۱۔ موج کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ص ۱۰۱

۲۔ نوٹ:۔ تفصیل کے لئے دیکھیں حیات جاوید ص ۲۲۹ (طبع سوم ۱۹۲۲ء)

اس چیز کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ سرسید نے اپنی تحریک اور اپنے خیالات کی اشاعت میں کہاں تک اپنے دوستوں کی مدد حاصل کی۔ مخالفت کے طوفان کے باوجود ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا جو ان کے نظریات و خیالات کو بنظر تحسین دیکھتا اور ان سے ہمدردی رکھتا تھا۔ ایسے لوگوں میں صرف وہی اشخاص شامل تھے جو سرسید سے شخصی طور پر واقف تھے اور ان کی سچی لگن اور اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ان معاونین میں کئی قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو وہ جو سرسید کے معاونین خاص گنے جاتے ہیں جنھوں نے ان کے نظریات کی کھلے عام تائید کی اور حتی الوسع ان کے رفیق کار رہے۔ دوسرے وہ جو جدید نظریات اور نئی تعلیمی ضرورت سے اتفاق کرتے تھے مگر مذہبی معاملات میں ان کے مخالف تھے۔ یہ لوگ ان کے مضامین شوق سے پڑھتے اور ان کے خیالات کی تائید کرتے تھے ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرکے اور بچوں کو مدرسۃ العلوم میں بغرض تعلیم بھیج کر تحریک کے معاونین میں شمار ہوتے تھے تیسرے وہ لوگ جو سرسید کے خیالات سے متاثر تو تھے اور انھیں بنظر تحسین دیکھتے تھے مگر خود کوئی عملی حصہ نہ لیتے تھے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پہلی قسم کے لوگوں نے جو ہر طرح سے ان کے معاون رہے کہاں تک ساتھ دیا۔ اور کس حد تک اپنی کارروائیوں سے سرسید کے مشن کو کامیاب بنایا۔ ان کے عزیز ترین رفقاء میں وقار الملک، محسن الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ یہ لوگ سرسید کے بڑے محسن اور رفیق کار تھے۔ مولوی چراغ علی نے ہمیشہ سرسید کے مذہبی خیالات کی تائید کی۔ "ان کے تمام مذہبی مضامین اور تصانیف اس کے شاہد ہیں۔ جن لوگوں کو سرسید کی جوش و جذبہ سے بھری تحریروں کا تحمل نہیں تھا ان کے لئے مولوی چراغ علی کی متین تحریریں کافی مفید ثابت ہوتی تھیں۔" ۱ (نٹ نوٹ نمبر ۹)۔۲

محسن الملک اور وقار الملک سرسید کی تحریک اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے اہم اشخاص میں سے تھے جو ان کے مخلص دوست اور معاون تھے اور ان کے

۱۔ داستان تاریخ اردو مصنفہ حامد حسن قادری ص ۴۰۴

۲۔ (دیکھیں تفصیلی نٹ نوٹ نمبر ۹ باب چہارم) ص ۳۲۵

انتقال کے بعد اس تحریک کی رہبری انھیں حضرات کے ہاتھ میں رہی۔ ۱ مگر سرسید کی زندگی میں اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کے باعث ان کی توقعات اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق ان کے ہر کام میں حصہ لینے سے معذور تھے۔ ان حضرات نے بھی سرسید کے مذہبی اور مجتہدانہ خیالات سے اختلاف کیا ہے "قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز برل جانا ہے ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود یقین ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین ہے کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔" ۲ حالی نے اردو ادب و شاعری کے لئے جو کچھ کیا اسے بھی سرسید کے گہرے اثرات سے جو اردو ادب پر ہوئے الگ نہیں کیا جا سکتا مگر اس سے قطع نظر صرف ان کی مسدس نے غفلت سے قوم کو جھنجھوڑ دینے میں جو کام کیا وہ سب پر عیاں ہے اور جو سرسید کے مشن کا ایک خاص جز تھا۔ حفیظ جالندھری نے کیا سچ کہا ہے۔

جگا کر خاکیوں کو گنبد افلاک کے نیچے

وہ حالی سو گیا اپنے وطن کی خاک کے نیچے

مسدس کے ذریعہ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے مقاصد کو بڑی مدد ملی۔

مولوی نذیر احمد بھی سرسید کے مداحین اور معاونین میں سے تھے۔ مولوی مہدی علی لکھتے ہیں "ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے جو احسان اپنی فصیح و بلیغ تقریروں اور پر زور تحریروں اور بے نظیر لکچروں اور علمی اور اخلاقی اور مذہبی تصنیفوں سے قوم پر کیا ہے وہ سب جانتے ہیں مگر تہذیب الاخلاق کا دوبارہ جاری کرانا بھی انھیں کا حصہ تھا۔ انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو کچھ ایسا دیوانہ کر دیا کہ ہر شخص تہذیب الاخلاق

۱۔ نوٹ:۔ تفصیل کے لئے دیکھیں حیات محسن اور وقار حیات از محمد امین زبیری

۲۔ حیات جاوید دیباچہ طبع اول ص ۱۰

تہذیب الاخلاق پکارنے لگا۔ اور چاروں طرف اس کے دوبارہ جاری کرنے کا شور مچ گیا۔[۱] کانفرنس کے جلسوں اور عام پبلک کے اجتماع کے موقع پر اکھوں نے ہمیشہ سرسید کے خیالات کی تائید کی ہے۔ ایسی ہی ایک کانفرنس میں ایک نظم پڑھی تھی جس کے دو متفرق بند مندرجہ ذیل ہیں اور جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ زمانے کی ضرورتوں کے ہم آواز اور سرسید کے ہم نوا تھے۔

کچھ نہ پوچھو آج ہم لکچر میں کیا کہنے کو ہیں
قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے کو ہیں

سید احمد خاں اور ان کے ضبط و استقلال پر
آفرین و حبذا و مرحبا کہنے کو ہیں
گر مسلمانوں کو کشتی فرض کر لو فی المثل
ان کو کشتی کا مبارک ناخدا کہنے کو ہیں

ایک اور نظم میں کہتے ہیں :-

باوا کو دیکھا عالم و فاضل تھے مستند
پوتے سے پوچھتے ہیں تو حرف آشنا نہیں
باوا فقیر تھے کہ انھیں پوجتے تھے لوگ
بیٹا فقیر ہے کہ کوئی پوچھتا نہیں[۲]

سرسید کے دوستوں کے تذکرے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گو سرسید کے مداحین و معاونین کی تعداد خاصی تھی نیز ان کی قابل قدر کوششیں ناقابل فراموش ہیں جو سرسید

۱۔ تہذیب الاخلاق ۱۳۱۱ھ مضمون "مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا" از مہدی علی۔

۲۔ لکچروں کا مجموعہ از ڈاکٹر نذیر احمد مرتبہ مولوی بشیر احمد، حصہ دوم ص ۸۰-۹۶-۱۳۶ (در لکچر محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس گیارہواں اجلاس بمقام میرٹھ)

کے مشن میں اکثر معاون نظر آتی ہیں مگر ان حضرات کا تعاون ایک حد تک خود ان حضرات کی شخصیتوں تک محدود تھا اور سرسید سے ذاتی لگاؤ اس میں معاون تھا۔ ایسے معاونین کی کوئی اجتماعی تنظیم نہ تیار ہو سکی جو مستقل طور پر ہر میدان میں ان کے اصول و نظریات کی تعبیر اور گراں قدر مقاصد کی تکمیل میں مسلسل اور منظم طور پر حصہ لیتی۔ سرسید کے معاونین وہی لوگ تھے جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھے اور دوستانہ مراسم رکھتے تھے اور ان کے سچے جذبۂ خدمت سے متاثر تھے۔ یہ لوگ ان کے خیالات اور رجحانات کو بہ نظر تحسین دیکھتے تھے مگر ساتھ ہی ان کے تمام خیالات سے متفق بھی نہ تھے۔ ان سب کی کاوشوں میں ذاتی تاثر و تعلق کو زیادہ دخل تھا۔ ان میں سے کوئی بھی سرسید کے فکر و عمل کی وسعت و گیرائی کو نہ پا سکا۔ اسی وجہ سے سرسید کو اپنے ساتھیوں سے جو مدد و ہمدردی ملی اس میں ایسی تنظیمی جہد کی کمی تھی جو ان کے فکر و عمل کے تمام دائروں کو سمیٹ لیتی۔

چنانچہ ان کے مخلص ترین دوست اور عزیز ترین معاونین بھی اس وسیع تحریک کے عظیم مقاصد میں اجتماعی کوششوں اور تنظیمی جہد کے ساتھ تعاون نہ کر سکے ان سب کی کوششیں اور مدد فرداً فرداً شخصی طور پر زیادہ تھیں جو سرسید کی بے لوث خدمت اور پرخلوص شخصیت سے مرعوب و متاثر تھے۔ یہی تاثر انھیں سرسید کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتا تھا۔ لہٰذا کسی نے مذہبی معاملات میں تائید کی کسی نے ادب میں کارنمایاں کرکے مقاصد میں جزوی حصہ لیا اور کچھ نے تعلیمی کانفرنس اور چندوں کے جلسوں میں ان کے ساتھ کام کیا۔ کسی نے ایم۔ اے۔ او کالج کی تکمیل اور اس کی بقا کے لئے اپنی کوششیں صرف کیں۔ پھر بھی ان کے وسیع خیالات اور عمق نگاہی میں نیز ان کے آزاد اور بے باک طریقوں میں کوئی انھیں نباہ نہ سکا۔ اگر سرسید کو معاونین کی ایک اجتماعی تنظیم حاصل ہوتی جو ان کی وسیع تحریک کے ہر جز میں اور ان کے تعمیری پروگراموں میں پورا حصہ لیتی تو سرسید اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اتنے دنوں میں جس منزل پر پہنچ سکے اس کے بہت پہلے قوم کو اس کامیابی کی منزل پر پہنچا دیتے جس کی انھیں تمنا اور حسرت تھی۔

سائنٹفک سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کے روح رواں وہ خود تھے۔ علی گڈھ تبادلے کے ساتھ اس کا دفتر سرسید کو وہیں منتقل کرنا پڑا کیونکہ بغیر ان کی نگہداری کے اس

کا چلنا اور سوسائٹی کا اخبار نکلنا مشکل تھا۔ غازی پور سے تبادلے کے بعد تبئیس الکلام کی تکمیل نہ ہو سکی کیونکہ یہ ان کی شخصی کوششوں اور اخراجات پر منحصر تھی۔ ورنیکولر اسکیم کے تحت (جب کہ وہ اس کے حامی تھے) گورمنٹ سے گرانٹ ان ایڈ کا وعدہ لے کر ایک طویل فہرست ایسی کتابوں کی تیار کی جس میں اردو زبان میں ہر طرح کے جدید علوم اور مضامین نیز درسی کورسوں کے لئے مناسب کتابوں کی تصنیف کی اسکیم تھی لیکن انھیں اردو زبان میں جلد سے جلد ایسی کتابوں کی تصنیف و تراجم کے لئے کوئی چار چھ ساتھی نہ مل سکے کہ یہ اسکیم مکمل ہوتی چنانچہ یہ تشنہ تکمیل رہ گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے لغت لکھنا چاہی اور ایک اردو کی اعلیٰ ادبی تاریخ لکھنے کی طرف مائل ہوئے مگر مکمل نہ کر سکے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے سلسلے میں انھیں خود ایک ایک چیز کا انتظام کرنا ہوتا تھا اور جس شہر میں کانفرنس منعقد ہوتی وہاں جا کر مہمانوں کو ٹھہرانے تک کا کام اور جلسے کی تمام کارروائیوں اور رپورٹوں کی بنیادی ذمہ داری انھیں کے سر تھی۔ بلکہ اس کے اجلاس زیادہ تر علی گڈھ میں اسی لئے ہوتے تھے کہ دوسرے شہروں کے لوگ اس کی تنظیم میں جتنی ذمہ داری اور حصہ چاہئے نہ لیتے تھے اور سرسید کی مشغولیت کی بنا پر ان کو علی گڈھ میں سہولت ہوتی تھی۔ شروع شروع میں کالج کے لئے جتنا چندہ جمع ہوا وہ زیادہ تر سرسید کی تنہا کوششوں کا نتیجہ تھا وہ شہر بہ شہر جا کر دردمندانہ تقریریں کرتے اور دوستوں اور مخلصوں سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ چندہ کی وصولی میں طرح طرح کی ترکیبیں کرتے حتیٰ کہ بیسوں اور آنوں کا بھی چندہ قبول کرتے۔ ۱ کالج کی عمارات اور بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر بھی تنہا ان کے سر تھی۔ روپئے کی کمی کی وجہ سے انجنیئرز وغیرہ کی مدد لینا امکان میں نہ تھا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ دن دن بھر تعمیری کاموں کو دیکھتے حتیٰ کہ مزدوری کا حساب کتاب تک کرتے تھے۔

کالج میں مختلف انجمنوں کا قیام، ان کی تشکیل و تنظیم اور سرپرستی سرسید ہی کی محنت کی رہین منت ہوتی تھی۔ تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو اس کی تیرہ سالہ عمر میں اس کے اوراق کو اکثر و بیشتر سرسید ہی کے مضامین نے زینت بخشی۔ چنانچہ اس کی

۱۔ نوٹ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید ص ۱۳۲-۱۴۲ (طبع سوم سنہ ۱۹۳۲ء حصہ اول)

اشاعت کے اولین چھ سالوں میں ۲۶۲ میں ۱۱۲ مضامین صرف سرسید کے تھے۔ "ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دوراز کار نہ خیال کریں گے اور نہ اس پر التفات کریں گے جو ہمارے ناصح نورالآفاق نے اخیر پرچے میں لکھا تھا بلکہ یہ خیال کریں گے کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے کام میں مصروف ہوں گے جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔"[۱] جب تہذیب الاخلاق دوستوں کے اصرار پر دوبارہ جاری ہوا تو ان کے معاونین کے قلم اس کی ضرورت کا ساتھ نہ دے سکے۔ لہٰذا رسالے کے آخری سالوں میں زیادہ تر سرسید کی مذہبی تصانیف کے حصے، کانفرنس کی رپورٹیں، کالج کی اسکیم کی تفصیل وغیرہ ملتی ہے۔ آخر کے رسالوں میں بار بار یہ اشتہار شایع ہوئے کہ مضامین اشاعت کے لئے حسب ضرورت نہیں ملتے اس لئے اسے بند کرنا ہوگا" چنانچہ بعد میں اسے بند کرکے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ضم کر دیا گیا۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں تمام چھوٹی بڑی چیزوں کی ذمہ داری نہایت مستقل مزاجی اور عالی ہمتی سے سنبھالتے رہے۔ اپنے ہم عصروں اور دوستوں کی مدد و اعانت ان کی نظر میں تھی اور وہ اس کی بڑی احسان مندی کے ساتھ قدر کرتے تھے۔ لیکن ان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ باوجود ایک احساس بیداری کے قوم میں اب تک ایسا کوئی موجود نہیں جو قومی ترقی کے مقاصد اور بنیادوں کے پیش نظر ان کا مکمل ساتھ دے سکے۔ "میں دن رات اس غم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ خصوصاً مجھ سے آدمی کا جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ طے کر لیا ہے۔ جب میرے کوچ کا وقت آن پہونچے گا تو کون شخص اس تمام کام کو اٹھائے گا۔ اور کون شخص اس کو انجام کو پہنچائے گا۔ اگر خدائے تعالیٰ کوئی ایسا شخص پیدا کرے جو میری زندگی ہی میں مجھ کو اس کام سے (تعلیمی اشاعت سے) آزاد کر دے اور تمام بوجھ اپنے اوپر اٹھالے تو مجھ کو اس سے زیادہ خوشی وخرمی کا کوئی وقت نہیں ہونے کا مگر جب تک میری

۱۔ آخری پرچہ تہذیب الاخلاق بابت رمضان المبارک ۱۲۹۳ھ بحوالہ مقالات سرسید ص ۶۲ حصہ دہم مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی طبع اول دسمبر ۱۹۶۲ء مطبوعہ زرین آرٹ پریس لاہور۔

زندگی ہے مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کو کوئیں میں گرتا دیکھوں اور چپکا بیٹھا رہوں اور اپنی قوم کو مرتا پاؤں اور اس کے منہ میں پانی نہ چواؤں "۱ ان الفاظ میں جو تفکر ہے وہ درد بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

سرسید غدر کے بعد سے آخری وقت تک مذکورہ تمام اصلاحات و خدمات میں تن من دھن سے لگے رہے۔ اپنی مشغولیات کے سلسلے میں تمام چھوٹی بڑی ذمہ داریاں خود سنبھالتے اور چاہتے کہ زندگی کا کوئی لمحہ بیکار نہ جائے۔ ان کے پاس نہ اتنا ذاتی سرمایہ تھا جو ہر اسکیم کے لئے کافی ہوتا اور نہ انھیں ایسے ساتھی ملے جو ان اسکیموں کے لئے ضرورت کے مطابق زر کثیر صرف کر کے ایسے قومی کاموں کا پورا بار اٹھا لیتے۔ جس قدر چندہ انھیں عوام یا اپنے خاص معاونین سے ملتا تھا وہ یکسر ناکافی تھا۔ دیگر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے لئے دردسر بنی رہتی تھیں۔ اگر مسلم امراء اس طرف توجہ کرتے تو ان میں سے ہر ایک کے ذریعے کئی کئی بڑے قومی کام انجام پا سکتے تھے۔

سرسید نے اپنی زندگی کے چالیس سال ہر طرح کی مشکلات اور مخالفتوں کا تنہا مقابلہ کرتے ہوئے خدمات ملک و قوم میں صرف کئے ان کے معاونین نے خدمات و اصلاحات میں ساتھ تو دیا مگر اتنا ہی جیسے اپنی توفیق کے مطابق کسی بھلائی کے کام میں شرکت کی جائے، اس طرح نہیں کہ ایک منظم تحریک کی ذمہ داریاں قبول کر کے اس کا بوجھ بانٹ لیا جائے۔ بقول مسٹر پورٹر Mr. Portar " انھوں نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی ذاتی آسائشوں اور ذاتی افزائشوں کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں اپنا وقت اپنی طاقت اپنا روپیہ اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لئے صرف کر دیا" ۲

۱۸۹۵ء میں جب ہیڈ کلرک شام بہاری لال غبن کے جرم میں پکڑا گیا اور کالج فنڈ سے ایک لاکھ سے زیادہ کے غبن کا حال کھلا تو سرسید کو بے حد رنج اور شدید صدمہ

۱۔ لکچر ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء جلسہ صدر انجمن لاہور۔

از مجموعہ لکچرز و اسپیچز مرتبہ محمد امام الدین گجراتی ص ۱۱۳ (نول کشور پریس لاہور)

۲۔ بحوالہ حیات جاوید ص ۳۰۹ (حصہ اول پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

پہنچا۔ انھوں نے قومی تعلیم کے لئے کوڑی کوڑی جوڑنے میں بڑی مشقت اور محنت اٹھاکر جو سرمایہ جمع کیا تھا وہ اتنی آسانی سے شخصی طمع کی نذر ہوگیا۔ اب انھیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ کس طرح اتنے بڑے نقصان کی تلافی کی جائے۔ حالی لکھتے ہیں۔ "۱۸۹۷ء میں سید محمود کی علالت اور خلل دماغ نے ان پر ایک نئی مصیبت ڈالی۔ اس زمانے میں جو تلخ اور ناگوار حالات ان پر گذرے انھیں بڑے صبر و تحمل سے جھیلتے رہے۔ مگر اس صدمہ نے اندر ہی اندر اپنا کام کیا۔ سرسید کی اس وقت کی ذہنی اذیت اور اس عالم میں بھی حق پسندی کا اندازہ تذکرہ سرسید کی ایک تفصیل سے ہو سکتا ہے۔ (فٹ نوٹ نمبر ۱۰) ۱ مگر یہ ان کی عالی ہمتی تھی کہ کالج کی بھلائی اور قومی تعلیم آخر دم تک ان کی مصروفیت بنے رہے۔ اس وقت بھی وہ تعلیم پر متعدد مضامین لکھ رہے تھے۔

سرسید کے انتقال سے صرف چند دنوں قبل اردو ہندی تنازعہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور فارسی رسم الخط کی مخالفت ہوئی۔ چنانچہ سرسید نے اپنے انتقال سے صرف آٹھ دن قبل اردو کی حمایت میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور الہ آباد میں جو کمیٹی اردو کی حمایت میں بنائی گئی تھی اس سے مراسلت کی۔ اس زمانے میں ایک عیسائی نے ایک رسالہ امہات الومنین کے خلاف شایع کیا جس میں حضرت محمدؐ اور کثرت ازواج پر اعتراضات تھے۔ سرسید محب رسولؐ اور محب اسلام تھے وہ بھلا خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لہذا پہلے تمہید کے طور پر اصول تنقید روایات پر ایک طویل مضمون لکھا اور پھر اس رسالہ کا جواب لکھنا شروع کیا۔ افسوس کہ یہ مکمل نہ ہو سکا تھا کہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو یہ خادم قوم و وطن راہئی ملک عدم ہوا گویا انھوں نے اپنی آخری سانس بھی خدمت قوم و وطن اور خدمت اسلام میں صرف کی۔

سرسید کی موت پر ملک میں جو سوگ منایا گیا اور جتنا اظہار غم ہوا اور سیکڑوں تعزیتی جلسے ہوئے وہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مسٹر آرنلڈ Arnold نے لاہور کے تعزیتی جلسہ میں کہا۔ "میں آج تک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے سرسید سے زیادہ شریف زندگانی بسر کی ہو۔ جو جاہ طلبی میں ان سے زیادہ

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں نوٹ نمبر ۱۰ باب چہارم) ص ۳۲۶۔

بے غرض ہو اور جو ان سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تئیں وقف کر دینے والا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے ایک دولت آپ کے لئے چھوڑی ہے وہ آپ ہی کے لئے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو اور آپ ہی کے سپرد یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اٹھاؤ۔ اور موجودہ فرائض زندگی جو کچھ ہیں ان سے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اس شخص نے آپ کے لئے ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی۔" ۱

جب ہم ان کی ساری زندگی کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سرسید نے جس کام کا بیڑا اٹھایا اسے تقریباً یکہ و تنہا اپنی ذاتی محنت کوشش اور عالی ہمتی سے پورا کرنے کی کوشش کی "جہاں ان میں اور بڑے بڑے اوصاف موجود تھے ان میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اول ان کی اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی اور دوسرے اعلیٰ درجہ کی دلیری۔" ۲ بے شک ملک و قوم کے لئے وہ اپنی خدمات کی بہترین نظیر چھوڑ گئے کہ کس طرح ایک واحد شخص بھی اپنی پرخلوص کاوشوں سے ایک دور کو بدل ڈالتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اصلاحی کاوشوں میں حصہ لینے کے باوجود ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی آزاد خیالی، وسیع النظری علو ہمتی اور تجدید راہ میں ان کا مکمل ساتھ نہ دے سکا۔ سرسید ہر زاویۂ نگاہ سے اپنے زمانے اور ہم مشربوں سے صدیوں آگے تھے۔

۱۔ بحوالہ حیات جاوید ص ۳۱۲ - ۳۱۳ (حصہ اول پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

۲۔ تقریر مسٹر پورٹر M. A. Porter بحوالہ حیات جاوید ص ۳۰۸ (حصہ اول پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

باب پنجم

سرسید کی ادبی خدمات

سرسید کی تحریک میں وقتی و مرکزی حیثیت اعلیٰ مغربی علوم اور انگریزی کی تعلیم کو حاصل تھی۔ خصوصاً مسلمانوں کو ان جدید علوم سے آراستہ کرکے انھیں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ تاہم اس تحریک کا اہم اور بنیادی جز اس کے زبردست ادبی اثرات نیز اردو ادب کی خدمات ہیں جو بجائے خود ایک زبردست ادبی تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تحریک کو عملی فوائد کے حصول کے لئے سکون و امن کی فضا اور اشتراک تعاون کے ماحول کی ضرورت تھی۔ ہمارے ملک کی رنگارنگی میں ہندوستانی وحدت کی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لئے صرف مشترکہ تہذیبی قدروں سے ہی کام لیا جا سکتا تھا۔ قوموں کی تاریخ میں تہذیبی اشتراک نے ہمیشہ ایک مثبت قوت کا رول ادا کیا ہے۔ اس کے ذریعے مذہبی رواداری حسین تر اور سیاسی اتحاد مضبوط تر ہوتا تھا۔ یگانگت کی یہ کڑیاں تاریخ میں ایک اجتماعی طاقت بن جاتی ہیں۔ یہ تہذیبی اتحاد، زبان، رہن، سہن، طور طریقوں، کھانے پینے، لباس اور دلچسپیوں کی یک رنگی سے قائم ہوتا ہے۔ جو ایک ہی قسم کی اور ایک ساتھ کی تعلیم و تربیت اور رواجی و تفریحی یکسانیت سے بڑھتا ہے۔ ہم یقیناً ایسی مشترک تہذیب سے تہی دست نہیں تھے۔

مغلیہ دور نے تہذیبی اقدار کے اشتراک سے وہ تاریخی ترکہ چھوڑا تھا جس میں ہر مذہب و ملت کے ہندوستانی شامل اور اس کی تشکیل میں سب برابر کے شریک تھے۔ یہ تہذیبی

اشتراک ہی تھا جس نے دور متوسط کے ہندوستان کو باوجود عقائد کی رنگارنگی کے یکسانیت و موانست، محبت و رواداری کی حسین لڑیوں میں پرو رکھا تھا۔ جس کی وضاحت پچھلے ابواب میں ہو چکی ہے۔ یقیناً انگریزی تسلط سے پہلے تہذیبی اعتبار سے یگانگت و محبت کے مضبوط رشتے استوار ہو چکے تھے۔ اس وقت صلح و جنگ میں خالص جاگیردارانہ مسائل درپیش ہوتے تھے اور بلاتفریق مذہب سب ایک دوسرے کے ساتھ شریک صلح و جنگ ہوا کرتے تھے۔ آخر وہ کون سی چیز تھی جو سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا کرتی تھی۔ بے شک وہ صرف تہذیبی یک رنگی تھی۔ جس نے محبت و یگانگت کے حسین نقوش بنانا اور ہندوستانی وحدت کا مضبوط قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خصوصیت نئے ہندوستان میں تیزی سے زائل ہو رہی تھی۔ قدیم تہذیبی اشتراک منتشر ہو رہا تھا کیونکہ مغرب کے اثرات نے ان قدیم قدروں میں شامل ہو کر ایک نیا تہذیبی رخ واضح نہیں کیا بلکہ نئی معاشرت قدیم تہذیب کے کھنڈروں پر اپنا بلند قلعہ تعمیر کرنے لگی۔ جہاں نئے نقوش تھے نیا رنگ اور نیا حسن تھا مگر وہ کڑیاں غائب تھیں جو مختلف رنگوں اور نقوش میں ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہیں۔ حکومت کے تعلیمی ادارے صرف انگریزی تعلیم دیتے تھے۔ مغرب کی عقلیت پسندی ایک طرف، مذہب سے بڑھتی ہوئی عام ناواقفیت دوسری طرف، جن کے باعث لوگوں میں تمام مشرقی قدروں سے بدظنی عام ہونے لگی۔ ساتھ ہی سماجی زوال، روایتی بندھنوں کی سختی، عام جہالت اور پستی نے لوگوں کو سوچنے اور ان سے چھٹکارا پانے پر مجبور کر دیا۔

راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں سب سے پہلے اسی بنا پر ہندوؤں کی سوشل اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ان کی رسمی نیز مذہبی روایات کی تصحیح کے لئے بہت ہمت و حوصلے اور کامیابی کے ساتھ کام کیا۔ غدر کے بعد سرسید کو بھی مسلمانوں میں ایسی سوشل اور مذہبی اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی جن کے بغیر ان کا سنبھلنا ممکن نہ تھا مگر یکساں تعلیم و تربیت کا اب تک ہندوستان میں کہیں بھی کوئی انتظام نہ تھا جو ذہنی موانست پیدا کرتا۔ سرسید نے اسی ذہنی و تہذیبی اشتراک و اتحاد کے لئے تربیت پر بہت زیادہ زور دیا۔ فرماتے ہیں: "اے دوستو! تربیت اور تعلیم دو چیزیں ہیں صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا ہے بولنے میں تو یوں آتا ہے

کہ تعلیم اور تربیت مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کو اس پر خیال کرنا چاہئے کہ اگر لوگوں کی تعلیم کا گورنمنٹ کے اسکولوں پر بھروسہ کرتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تربیت بھی پاسکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد مارل کی درستی ہے"۔ ۱

لہٰذا انھوں نے پہلی بار علی گڈھ کے تعلیمی ادارے میں طلبا کی رہائش اور اس میں ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کا انتظام اور اہتمام کیا۔ یہاں پر ہر مذہب و ملت کے لوگ بلا امتیاز تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے جس کی خود انھیں کے الفاظ سے بہتر وضاحت ہوتی ہے "یہی خیالات میرے دل میں تھے جب کہ میں نے علیگڑھ کالج کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اور اس کو ایک ایسا وسیع تعلیم گاہ بنانا تجویز کیا جن میں کافی تعداد ہماری قوم یعنی ملک کے باشندوں ہندو اور مسلمانوں دونوں کی گنجائش ہو اور دونوں گروہ عمدہ طور سے وہاں تعلیم و تربیت پاویں۔ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو میں لندن گیا۔۔۔۔ مسلمان اور ہندو دونوں بورڈنگ ہاؤسوں میں رہتے ہیں۔ ایک جگہ رہنے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے ایک دوسرے کا ہمدرد ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کالج میں سب باتوں کا برتاؤ ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں باہم اتفاق قائم ہونے کی ہیں جس کی ہندوستان میں اشد ضرورت ہے۔۔۔۔۔ انھوں نے (منتظمین کالج نے) ایک جگہ پر رہنا، ایک بنچ پر بیٹھ کر تعلیم پانا، ایک احاطہ میں رہنا، پھرنا، کھیلنا دونوں کے لئے ایک طرح پر قرار دیا ہے۔ جس سے باہمی دوستی کو ترقی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس سے عمدہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مگر میری یہ غرض نہیں کہ ہمارے ملک کے لوگ قوم کی بھلائی کی اور بات نہ سوچیں۔ ان کو چاہئے کہ اس پر غور کریں اور جو کچھ میں کہتا ہوں اس کے سوا کوئی اور چیز ان کو نظر آوے تو اس کو کریں"۔ ۲ ایس۔ کے بھٹناگر لکھتے ہیں: "یہ صرف الفاظ ہی

۱۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز مرتبہ محمد امام الدین گجراتی۔ ص ۲۲۵، مصطفائی پریس لاہور۔
لکچر مدرسہ گورداس پور۔ ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء

۲۔ بحوالہ "سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڈھ میں" از پروفیسر رشید احمد صدیقی
در نکرو نظر، اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۵۰ - ۴۹۔

الفاظ نہ تھے جو صرف لوگوں کو خوش کرنے کے لئے بول دئے گئے ہوں بلکہ کالج کے پورے ڈھانچہ نے ان الفاظ کی سچائی کو ثابت کر دیا۔ (فٹ نوٹ نمبر۱)

ولیم ہنٹر William Hunter نے ایجوکیشن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے کالج کے متعلق اسی قسم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ "اس مسلم ادارے کے مسلمان بانی نے اپنی تعلیم گاہ کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے نوجوانوں کے لئے کھول رکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ دوسو انسٹھ طلبائے کالج میں سے ستاون یا تقریباً چوتھائی ہندو ہیں۔ عیسائی اور پارسی لڑکے بھی اس کے احاطہ میں آزادانہ تعلیم پاتے ہیں۔ یہ آزاد خیالی صرف کالج کے قواعد اور اس کی تعلیم میں ہی نہیں بلکہ ساری کالج لائف میں پھیلی نظر آتی ہے۔" ۳ سرسید نے رہن سہن طور طریقوں اور پوشاک کی یکسانیت پر زور دیا۔ کھیل کود اور مختلف علمی مجالس میں مشترک دلچسپیوں کا سامان بہم پہونچایا۔ اس طرح ایک بھائی چارہ اور محبت واخوت کا رشتہ تہذیب و معاشرت کے ذریعہ مضبوط کرنے کی کوشش کی جو ان کا منتہائے نظر تھا۔ چنانچہ اپنے کالج کے طلباء سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ "تمہارا کھانا پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت ملنا، سوسائٹی میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا، لٹریری جلسوں میں شریک ہونا یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی، ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا ہو۔" ۴ اس طرح سرسید نے متحدہ قومیت کا تہذیبی خاکہ بنا کر انگریزی درس مدرستہ العلوم کے ذریعہ وہ نمونہ پیش کیا جو ان کے خوابوں کا ایک جز تھا۔

مشترک تہذیب کا یہ خیال ہی تھا جس نے انھیں اردو زبان کی محبت پر مائل کیا اور اردو ادب کی ترقی علی گڈھ تحریک کا ایک اہم حصہ بن گئی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علی گڈھ تحریک اور مشترکہ تہذیب سے یہی اہم رشتہ ہے جو اردو زبان سے اس کا تعلق

۱۔ ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج ص ۹

۲۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر۱ باب پنجم) ص ۳۲۹۔

۳۔ بحوالہ ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج ایس کے بھٹناگر در دیباچہ ص ۹

۴۔ لکچر ۷ ردسمبر ۱۸۹۴ء از مجموعہ لکچرز مرتبہ امام الدین گجراتی۔ ص ۵۲۶ (مصطفائی پریس لاہور)

خصوصی قائم کرنا ہے۔ اردو زبان کی تعمیر و تشکیل میں تمام ہندوستانی شریک رہے ہیں جس کے رنگا رنگ نگینے اس کی صورت تعمیر میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہی اس کی ہر دل عزیزی کا سبب تھا، جس کے باعث وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں صورت آشنا ہو چکی تھی۔ اسی خیال اور اسی حقیقت نے سر سید پر اردو کی اہمیت واضح کر دی تھی جس کے بارے میں سر تیج بہادر سپرو کہتے ہیں۔" اگر کوئی زبان ایسی ہے جو پشاور سے لیکر سی۔ پی اور بمبئی اور مدراس کے بعض علاقوں میں سمجھی جا سکتی ہے اور جس کی بدولت ہم سارے ملک میں سفر کی آسانیاں حاصل کر سکتے ہیں تو وہ اردو ہی ہے اگر مسلمان یہ دعوی کریں کہ اردو ان کی ایجاد اور ان کی ساختہ پرداختہ ہے تو مجھے اس سے قطعی انکار ہے اور اگر ہندو ایسا دعوی کریں تو وہ بھی غلط ہے۔ اس کے بنانے اور ترقی دینے میں دونوں کا حصہ ہے۔ . . . . اردو ہم ہندو اور مسلمانوں کی وراثت مشترکہ ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ہمارے اتحاد کی سب سے بڑی یادگار رہے۔" ۱

علی گڈھ کے تعلیمی نصاب میں گو اردو کو وہ اولیت اور اہمیت نہیں تھی جو اعلی انگریزی تعلیم کی اشد ضرورت اور تیز اشاعت کے باعث انگریزی کو حاصل تھی مگر نئے اردو ادب کی تعمیر و ترقی میں سر سید کے معاونین اور علی گڈھ کی تعلیم یافتہ نسل کا پورا پورا حصہ رہا۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ بانئ تحریک (سر سید) اردو کو اس وقت کی ملکی زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا قومی تحفہ اور اتحاد و اشتراک کی مکمل تاریخی نشانی تصور کرتے تھے اردو کی اس خصوصیت کا چرچا سیکڑوں سال پہلے سے چلا آرہا تھا۔ غیر ملکیوں کو بھی اس کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ سر سید سے بہت پہلے مسٹر مٹکاف، گارسان دی تاسی کے نام ۲۹ راگست ۱۸۰۶ء کے خط میں لکھتے ہیں "ہندوستان کے ہر حصہ میں جہاں جہاں ملازمت کے سلسلے میں رہا۔ یعنی کلکتہ سے لاہور کے قرب و جوار تک اور کوہستان کمایوں سے نربدا تک افغانوں، راجپوتوں، جاٹوں، سکھوں اور مختلف اقوام میں جو ان ممالک میں آباد ہیں جب میں نے سفر کیا ہے میں نے اس زبان کا عام رواج دیکھا ہے جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی۔ میں ذاتی تجربہ اور ان اطلاعات کی بناء پر جو مجھے دوسروں سے

۱۔ بحوالہ ہندوؤں میں اردو از رفیق مارہروی ص ۴۷۴

حاصل ہوئی ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں راس کماری سے کشمیر تک اور آداسے دریائے سندھ کے دہانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو ہندوستانی بول سکتے ہیں اور میری رائے میں اسے وہ وسعت حاصل ہے جو دنیا کی کسی اور زبان کو نہیں ہے۔"۱

موسیو دی موپان M. DIEUPAUNT نے اپنی کتاب "اقوام کی پیدائش" میں لکھا ہے برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت اٹھائیس کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان میں تقریباً بیس کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترکہ رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے۔ یہ زبان یورپ کے برابر کے رقبہ میں بولی جاتی ہے۔"۲

سرسید کی تحریک کا اردو زبان وادب سے یہ تعلق تحریک کے تہذیبی پہلو، قومی نظریہ اجتماعی تصورات اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے۔ سرسید کی قابل فخر ادبی خدمات اور اردو ادب پر ان کے وسیع وعظیم اثرات ایک اہم اور مکمل ادبی تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں مگر نشاۃ ثانیہ کے تاریخی پس منظر میں ان ادبی کاوشوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ سب سے اول ایک مصلح تھے اور ایک مصلح کو زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح طلب گوشے مل جاتے ہیں۔ سرسید کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سوشل تحریک کے دوران صرف ادبی اصلاح پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے متوازی ایک مکمل ادبی تحریک جاری کردی جس کے ذریعہ ایک ادبی انقلاب جاگ اٹھا۔ اردو ادب کے نئے سوتے جاری ہو گئے اور اس کے ذریعے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرسید کی ادبی خدمات ان کی ان گنت تحقیقی، تنقیدی، مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور علمی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔

۱۔ بحوالہ زبان کا مسئلہ مرتبہ محمد مظہر الحق ص ۷۴ و ۷۵

۲۔ " " " " " " ص ۷۵

اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں اشتراک عمل کے لئے ایک نئے زاویۂ نظر سے دعوت فکر و عمل دی۔" سرسید کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا۔ یہ خود ان کا بیان تھا کہ جیسا کہ تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا کسی کام میں نہیں لگتا۔ یہ شوق انھیں ابتدا سے تھا۔"[۱] لہٰذا ہم سرسید کی ادبی خدمات کے دو حصے پاتے ہیں۔ ایک تو خود ان کی علمی و ادبی کاوشیں جو ان کی تصانیف اور تحریروں میں ملتی ہیں ان کا شمار کیا جائے تو بلحاظ تعداد کثیر ہیں۔ یکجا کی جائیں تو ضخامت بہت ہوگی اور موضوعات کے اعتبار سے متنوع الاقسام ہیں۔ ان سب کو اعلیٰ ادبی درجہ نہ سہی مگر اولیت اور جدیدیت کا مقام حاصل ہے۔ دوسرے ان کے علمی و ادبی رجحانات کا وہ زبردست اثر جو اتفاقیہ نہیں سرسید کی دانستہ کوششوں کا ثمرہ تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اردو ادب میں محققوں، مورخوں، شاعروں اور نقادوں کی ایک نئی دنیا آباد ہوگئی۔

ایک معمار ادب کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لینے میں جو دشواریاں ہوتی ہیں وہ یہاں بھی موجود ہیں۔ سرسید کی ادبی کاوشوں کو واضح طریقہ پر سمجھنے کے لئے ہمیں اس کو مختلف صورتوں میں دیکھنا جانچنا اور پرکھنا ہوگا۔ ان کی ادبی خدمات کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۷ء تک۔ دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۰ء تک اور تیسرا دور ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۷ء تک کا ہے۔ یہاں ہمیں انھیں تین ادوار کی تفصیلات بہ ترتیب بیان کرنی ہیں ساتھ ہی ہر دور کی تصنیفات کی خصوصیات و اہمیت ادبی رجحانات کی نشان دہی اور طرز تحریر کے حسن کی وضاحت کرنا ہے۔

پہلا دور:

انتخاب الاخوین (قانونی تالیف) ۱۸۳۹ء میں مرتب کی جو منصفی سے متعلق قانون

۱۔ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق ص ۲۳۵

دیوانی کا خلاصہ تھی۔ یہ عرصہ دراز تک منصفی کے امیدواروں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔

۲۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ (مذہبی) ۱۸۳۹ء میں لکھی جو محفل میلاد کے لئے ہے گو کہ یہ بالکل ابتدائی تحریروں میں سے ہے۔ مگر ان کے جدید رجحانات کی نشان دہی کرتی ہے۔ سرسید نے اس کتاب کی روایتوں کی نقل میں صحت کا خیال رکھا ہے۔ رائج الوقت غیر مستند اور روایتی چیزوں سے گریز کیا ہے۔ جو ان کے اجتہادی رجحانات کی نشان دہی کرتی ہے۔"۱

۳۔ جام جم (تاریخی بزبان فارسی) ۱۸۴۰ء میں شایع ہوئی جس میں خاندان تیمور کے تینتالیس (۴۳) بادشاہوں کا ذکر سترہ سترہ خانوں میں جدولوں کی شکل میں لکھا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی ظاہر کرتی ہے۔

۴۔ تحفۂ حسن (مذہبی) ۱۸۴۴ء میں شاہ عبدالعزیز کی فارسی کتاب کے دسویں اور بارہویں باب کا ترجمہ ہے"۲

۵۔ تسہیل فی جرثقیل (علمی) ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی جو فارسی کی معیار العقول کا ترجمہ ہے۔ اس میں جرثقیل کے پانچ اصول و قواعد درج ہیں۔ یہ کوئی ادبی کارنامہ نہیں مگر یقیناً سرسید کے علمی و ادبی ذوق کی ایک کڑی ہے۔۳

۱۔ یہ رسالہ (تصانیف احمدیہ جلد اول حصہ اول مطبوعہ ۱۸۸۳ء) میں شامل ہے جو سرسید Collection آزاد لائبریری علی گڈھ میں موجود ہے۔

۲۔ مطبوعہ در چھاپہ خانہ مستقر الخلافہ اکبرآباد مئی ۱۸۴۴ء، از سرسید مولانا آزاد لائبریری علیگڈھ میں موجود ہے۔

۳۔ یہ رسالہ (مطبوعہ آگرہ کے تیموں کا چھاپہ خانہ ۱۸۴۶ء) سرسید Collection آزاد لائبریری میں موجود ہے۔

۶- فوائدالافکار فی اعمال الفرجار (علمی مضمون جیومیٹری کے پرکار اور اس کے اعمال و اشکال پر) یہ ۱۸۴۶ء میں شایع ہوئی جو دراصل ان کے نانا (فریدالدین) کے فارسی مسودوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اس سے ایک طرف خود سرسید کا اس مضمون سے شوق و دلچسپی اور علم دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری طرف علم کو مفید عام کرنے کی خواہش۔ ا

۷- آثارالصنادید (تحقیقی و تاریخی تصنیف) ۱۸۴۷ء میں پہلا ایڈیشن شایع ہوا۔ دوسرا ۱۸۵۴ء میں۔ یہ سرسید کی وہ پہلی تصنیف ہے جس کا شہرہ یورپ تک ہوا۔ انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اسی کتاب کی تصنیف پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے انھیں سوسائٹی کی آنریری فیلوشپ ملی تھی۔ اس کتاب میں قدیم دہلی کی تمام ہندو مسلم تاریخی عمارتوں، باغوں، قلعوں اور باولیوں وغیرہ کا تفصیلی ذکر، وجہ تعمیر و تاریخ مع کتبوں و نقشوں کے ہے۔ نیز دہلی کے قدیم مشاہیر، علماء، صلحاء، مشائخ، حکماء، شعراء خوش نویسوں اور دیگر ماہرین فنون کا تذکرہ ہے۔ یہ اولین دور کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ سرسید نے اس کے لئے بہت محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ خود ان کے بیان کے مطابق انھیں کتبوں کے پڑھنے کے لئے گھنٹوں چھینکے پر بیٹھے رہنا ہوتا تھا۔ جو بہت خطرناک اور دردسری کا کام تھا۔ ۲

۸- قول متین در ابطال حرکت زمین (علمی و سائنسی) ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ رسالہ اس وقت لکھا تھا جب حرکت زمین کے قائل نہ تھے۔ اس میں زمین کے ساکت

ا- یہ رسالے (مطبوعہ چھاپہ خانہ سیدالاخبار ۱۸۴۶ء) بھی آزاد لائبریری سرسید Collection میں موجود ہے۔

۲- آثارالصنادید کے دونوں قدیم ایڈیشن ۱۸۴۶ء نیز نیا ایڈیشن ترتیب و تدوین از خالد نصیر ہاشمی ۱۹۶۵ء۔ سرسید Collection آزاد لائبریری میں موجود ہے۔

دہنے کو بہ دلائل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خود اعتمادی ان میں شروع سے تھی وہ ہر چیز پر خود غور و خوض کرنے کے عادی تھے بعد میں وہ حرکت زمین کے قائل ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ہٹ دھرمی سے یا صرف اس لئے کہ کوئی بات پرانے وقت سے یونہی مانی جاتی رہی ہے، اڑے نہ رہتے تھے۔ بلکہ جس چیز کو سچ مانتے اس پر غور و خوض کرتے اور دلالت کے ساتھ یقین رکھتے تھے۔ ۱

۹۔ ترجمہ فیصلہ جات صدر شرقی و صدر غربی (قانونی) مرتبہ ۱۸۴۹ء، یہ مقدمات کے متعلق اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کا ترجمہ ہے گو یہ کوئی ادبی چیز نہیں مگر سرسید کی قانون سے دلچسپی نیز ان کی نظر میں اس کی ضرورت و اہمیت کو ظاہر کرتا ہے نیز قانون دانوں اور قانونی طلبہ کے لئے مفید تھا۔

۱۰۔ کلمۃ الحق (مذہبی) ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔ اس رسالہ میں پیری و مریدی کے مروجہ طریقہ کی مخالفت کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید چشم بند تقلید سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اور اجتہادی رجحان نمایاں تر تھا۔ حتیٰ کہ مذہبی مسائل میں بھی رواجی اصولوں کے خلاف کہنے کی ہمت و جرأت رکھتے تھے۔ (تصانیف احمدیہ میں موجود ہے)

۱۱۔ راہ سنت در بدعت (مذہبی) مولفہ ۱۸۵۰ء۔ اس رسالہ سے بھی اجتہادی رجحانات اور مذہبی آزاد خیالی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی کہ سرسید حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک اور مذہبی خیالات سے متاثر تھے۔ (تصانیف احمدیہ حصہ اول جلد دوم میں موجود ہے)

۱۲۔ سلسلۃ الملوک (تاریخی) ۱۸۵۲ء۔ یہ دہلی کے راجاؤں اور بادشاہوں کی پانچ

۱۔ اس کا نسخہ مطبوعہ مطبع سید الاخبار ۱۲۶۵ ہجری مطابق ۱۸۴۹ء سرسید Collection آزاد لائبریری میں موجود ہے اور مقالات سرسید مولفہ محمد اسمٰعیل پانی پتی حصہ شانزدھم میں بھی شامل ہے۔

ہزار سالہ مختصر تاریخ ہے۔ جس میں ان سب کے نام سنہ جلوس سنہ انتقال اور دیگر ضروری کوائف جمع کر دئے ہیں (دراصل یہ آثار الصنادید کے پہلے باب کا حصہ ہے۔ جسے بعد میں الگ رسالہ کی صورت میں شائع کیا۔"۱

۱۳۔ نمیقہ در بیان تصور شیخ (مذہبی) مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ مختصر تحریر فارسی زبان میں ایک مکتوب کی شکل میں ہے۔

۱۴۔ ترجمہ کیمیائے سعادت (مذہبی) ۱۸۵۳ء۔ یہ حضرت امام غزالی کی کیمیائے سعادت کی ابتدائی تین فصلوں کا اردو ترجمہ ہے۔ جو تصانیف احمدیہ میں شامل ہے۔

۱۵۔ تاریخ ضلع بجنور۔ ۱۸۵۵ء میں بمقام بجنور کلکٹر کی ایما سے مرتب کی۔ یہ تاریخ سرسید نے بڑی محنت سے لکھی تھی۔ ان کا بیان ہے۔" گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانے کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔"۲ یہ سرکاری دفتر میں ہی غدر میں تلف ہو گئی اور شائع نہ ہو پائی۔

۱۶۔ تصحیح آئین اکبری (تاریخ) ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ شائع ہوئی۔ سرسید نے اس کتاب کے جتنے نسخے دستیاب ہو سکتے تھے حاصل کئے اور سب کو ملا کر بڑی محنت سے تصحیح کی۔ جو غلطیاں اور تاریخی فرق مختلف نسخوں میں مختلف طور سے تھے ان سب کی تصحیح کر دی۔ اس طرح ایک صحیح نسخہ تیار کیا۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں مروج تھیں

۱۔ اس کا نسخہ مطبوعہ مطبع شرف المطابع دہلی ۱۸۵۲ء کا سرسید Collection آزاد لائبریری میں موجود ہے جو مقالات سرسید مولفہ محمد اسمٰعیل پانی پتی (حصہ ششم ص ۱۶۶ تا ۲۲۳ درج ہے)

۲۔ بحوالہ سرسید کا علمی کارنامہ از قاضی احمد میاں جوناگڈھی مرحوم ص ۴۰۔

یا ابوالفضل نے اختراع کی تھیں ان کی تشریح کی۔ قدیم اوزان و نقود کی نئے اوزان و نقود سے مطابقت کی۔ فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ بڑے اہتمام سے سیکڑوں تصویریں ماہر مصورین سے کھنچوا کر کتاب میں شامل کیں۔ یہ تصویریں اکبر کے زمانے کے لباس، ہتھیاروں، شاہی فیل خانوں، خیموں، شکارگاہوں اور محلات کی اکثر تفصیلات اور ظروف، آلات، پھولوں، پھلوں اور دیگر اشیأ کی تھیں۔

۱۷۔ سرکشی ضلع بجنور ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی جس میں ضلع بجنور کے صحیح حالات اور اس کی پوری تفصیل لکھی تھی اور جس کا مسودہ دوران غدر تلف ہوگیا

۱۸-۱۷۔ سید الاخبار میں سب سے پہلے مضامین لکھا کرتے تھے جسے بھائی کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک نکالتے رہے۔ صحافت کا یہ اولین اور ابتدائی تجربہ تھا۔ سرسید کا رجحان کسی ایک صنف ادب کی طرف نہ تھا بلکہ اس اولین دور میں بھی ان کے موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ جو آئندہ اور بھی وسیع ہوا۔ ان ابتدائی تحریروں میں مختصر مذہبی تاریخی و قانونی اور علمی رسائل شامل ہیں۔ جن میں زیادہ ترجمہ و تالیف اور چند سرسید کی اپنی تصنیفیں ہیں۔ یہ قانونی رسائل طلبائے قانون اور ملازمین عدالت کے لئے مفید جان کر شائع کر دئے تھے۔ علمی رسائل جیومیٹری اور جغرافیہ وغیرہ سے سرسید کی دلچسپی اور علم سے قدرتی لگاؤ کو ظاہر کرتے ہیں نیز یہ کہ سرسید علم کی وسعتوں میں کھو جانے والے طالب علم نہ تھے بلکہ ان میں سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کا مادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آخر کار علم سے روشنی حاصل کر کے اس کے فوائد دوسروں تک پہنچانے والے متعلم بنے۔ اس دور کے تاریخی رسائل سے ابتداء ہی میں سرسید کے تاریخی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ آثار الصنادید ان کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو ان کے قابل فخر ادبی کارناموں میں شامل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شروع ہی سے اعلیٰ اور معیاری ادبی تحریروں

کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ ان اولین تحریروں سے سرسید کے ادبی رجحانات اور دیگر خصوصیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

اول یہ کہ تاریخ سے ان کو خاص شغف تھا اسی تاریخی شغف نے ان سے آثار الصنادید لکھوائی اور اس سلسلے میں ہر طرح کی جسمانی مشقت اور دشواریاں اٹھانے پر مائل کیا۔ سرسید تاریخی علم کو عام لوگوں کے لئے ضروری اور مفید جانتے تھے چنانچہ آئین اکبری کی تصیح بھی ان کی ایک اہم خدمت ہے۔ دوسرے یہ کہ ابتدا ہی سے ان کا رجحان تحقیق کی طرف تھا۔ چنانچہ آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں چالیس قدیم وجدید کتابوں کے نام درج ہیں جن سے اس کتاب کے مرتب کرنے میں انہوں نے مدد لی تھی۔ (فٹ نوٹ نمبر ۲) ۱ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وافر مطالعہ کے باعث ان کی معلومات وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس طرح جدید علمی سرگرمیوں سے بھی روشناس ہونے لگے، جس کے سبب تحقیق سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔

تیسرے یہ کہ سرسید ابتدا ہی سے دلائل اور براہین کو تحریر میں وزن و وقار لانے نیز خیالات کے سچ ثابت کرنے کے لئے ضروری جانتے تھے۔ چنانچہ اپنے خیالات کے اظہار میں ہمیشہ دلائل سے کام لیتے تھے۔ کلمۃ الحق میں ایک آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "واتممت علیکم نعمتی" یعنی پوری کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی جو نعمت ہے وہ شریعت محمدیہ ہی میں پوری ہوئی ہے۔ پھر جو کوئی اس پر چلے گا اسی کو یہ نعمت ملے گی اور جو نہ چلے گا اس کو نہ ملے گی اور جو تھوڑا چلے گا اس کو تھوڑی ملے گی اور جو بہت

۱۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۲ باب پنجم) ص ۳۳۰

چلے گا اس کو بہت ملے گی۔ اب یہ خیال کرنا کہ جب تک مرید نہ ہو اور مشائخ کی طرح ذکر و شغل نہ کرے اس کو اللہ کی نعمت اور اس کے دربار میں مرتبہ نہیں ملتا بالکل غلط ہے۔ اور یہ بھی مان لو کہ اللہ کی نعمت سے دین کا پورا ہونا اور اللہ کی راہ کی ہدایت ہونی مراد ہے "۱ چوتھے یہ کہ مذہبی تحریروں میں اجتہادی رنگ نمایاں ہے چنانچہ اولین مذہبی تصنیف "جلاء القلوب بہ ذکر محبوب" تھی۔ اس میں بھی روایتوں کی صحت کا خاص خیال رکھا ہے اور صرف صحیح روایتیں درج کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلمۃ الحق میں لکھتے ہیں۔

"یہ کلمۃ الحق بے اختیار پیری و مریدی کے بیان میں ہماری زبان سے نکلا ہے۔ کیونکہ ہمارے زمانے میں پیری و مریدی کا ایسا جھگڑا لگا ہے جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکہ میں پڑے ہیں جہاں ایک نئی صورت کا آدمی دیکھا کوئی تو اس کو قطب کہتا ہے اور کوئی ابدال کوئی ولی اور کوئی غوث اور پھر وہ کیسی ہی باتیں کرتا ہو اس پر کچھ خیال نہیں کرتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "۲ مذہبی نظریات میں صاف طور پر امام غزالی سے متاثر اور حضرت شاہ ولی اللہ کے مسلک سے متفق نظر آتے ہیں۔ (جن کے مذہبی نظریات کی تشریح پہلے باب میں آچکی ہے) سرسید کی تمام تحریروں میں جا بجا شاہ ولی اللہ کے نظریات کی تائید اور اِن کے حوالے ملتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ سرسید نے ادب کو قدیم رجحان کے مطابق صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ ابتدا ہی سے اسے علمی وقار سے آراستہ کرنے کی کوشش کی اور مفید و معلوماتی تحریروں سے ادب میں اضافے کئے۔ مندرجہ بالا تمام چیزیں سرسید کے یہاں ابتدائی اور مبہم صورت میں سہی مگر ہمارے ادب کے نئے خد و خال یہیں

۱۔ کلمۃ الحق در تصانیف احمدیہ۔ از سرسید احمد خاں ص ۸۲

۲۔ " " " " " " ص ۱

سے شروع ہوتے ہیں۔ مادی تصورات اور ان کی اہمیت اس وقت تک سرسید کے یہاں واضح نہیں تھے۔ مسائل حاضرہ اور ادب و زندگی سے اس کے تعلق کا تصور ان کے یہاں دوسرے دور تصنیف میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ابتدائی دور صرف علمی شغف، ذوق مطالعہ، تاریخی حقائق سے دلچسپی اور سنجیدہ علمی موضوعات پر تعمیر نظر آتا ہے۔ نیز یہ کہ صحافت کا تجربہ بھی سرسید کو کچھ نہ کچھ سید الاخبار کے ذریعہ اسی دور میں ہو گیا تھا۔

ذاتی صلاحیت و شوق کے علاوہ یہ علمی ذوق سرسید کو ان علمی مجلسوں اور ادبی صحبتوں سے بھی حاصل ہوا جن میں قیام دہلی کے دوران وہ ہمیشہ شریک ہوتے تھے، جس کے بارے میں لکھتے ہیں "وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی و باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالبؔ کی دلکش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دل چسپ و دل ربا فصاحت سے، شیفتہؔ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے اور صہبائی جان نواز کے مہمانۂ محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا۔"۱ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں کجا وہ مجلسیں، کہاں آزردہ کہاں وہ شیفتہ، اور غالبؔ و مومنؔ، کہاں وہ صہبائی کہاں وہ علما و صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے۔"۲

اس دور میں طرز تحریر ناہموار سا ہے۔ کہیں مغلق و پیچیدہ کہیں عام فہم اور سپاٹ۔ مگر ان سب کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگیں اور پیچیدہ عبارتیں اور مغلق تحریریں صرف آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں زیادہ ملتی ہیں۔ اسی کے دوسرے ایڈیشن نیز دیگر تمام تحریروں میں عام انداز ہے جس میں وہ کہنہ مشقی دل نشینی اور زور بیان نہیں جو سرسید کی بعد کی تحریروں کا جزو خاص تھیں۔ آثار الصنادید کے متعلق حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ صہبائی سے ان کو اس سلسلے میں کافی مدد ملی حتیٰ کہ بعض مقامات پر پوری پوری عبارت ان کی تحریر کردہ ہے۔ یہاں اس بات کے صحیح و غلط ہونے سے بحث نہیں۔ دراصل جو بات

۱۔ تہذیب الاخلاق جلد دوم در مضمون سراب حیات، از سید احمد خاں۔ ص ۵۲۸

۲۔ حیات جاوید جلد دوم ص ۵۴۵۔ (طبع سوم ۱۹۳۳ء)

کہنا ہے وہ یہ ہے کہ سرسید کی ابتدائی تحریروں میں جو قدیم پیچیدہ انداز تحریر کا جو نمونہ ملتا ہے تعجب نہیں کہ انھیں سرسید کتبوں اور ان کی عربی و فارسی عبارتوں کے سمجھنے کے سلسلے میں صہبائیؔ سے مدد لیتے رہے ہوں اور ان کے اثر سے اکثر ٹھیٹ اور قدیم انداز تحریر آگیا ہو مثلاً۔۔۔۔

"اس نسخۂ دل کشا کو زیور اتمام سے آراستہ کر کر اس مناسبت سے کہ صنادید روزگار کے آثار اور اعیان مملکت ہند کے احوال و اطوار پر مشتمل ہے آثار الصنادید نام رکھا۔" ۱

لیکن یہ انداز ہر جگہ نہیں، چنانچہ ہمایوں کے مقبرہ کے بیان میں لکھتے ہیں۔ "نہریں ٹوٹ گئیں، حوض بند ہو گئے آبشاروں کا نام نہ رہا مگر اب بھی کچھ کچھ نشان باقی ہے اور شمال کی طرف چادر گرنے کا مکان اور حوض اور نہروں کے فواروں کا خزانہ بنا ہوا ہے اگر اب بھی اس مقبرہ کی مرمت کی جائے اور باغ لگایا جائے تو عجب سیرگاہ اور نہایت فرحت بخش مکان ہے۔" ۲ اسی طرح صہبائیؔ کے ذکر میں لکھتے ہیں "رنگ زدائے آئینۂ سخنوری، مصتقل مرآت معنی پروری، نخل بند حدیقۂ کمالات صوری، پردہ کشائے حسن جلال معنوی، معجزہ طراز طرز تازہ، بزم افروز حمائد بے اندازہ، ساقی خم کدہ سخن سرائی مولوی امام بخش متخلص بہ صہبائی۔۔۔۔" ۳ ظاہر ہے یہ عبارت صہبائیؔ نے خود اپنے لئے تو لکھی نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ ناہمواری کچھ تو سرسید کی ابتدائی نومشقی کی وجہ سے تھی اور کچھ تحریروں میں علمی وقار پیدا کرنے کی کوشش اور صہبائیؔ کے اثر سے۔ مگر ابتدا ہی سے یہ سرسید کا اپنا رنگ نہ تھا۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ سرسید کی تمام اولین دور کی تحریروں میں بھی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کی ان مغلق اور پیچیدہ عبارتوں کا رنگ نہیں ملتا۔

سرسید کی ابتدائی تحریروں میں معیاری سادگی اور دل نشینی نہ سہی مگر عام فہم انداز ہے۔ آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن (۱۸۵۴ء) میں بھی انھوں نے خاص طور سے

۱۔ از دیباچہ آثار الصنادید مصنفہ سید احمد خاں، طبع اول ص ۲ ب۔

۲۔ آثار الصنادید مصنفہ سید احمد خاں باب اول ص ۶۷ (طبع اول)

۳۔ " " " " " چہارم ص ۱۸۱ (طبع اول)

۴۔ تسہیل فی جر ثقیل مصنفہ سید احمد خاں۔ ص ۱

عبارتیں سیدھی اور آسان کر دیں۔ اس سے قبل کی تحریریں بھی ملاحظہ ہوں۔ تسہیل فی جر ثقیل میں لکھتے ہیں "جر ثقیل کا علم بہت عجیب و غریب ہے۔ ساری دنیا کے کارخانے اس پر موقوف ہیں۔ حق یہ ہے کہ اگر یہ علم نہ ہوتا تو دنیا کا کارخانہ نہ چلتا۔"۱ جلاء القلوب میں لکھتے ہیں۔ "آپ اپنے یاروں کو بہت دوست اور معزز رکھتے تھے ان کے سامنے کبھی پاؤں تک نہ پھیلاتے تھے۔ اگر آدمیوں کی کثرت سے جگہ تنگ ہو جاتی تھی تو آپ ان کے لئے جگہ کشادہ کر دیتے تھے۔"۲ مختصر یہ کہ تمام ابتدائی تحریروں کا عام رنگ اسی طرح کا ہے۔ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کے باب چہارم میں اردو زبان کے آغاز اور مروج ہونے کا حال لکھا ہے "اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر و تبدل کر لی ہے لیکن اس زمانے میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا فارسی کے لغت بہت ملا دیتے ہیں اور فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اچھی نہیں۔ ان سے اردو پن نہیں رہتا۔ اور ظاہر ہے کہ اس بات کے لئے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جاوے اور کون کون سے لغت اور زبانوں کے نہ بولے جاویں کوئی قاعدہ نہیں مقرر ہو سکتا۔ یہ بات صرف اہل زبانوں کی صحبت پر منحصر ہے۔"۳ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ضرورت اور اہمیت کو وہ اولین دور میں ہی محسوس کرنے لگے تھے اور اس کی درستی کا خیال ان کے دل میں آنے لگا تھا جس کی پہلی عملی صورت آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن میں ملتی ہے۔ کیونکہ یہ دانستہ طور پر آسان عبارت میں تبدیل کی تھی۔

دوسرا دور:۔

یہ دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۰ء تک کا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل تصانیف شامل ہیں۔

۱۔ تاریخ سرکشی بجنور (سیاسی و تاریخی) ۱۸۵۸ء میں شایع ہوئی جس میں مئی ۱۸۵۷ء

۱۔ تسہیل فی جر ثقیل مصنفہ سید احمد خاں۔ ص ۱

۲۔ جلاء القلوب بہ ذکر المحبوب (یہ رسالہ تصانیف احمدیہ مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس) میں شامل ہے اور مقالات سر سید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، حصہ ہفتم ص ۱۵) میں بھی موجود ہے۔

۳۔ آثار الصنادید مصنفہ سید احمد خاں باب چہارم ص ۱۳ (پہلا ایڈیشن)

تا اپریل ۱۸۵۸ء کے حالات غدر جو اس ضلع میں پیش آئے تفصیل سے درج ہیں۔ یہ اس زمانے کا آنکھوں دیکھا حال اور صحیح واقعات ضلع فراہم کرتی ہے۔

۲- اسباب سرکشی ہندوستان (سیاسی) ۱۸۵۸ء میں لکھی جو عام طور پر اسباب بغاوت ہند کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں غدر کے اسباب سلجھے طور پر نہایت نرم مگر مدلل انداز میں بیان کئے ہیں۔ انگریزوں کے غرور اور ہندوستانیوں سے حقارت پر نکتہ چینی کی ہے۔ یہ واضح کیا ہے کہ انگریز ہندوستانیوں سے الگ اور ناواقف رہتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستانی انگریزی طور طریقوں اور مغربی اصولوں سے ناواقف ہیں دونوں کا رویہ غلط ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شمولیت کو غدر کا سبب قرار دیا ہے یہ ان کی معرکتہ الارا سیاسی تصنیف ہے جو ہندوستان میں سیاست کی اولین کڑی کہی جا سکتی ہے۔ اور جو مصنف کی جرأت و ہمت اور سیاسی دوربینی کا ثبوت ہے۔

۳- لائل محمڈنز آف انڈیا یا وفادار مسلمانان ہند (سیاسی رسالہ) ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں جاری کیا جس میں ان مسلمانوں کے حالات درج کئے جاتے تھے جو وفادار گورنمنٹ رہے یا دوران غدر انگریزوں کی مدد کی اور ان کی جانیں بچائیں۔ اس کے صرف تین شمارے نکل سکے دراصل یہ سلسلہ مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے خصوصی غصہ و نفرت کو کم کرنے کے لئے تھا تاکہ وہ ہر موقع پر بے خطا مغضوب ہوتے رہنے سے بچیں۔

۴- تصحیح تاریخ فیروز شاہی (تاریخی) جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شایع کی۔ یہ مشہور قدیم مصنف ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے۔ سر سید نے اس کتاب میں جو دیباچہ لکھا تھا وہ سائنٹیفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں شائع ہوا تھا۔

۵- تبیین الکلام (مذہبی) بائبل کی تفسیر، ۱۸۶۲ء میں غازی پور سے شایع کی۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عربی خط میں اور اس کا انگریزی و اردو ترجمہ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی آیت قرآنی یا حدیث یا اس کا ترجمہ اردو انگریزی لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تفسیر لکھتے ہیں اور دونوں کی تطبیق کرتے ہیں۔ جہاں اختلاف ہوتا قرآنی احکام بیان کر کے انکی فوقیت ثابت کرتے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوئی گو یہ مکمل نہ ہو سکی مگر جو حصہ مکمل ہوا وہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔

۶- توزک جہانگیری (تاریخی ترجمہ) اس کتاب کو سائنٹفک سوسائٹی نے ۱۸۶۴ء میں

شایع کیا۔ یہ کتاب شہنشاہ جہانگیر کی خود نوشت سوانح ہے جو ایک مشہور قدیم کتاب ہے۔ اس سے ایک طرف جہانگیر بادشاہ کے زمانے کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف یہ ایک مکمل سوانح بھی ہے۔ یوں تو اردو میں تذکرہ نویسی رواج پا چکی تھی لیکن یہ تذکرے زیادہ تر شعراء کے متعلق ہوتے تھے۔ ان تذکروں میں شخصی تعارف اور توصیف فن تو ہوتی تھی مگر مکمل طور پر سوانح حیات لکھنے کی روایت وجود میں نہ آئی تھی۔ گو یہ سر سید کا ترجمہ ہے پھر بھی سوانحی سلسلہ کی ایک اہم کڑی بھی ہے جو اردو ادب میں شامل ہوئی۔

۷۔ علاج ہومیوپیتھک پر ایک رسالہ ۱۸۶۷ء میں لکھا۔ وہ اس طریقۂ علاج کو سستا اور غریب ہندوستانیوں کے لئے مفید جانتے تھے۔ چونکہ اس وقت تک اس طریقۂ علاج سے عام طور پر ناواقفیت تھی اس لئے سر سید نے اس کی اشاعت میں کوشش کی۔ اس سلسلے میں بنارس میں ایک ہومیوپیتھک اسپتال بھی کھولا تھا اور یہ رسالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ طریقۂ علاج عام ہو جائے۔ اس سے ان کے جذبۂ اصلاح و خدمت کا پتہ چلتا ہے۔

۸۔ احکام طعام اہل کتاب (مذہبی ۱۸۶۸ء) جس میں قرآن پاک و حدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ ان کے برتنوں میں ان کے پکائے ہوئے کھانے جائز ہیں۔ یہ مسلمانوں میں عیسائیوں سے رابطہ بڑھانے اور مغربی تعلیم و معاشرت کی قبولیت پیدا کرنے کے واسطے لکھی تھی کیونکہ مسلمان مذہب کو اس میں مانع سمجھتے تھے۔

۹۔ مسافران لندن۔ کے نام سے ۱۸۶۹ء میں چھ ماہ کے سفر کا مختصر حال شایع کیا۔ اس میں سفر کے تجربات نئی نئی اور مفید چیزوں کی تفصیل درج ہے۔ جن چیزوں کو ہندوستان کے لئے مفید سمجھا ان کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔ عمارات، طرز معاشرت، نئی سائنسی ایجادات اور مغربی دنیا کے عجائبات کا تذکرہ مفصل اور دلچسپ ہے۔ اس میں بھی جوش قومی اور حب وطنی نمایاں ہے۔

۱۰۔ خطبات احمدیہ (مذہبی) ۱۸۷۰ء میں بمقام لندن لکھی یہ ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ کا جواب ہے۔ جس میں مصنف کے اعتراضوں کا مدلل جواب دیا ہے۔ یہ وہ مشہور تصنیف ہے جس کا عیسائی محققین نے بھی لوہا مانا ہے۔ یہی سر سید کی وہ تصنیف ہے جس کے لئے انھوں نے اپنا گھر، سامان اور کتب خانہ گروی رکھ کر لندن کے سفر کی تیاری کی۔

لندن میں رہ کر یورپ کی نایاب کتابیں مہیا کیں۔ انڈیا آفس کا کتب خانہ چھان ڈالا اور ان کتابوں کی مدد سے اپنی تصنیف مکمل کی۔ انگریزی، جرمنی، عبرانی اور لاطینی کتابوں سے نیز عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخی و مذہبی کتابوں سے مواد اور دلائل نکالے۔ اس طرح ایک مدلل جواب تیار کیا جس کے بارے میں خود میور کو کہنا پڑا کہ "میں نے سرسید کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں"۔ ۱

۱۱- اخبار سائنٹفک سوسائٹی ۱۸۶۶ء میں جاری کیا جو بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ اخبار بڑی پابندی کے ساتھ آخر دم تک جاری رکھا جو سرسید کی عمدہ صحافت کا بہترین نمونہ تھا۔ اس اخبار کا ایک کالم انگلش اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا۔ اخبار میں صرف مستند ذرائع یا مشہور انگریزی اخبارات سے لی ہوئی ملکی و بیرونی خبریں ہوتی تھیں۔ اس کے سرورق پر اس کا موٹو جلی حروف میں چھپا ہوتا تھا۔ "آزادی چھاپہ کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی جبلی حق رعیت کا"۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اخبار کے پہلے نمبر کا پہلا مضمون پارلیمنٹ پر ہے"۔ ۲ سرسید کا مقصد بنیادی طور پر ہر طرح کی اصلاح اور تعلیمی ترقی سے عام ذہنی بیداری اور وسیع النظری پیدا کرنا تھا جو ہر طرح کی ترقیوں کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ اس اخبار میں معلوماتی خبریں ہوا کرتی تھیں مثلاً "ایجاد عجیب (کیمرہ کے متعلق) سیپیوں کا تجربہ۔ پوسٹ آفس کے فائدے۔ روئی کی پیداوار نمائش گاہ لندن۔ بولنے والی کل وغیرہ"۔ ۳ سرکاری وغیر سرکاری اشتہارات اور روئدادیں ہوتی تھیں۔ سائنٹفک سوسائٹی اور دیگر موقعوں پر دیئے گئے مفید لکچر بھی ہوتے تھے۔ مثلاً۔ لارڈ نارتھ بروک Lord North Brooke کے خیالات بہ نسبت تعلیم (جس میں صحیح طور پر تعلیم نیز تعلیم نسواں پر زور دیا گیا ہے) اردو زبان، اصلاح

۱- حیات جاوید مصنفہ حالی، حصہ دوئم ص ۱۸۸ (پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

۲- سرسید کے تین غیر مطبوعہ خطوط در رسالہ فکر و نظر جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۰۳

۳- جولائی اگست ۱۸۶۶ء اور جنوری و جون جولائی ۱۸۷۱ء و ۱۸۷۰ء کے اخباروں میں بہ ترتیب شائع ہوئے۔

فضول خرچی در شادی، لکچر پیارے لال ورائے بلدیو بخش۔ لکچر اخلاقی تعلیم و تربیت پر الٰہ آباد کے دارا گنج کلب میں دیا گیا۔"۱ اس کے علاوہ عمدہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ہندوؤں کی کتابوں کا مختصر حال۔ اردو زبان۔ جزیرہ انڈمان۔ ہندوستان کا کپڑا۔"۲ معقول و مفید تجویزیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ مثلاً "ریل کی سڑک بنانے کا ٹھیکہ ہندوستانیوں کو کیوں نہیں ملتا۔ ہندوستانی رئیسوں کو اپنے ہم وطنوں کی تعلیم پر توجہ کرنی چاہئے۔"۳ غرضیکہ یہ اخبار نہایت صحیح خبریں، مفید معلوماتی لکچرز اور مضامین و مشوروں سے پر ہوتا تھا۔ غرض از اول تا آخر اس اخبار کی سنجیدگی اور میانہ روی قائم رہی۔ اس میں سر سید اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اکثر لکھتے اور نہایت دلچسپی سے اس کی نگہداشت کرتے تھے۔ غرض یہ کہ سیاسی معاملات پر مضامین کے علاوہ اس میں سوشل، اخلاقی اور مفید علمی مضامین برابر چھپتے رہتے تھے۔

مندرجہ بالا تمام تصانیف میں اسباب بغاوت ہند جو خالص سیاسی ہے خطبات احمدیہ جو مذہبی ہے اور تبیئن الکلام جو مذہبی کے ساتھ ایک سیاسی مقصد بھی رکھتی ہے، بہت مشہور و معروف ہوئیں۔ اس پورے دور پر نظر ڈالیں تو ہمیں سیاسی، تاریخی اور مذہبی تمام تحریروں میں نئے رجحانات، تشکیل پاتے ہوئے نظریات، واضح اور پختہ انداز محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ادب میں مقصدیت شامل ہو جاتی ہے۔ مذہبی نظریات میں اجتہادی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ یہی چیزیں سر سید کے اس دور تحریر کی خصوصیتیں ہیں۔ اس بحرانی دور میں جب کہ پستی و جہالت خصوصی طور پر مسلمانوں کا ورثہ اور غلامی و محکومی، مفلسی و جہالت، تمام ملک میں انگریزوں کے سیاسی تسلط کا ثمرہ بن گئیں تھیں، سر سید کے سیاسی نظریات، اسباب بغاوت ہند کی صورت میں واضح ہو گئے۔ اس کتاب میں انہوں نے غدر کے جو پانچ خاص سبب قرار دئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اول۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

۱۔ جون ۱۸۶۲ء اور دسمبر و نومبر ۱۸۶۷ء و ۱۸۶۸ء کے اخباروں میں بہ ترتیب شائع ہوئے۔

۲۔ مئی و جون ۱۸۶۳ء، ستمبر ۱۸۶۶ء کے اخباروں میں بہ ترتیب شائع ہوئے۔

۳۔ ۱۸۶۶ء و جنوری ۱۸۶۷ء کے اخباروں میں بہ ترتیب شائع ہوئے۔

دوم ۔ جاری ہونا ایسے آئین و ضوابط اور طریقہ، حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے موافق نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے ۔

سوم ۔ ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصل حالات اور اطوار و عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گذرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا ۔

چہارم ۔ ترک کرنا امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجا لانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لئے واجب اور لازم تھا ۔

پنجم ۔ بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر الذکر چاروں میں خود گورنمنٹ کی غلطیاں ثابت کی ہیں اور ہنگامۂ غدر کے لئے گورنمنٹ کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے ۔ صرف اول الذکر رعایا سے متعلق ہے جس میں ان کا قصور نہیں بلکہ وہ غلط فہمیاں شمار کرائی گئی ہیں جن کے باعث ہندوستانی عوام گورنمنٹ انگلشیہ سے برگشتہ ہوئے ۔ گو تحریر اور لب و لہجہ نرم اور سلجھا ہوا ہے جس میں آداب گورنمنٹ کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے ۔ مگر اس کا لب لباب یہی ہے کہ گورنمنٹ کی بدانتظامیوں اور حکام کی بدعنوانیوں سے ایسے حالات پیدا ہوئے ۔

"اب غور کرو کہ ہمارے حکام اور ہندوستانیوں کا خون ایک نہ تھا، مذہب ایک نہ تھا، رسم و رواج ایک نہ تھا، دلی رضامندی رعایا کو نہ تھی ۔ آپس میں محبت و اتحاد نہ تھا پھر کس بات میں ہمارے حکام ہندوستان سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے ۔" ۱
اس کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ ہمارے ادب میں نئے مغربی اصولوں پر واضح اور مکمل صورت میں سیاسی مقاصد کا شمول یہیں سے ہوتا ہے "اسباب بغاوت ہند" میں جس بنیادی اصول سیاست کو انھوں نے واضح کیا ہے وہ یہ ہے کہ ملکی امن و خوش حالی اور ترقی کے لئے حکومت میں ہندوستانیوں کی شرکت لازمی ہے ۔ چنانچہ اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں "اصل سبب فساد کا تو میں ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں وہ اس کی شاخیں ہیں اور یہ سمجھ میری وہمی اور قیاسی ہی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانے کے بہت سے عقلمندوں کی رائے کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ کے اس باب

---

۱ ۔ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سید احمد خان ۔ ص ۶۴

یں میرے طرف دار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں۔ سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائیداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت میں واجبات سے ہے۔ حکام کو بھلائی یا برائی کی تدبیر صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ خرابیاں اس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو"۱ یقیناً یہ ان کی ترقی پسند ذہنیت اور دلیری کی آئینہ دار ہے مگر وقت اور حالات کے ساتھ کچھ اور بھی تقاضے تھے۔ ان میں ایک یہ کہ غدر کی تباہیوں سے بچے ہوئے مسلمانوں کو حکام کے غصہ و نفرت کی آتشین زد سے بچا کر زندہ رہنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس کے لئے انھوں نے وفادار مسلمانانِ ہند (لائل محمڈنز آف انڈیا) لکھنا شروع کیا تھا۔

تبیئین الکلام ان کی وہ مذہبی تحریر ہے جس میں ایک سیاسی مقصد بھی شامل تھا۔ انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی تسلط کے ساتھ مسلمانوں کو تین بڑے خطرے درپیش ہوئے جن کا ذکر سرسید کی مذہبی خدمات کے سلسلے میں پچھلے باب میں آچکا ہے۔ مگر یہاں پر تبیئین الکلام کے موضوع، مواد اور اہمیت کو سمجھنے کے لئے ان کو پھر درج کرنا بہتر ہے۔ ایک تو مشنریوں کا اسلام پر حملہ اور اعتراضات جس کا مقابلہ قدیم مناظروں کے ذریعہ کیا گیا تھا مگر وہ ناکافی تھے اور ان کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود ہوتا تھا۔ دوسرے مغربی تعلیم سے آشنا نوجوان جو قدیم مذہبی روایات میں سائنس و عقلیت کا شافی جواب نہ پاکر مذہب سے برگشتہ ہو جاتے تھے۔ تیسرے یہ کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں قدیم صلیبی جنگوں کے باعث ایک نفرت چلی آتی تھی۔ اسلام سے منسوب غلط بیانیوں کے باعث عام طور پر عیسائی اسلام کو فساد کا باعث سمجھتے تھے اس وجہ سے بھی مسلمان انگریز حکام کی نظروں میں کھٹکتے تھے"۲ ادھر مسلمان انگریزوں سے کشیدہ مغرب اور اس کی تمام قدروں سے قصداً کنارہ کش تھے۔ چنانچہ سرسید نے صحیح سوچا کہ آپس کی مذہبی مفاہمت و قربت کے ذریعہ ہی مسلمانوں میں مغربی تعلیم و تہذیب سے آشنائی پیدا کی جاسکتی ہے تاکہ نئے اصولوں اور نئی قدروں سے مستفید ہو کر نئے زمانے

۱۔ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سید احمد خاں۔ ص ۱۱۱ تا ۱۱۲

۲۔ حیات جاوید مصنفہ حالی، حصہ دوم ص ۱۳۴ (پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۰۱ء)

میں اپنی جگہ بنا سکیں ۔ نئے علوم میں حصہ لینے کے لائق ہوں اور مستقبل کی راہیں متعین کر سکیں ۔

تبئین الکلام انھیں مقاصد کے پیش نظر لکھی گئی جس نے یقیناً ان تینوں خطروں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کیا یہ تصنیف مذہبی لحاظ سے اجتہادی رجحانات کی حامل ہے اس میں مذہب کی تشریح نئے اصولوں کے ساتھ کی گئی ہے ۔ رسالہ احکام طعام اہل کتاب بھی اسی مقصد کے لئے تھا کہ مسلمان انگریزوں سے مفاہمت میں مذہب کو مانع نہ سمجھیں ۔ یہاں تبئین الکلام پر گارساں دی تاسی Garcin de Tassy کے تبصرہ کا اقتباس پورے طور پر اس کی ادبی اہمیت اور نئے انداز تحریر کی وضاحت کرتا ہے ۔ ۷ دسمبر ۱۸۶۳ء میں اردو ادب کی رفتار و ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

" سید احمد کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات گہری ہیں اور انھیں صرف قرآن اور توریت و انجیل پر کافی عبور نہیں ہے بلکہ دوسری مشرقی تصنیفات سے بھی وہ پورے طور پر واقف معلوم ہوتے ہیں ۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب اس امر کا ہے کہ موصوف نے یورپین تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی مشرق کی کسی زبان میں اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے اس نوعیت کے مطالب کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہو . . . . . نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ عیسائیوں کے لئے اس میں بعض باتیں نئی اور سبق آموز ہیں ۔ یہ کتاب یقیناً انجیل کی ایک نہایت مکمل شرح ہوگی ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی اور اسلامی تعلیم میں میل پیدا کرے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ غالباً اس کے ہم مذہب لوگ بھی اس کی رواداری کی باتوں کو بری نظر سے دیکھیں گے ۔ دوسری جانب عیسائی لوگ غالباً کبھی اس بات کی صداقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ قرآن پاک بھی ایک آسمانی کتاب ہے ۔ ہوگا یہ کہ مسلمان کفر کے فتوے دیں گے اور عیسائی مصنف ان کے علمی اور صلح پسندانہ خیالات کے ساتھ اتفاق کرنے سے انکار کریں گے "[۱] خطبات احمدیہ سرسید کی وہ بلند پایہ تصنیف ہے جو ولیم میور William Muir کی کتاب کا مدلل جواب بھی ہے ۔ ساتھ ہی اسلام کے متعلق عیسائیوں کی تمام غلط بیانیوں کا رد بھی ۔ یہ دلائل و براہین کے ساتھ ان باتوں کے متعلق ثبوت دیتی ہے ۔ یہ دیگر مذاہب کے محققین پر محمدؐ کے متعلق روشن حقیقتیں واضح اور شافی جواب مہیا کرتی ہے جس سے انکار ممکن نہ تھا ۔ علاوہ ازیں اس

---

۱ ۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ ۔

نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے واسطے بھی شافی جواب پیش کئے ہیں اور مذہبی مباحث کے لئے جدید اصولوں کی روشنی میں تحقیق کی راہ کھول دی۔

تصحیح فیروز شاہی تاریخی چیز ہے۔ اس کی تصحیح سرسید نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فرمائش پر بغیر معاوضہ مکمل کی۔ اس بات سے ان کی ادب نوازی علم دوستی اور ذوق تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کی اول تا آخر تمام عربی و فارسی کی مشہور تواریخ سے سرسید واقف تھے اور ان کا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے تاریخ فیروز شاہی تک ان تمام تاریخوں کو شمار کیا ہے۔ جن میں عربی کی تاریخ یمنی از ابونصر، فارسی کی تاریخ از ابوالفضل، تاج الماثر از خواجہ صدر الدین، جامع الحکایات از سدید الدین عوفی، طبقات ناصری از قاضی منہاج السراج البحرجانی۔" ۱

اخبار سائنٹفک سوسائٹی صحافت کا عمدہ نمونہ تھا جس میں عمدہ اور مفید مضامین، اردو زبان میں اچھا اضافہ تھے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی جاری کر کے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔" ۲ حالی لکھتے ہیں: "ایک خاص وصف جو اسے ہندوستانیوں کے تمام انگریزی و دیسی اخبارات سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلازاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لئے جو ہمیشہ نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ . . . . ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا۔ اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔" ۳

گویا سرسید نے اعلیٰ صحافت کا ایک معیار قائم کر دیا۔ اس میں علمی عناصر زیادہ تھے جو سنجیدہ فکری شعور کی تشکیل میں معاون ہوئے۔ لیکن صحافت اور سیاست میں ایک خصوصی

۱۔ از دیباچہ تاریخ فیروز شاہی در اخبار سائنٹیفک سوسائٹی جلد ۱ شمارہ ۲۲ بابت ۲۴ اگست ۱۸۶۶ء

۲۔ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق ص ۲۴۰

۳۔ حیات جاوید مصنفہ حالی ص ۱۳۱ (حصہ اول۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

لگاؤ ہوتا ہے۔ صحافت سیاسی بیداری کے اسباب پیدا کرتی ہے اور سیاسی نظریات کی تشکیل میں معاون ہوتی ہے۔ اس اخبار کے موٹو سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید آزادی کو ہندوستانیوں کا حق سمجھتے تھے یعنی آزادی چھاپہ کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور اصلی جبلی حق رعیت کا۔" اخبار سائنٹیفک سوسائٹی نے نئے علمی رجحانات اور سیاسی شعور کی تشکیل میں حصہ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ نئے ذہنوں کی تشکیل، نئے علوم کی ترویج، اور نئے سیاسی فہم کی ابتداء کرنے میں سرسید نے اس اخبار سے بڑا کام لیا۔

اس پورے دور کی تحریروں میں مقصدیت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ جس سے ادب و زندگی کا تعلق واضح ہونے لگا۔ سرسید نے ادب میں اجتماعی نقطۂ نظر کا آغاز کیا جس میں عقلیت و مادیت کو خاص دخل تھا۔ مذہب میں اجتہادی رجحان واضح تر کر دیا۔ وہ مذہب کو جذبات کے تحت نہیں بلکہ علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کی راہ کھول دیتے ہیں۔ تحقیق کو سنجیدہ تصانیف کا اہم جز قرار دیا۔ روایت کے بجائے دلائل سے رابطہ پیدا کیا۔ اور یہ جدید اصول واضح کر دیا کہ حقیقت کی تلاش جذبہ و تقلید کے تحت نہیں تحقیق کے ذریعہ کرنی چاہئے۔ ان سب کے شمول سے اردو ادب میں وقار و وزن پیدا ہو گیا۔ سرسید نے اس طرح ادب میں وہ نئے اصول وزاویے قائم کئے جو جدید ادبی رجحانات کا ترکہ اور مغرب کا ورثہ ہیں۔ اس دور کی تحریروں میں پہلے دور کی بہ نسبت سادگی اور صفائی ہے ساتھ ہی اکثر اوقات اثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ جو پہلے نہ تھا کہیں کہیں بیان میں ایسا درد ہے کہ عبرت و نصیحت کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زبوں و درماندہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر، علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی حادثہ ہے جس سے انسان کا یا پلٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اس کا اعتبار کے قابل نہیں رہتا۔ کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں ہوتا جو کام انسان سے بڑا سرزد ہوتا ہے وہ درحقیقت برا ہی ہے۔ مگر اس کم بخت وقت کا مقتضٰی یہ ہوتا ہے کہ اس کا اچھا کام بھی برائی اور ظاہرداری پر محمول ہوتا ہے۔"[1]

۱۔ حالات خیر خواہان مسلمان۔ سرسید احمد خان۔ ص ۳۹۔ ۴۰۔

یقیناً سرسید کے ذریعہ سب سے اول اردو ادب میں اجتماعی تصورات شامل ہوئے انھوں نے مقصد کو رفاہ و اصلاح عام کے لئے ادب میں شامل کر دیا۔ عقلیت، استدلال اور تحقیق کو علم و ادب کا جزو بنا دیا۔ چونکہ مقصدی نقطۂ نظر تشریح و تفصیل کا محتاج ہوتا ہے اس لئے تشریح، توضیح اور تفصیل نے سرسید کی تحریروں میں نمایاں مقام بنا لیا۔ سرسید کا یہ دور تحریر پختگی، اسلوب، سادگی اور تاثر کے لحاظ سے کم اور وسعت ذہن، فکر کی گہرائی اور نئے رجحانات کی تشکیل کے لحاظ سے زیادہ اہم ہے۔ ان نئے اصولوں اور رجحانات نے سرسید کی تحریروں میں اب وسعت و گیرائی، تازگی و عمق پیدا کر دیا۔ اس دور تحریر کا یہی خاص وصف ہے۔ سرسید کی تمام تصانیف عمومی طور پر اور مشہور ادبی کارنامے خصوصی طور پر نئے رجحانات کی تشکیل، جدید اصولوں کی وسعت، اجتماعیت کی قوت، اجتہاد کی سرگرمیاں اور افکار کا حسن اپنے اندر جذب رکھتی ہیں۔ سرسید کا یہ دور طرز ادا اور اسلوب بیان سے زیادہ فکر کی جدتوں اور وسعتوں کے لئے لائق تحسین ہے۔ اب ان کی تصانیف صرف ذوق علمی کی بناء پر نہیں بلکہ مقصد کے تحت تحریر میں آئیں۔ اردو ادب میں ماورائی تصورات تقلید اور نقل روایات کے بجائے مادیت، افادیت، عقلیت، زندگی کا اجتماعی تصور اور تحقیق بہ دلائل سرسید ہی نے شامل کئے جن کی ابتداء اسی دوسرے دور تحریر میں ہوئی۔ وقت کی رفتار اور زمانے کے تقاضوں پر غور و خوض، مسائل حاضرہ کو حل کرنے کی کوشش اصول و خیالات کی جدت اسی دور کی تحریروں سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔

تیسرا دور تحریر

یہ دور ۱۸۷۰ء میں سرسید کی انگلستان سے ہندوستان کی واپسی پر شروع ہو کر ان کی عمر کے ساتھ ۱۸۹۷ء میں ختم ہوتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس نے سرسید کی ادبی خدمات کو ان کا تصنیفی سرمایہ ہی نہیں بلکہ ان کی مصلحانہ کوششوں کا میدان خاص اور ملک و قوم کی ترقی کا عنوان عام بھی بنا دیا۔ اسی وجہ سے آج جب ہمیں سرسید کی مصلحانہ کاوشوں کی تلاش ہوتی ہے تو ہم ان کی اس دور کی خدمات ادبی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لئے بھی کہ ان کی ادبی خدمات ان کی تمام مصلحانہ کاوشوں کا آئینہ ہیں جن کے بغیر سرسید کی کاوشوں کا سمجھنا ممکن نہیں، اور اس لئے بھی کہ یہ اردو ادب میں فکر و ذہن طرز ادا

اور اسلوب ہر لحاظ سے جدت اور وسعت شامل کرتی ہیں بلکہ اپنے زبردست اثر سے اردو ادب میں ایک نئی دنیا پیدا کر دیتی ہیں۔ مقالہ نگاری اس دور میں ایک خاص مقام حاصل کر لیتی ہے۔ جو نقد و نظر، سیر و سوانح، مذہب و سیاست، علم و ہنر، اخلاق و عادات، شاعری و صحافت کے تمام عنوانوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ ادب اور زندگی کے ہر پہلو کی وضاحت کر کے ادب کو زندگی کا آئینہ و نقاد اور زندگی کو ادب کا عنوان بنا دیتی ہے اور تحقیق و تنقید کو اس کا میدان کارزار بنا کر سرسید کی فکری صلاحیتوں کی داد لیتی ہے۔ تحریر کا تاثر اور طرز ادا کا حسن اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس دور میں سرسید نے اردو ادب کو وہ آزاد ذہن دیا جس میں زندگی کی وسعتیں، عقل کی گیرائی اور نظر کا عمق بیک وقت بغل گیر نظر آتے ہیں۔ اس دور کی تحریریں مندرجہ ذیل کارناموں پر مشتمل ہیں۔

(۱-) تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپسی کے بعد ہی جاری کیا جو پہلی بار ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۶ء دوسری بار ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۲ء اور تیسری بار ۱۸۹۴ء تا ۱۸۹۶ء جاری رہا۔ یعنی وقفوں کے ساتھ تقریباً پندرہ سال کے عرصے تک نکلتا رہا ان تمام جلدوں میں بیشتر مضامین سرسید کے ہیں جو مختلف انتخابات کی صورت میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تہذیب الاخلاق سرسید کے مشن کا زبردست آرگن تھا۔ سرسید کے مخالفین کے لئے اس نے آگ پر تیل کا کام کیا مگر سرسید کے مضامین نے اسی کے ذریعہ پورے دور کے ذہن پر جدید کی مہر ثبت کر دی۔ نظریات کی ٹکر جتنی زبردست ہوئی اس سے زیادہ زبردست اس کا اثر ہوا جس نے کسی کو مغلوب کسی کو مجوب اور کسی کو مسحور کر لیا۔ بقول محمد احسن فاروقی "تہذیب الاخلاق اردو نثر نگاری کا سنگ بنیاد ہے"۔ ۱

(۲-) ولیم ہنٹر William Hunter کی کتاب The Indian Musalmans پر سرسید نے ۱۸۷۱ء میں زوردار ریویو لکھا اور مصنف کے خیال کو غلط ثابت کیا کہ مسلمان کے لئے مذہبی حیثیت سے انگریزوں کے ساتھ مجاہدہ کرنا اور باغی ہونا لازمی ہے یا پھر اس کا بدل ہجرت ہے۔ ہنٹر Hunter لکھتا ہے۔ ایک مسلمان کا پہلا فرض مرد مجاہد بننا ہے اور ان لوگوں کے لئے جو کہتے ہیں کہ سلطنت

۱۔ سرسید کا طرز ادا از محمد احسن فاروقی در برگ گل سرسید نمبر ۵۴ - ۱۸۵۵ء ص ۱۲۴ -

انگلشیہ کے زیر حکومت یہ ناقابل عمل ہے اس کا بدل ہجرت ہے "۱

(۳-) تفسیر القرآن ۱۸۷۶ء میں لکھنی شروع کی جس کی تفصیل یوں ہے۔

تفسیر القرآن حصہ اول ۱۸۸۰ء تفسیر القرآن حصہ دوم ۱۸۸۲ء

تفسیر القرآن حصہ سوم ۱۸۸۵ء تفسیر القرآن حصہ چہارم ۱۸۸۸ء

تفسیر القرآن حصہ پنجم ۱۸۹۲ء تفسیر القرآن حصہ ششم ۱۸۹۵ء

تفسیر القرآن حصہ ہفتم (جو ۱۹۰۴ء میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی)

سرسید کے تفسیر کے اصول و قواعد میں عقلیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ جو بات عقلیت کی ترازو میں پوری نہیں اترتی تھی یا عام اصول نیچر کے خلاف معلوم ہوتی تھی، سرسید رائج الوقت اعتقاد کی صورت میں اسے نہیں مانتے تھے بلکہ قرآن شریف سے اس کی عقلی توضیح و تاویل کرتے تھے۔ اس وجہ سے انھیں علماء اور مذہبی خیالات کے لوگوں کے نفرت و غصہ کا شکار ہونا پڑا۔ مگر وہ جس بات کو سچ جانتے اس کے اظہار میں کبھی تامل نہ کرتے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل رسالے ہیں جو تقریباً سب مذہبی عنوانات پر لکھے گئے ہیں۔

(۴-) طریقۃ الصلوٰۃ ۱۸۷۷ء

(۵-) قدیم نظام دیہی (مطبوعہ ۱۸۷۸ء) کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے یہ قدیم اقتصادیات کے متعلق ہے جس میں زراعت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ سرسید نے اس نظام کی خوبیاں اور خامیاں بھی جگہ جگہ بیان کی ہیں۔

(۶-) رسالہ ہوالموجود ۱۸۸۰ء

(۷-) تصانیف احمدیہ۔ مختلف مذہبی تصانیف کا مجموعہ ہے جو ۱۸۸۳ء اور پھر ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔

(۸-) اسرار الصلوٰۃ ۱۸۸۸ء

(۹-) ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم ۱۸۸۹ء۔

(۱۰) ازالۃ الغین عن ذوالقرنین ۱۸۸۹ء۔

(۱۱) خلق الانسان ۱۸۹۱ء۔

1- *Indian Musalmans* — By W.W. Hunter P. 76

(۱۲-) الدعاء والاستجابہ ۱۸۹۲ء

(۱۳-) تحریر فی اصول التفسیر ۱۸۹۲ء

(۱۴-) تفسیر جن الجان ۱۸۹۳ء

(۱۵-) ابطال غلامی ۱۸۹۳ء

(۱۶-) تبریۃ الاسلام عن شین الامۃ ولامۃ العلوم ۱۸۹۵ء

(۱۷-) سیرۃ فریدیہ ۱۸۹۶ء ۔ یہ سرسید کے نانا کی مختصر سوانح ہے ۔

(۱۸-) تفسیر السموات ۱۸۹۷ء

(۱۹-) النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی ۔

مندرجہ بالا رسائل میں تقریباً سب کے سب مذہبی مباحث پر ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید نے اس زمانے میں تفسیر القرآن کی اہم ذمہ داری اٹھالی تھی ۔ اس دور کی مخصوص اہم چیزوں میں ایک تو تفسیر القرآن ہے جس کا تعلق صرف مذہبی عقائد سے ہے ۔ اس تفسیر کی بنیاد سرسید نے ایک نئے علم الکلام پر رکھی ۔ بقیہ تمام مذہبی تحریریں بھی انھیں اصولوں کے تحت لکھی گئیں ۔ سرسید علوم جدیدہ کے مقابلے کے لئے علم الکلام کی تشکیل کو نہایت اہم جانتے تھے ۔ جب ندوۃ قائم ہوا تو انھوں نے ارباب ندوۃ کو متوجہ کیا ۔ اپنے خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔" اب وہ زمانہ نہیں رہا اور جدید علوم حکمیہ پیدا ہونے لگے ہیں ۔ ان جدید علوم کا روز بروز شیوع ہوتا جاتا ہے اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتا ۔ اگلے زمانے کے عالموں نے بھی حکمت اور فلسفہ، یونانی بلکہ منطق کے بھی پڑھنے کو حرام قرار دیا تھا مگر اس سے کچھ نتیجہ نہ ہوا ۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس کو پڑھا اور لاچار خود علماء نے اس کی تحصیل کی اور علم الکلام ایجاد کیا جو مسائل وحکمت و فلسفہ و طبیعات کے علوم جدیدہ کے ذریعہ پیدا ہوئے ان کے لئے وہ علم الکلام جو یونانی فلسفہ، حکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے ۔ اس سبب سے الحاد و زندقہ مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے "۱ اس نئے علم الکلام سے جو سرسید نے پیش کیا مسلمانوں کے مذہبی نظریات کو قدیم سے جدید میں تبدیل کرنے میں بہت مدد ملی ۔

---

۱ ۔ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۲۹۷ ۔ ۲۹۸

سرسید کی تفسیر سے کلی اتفاق نہیں کیا گیا اور اکثر توجیہات کو حد سے متجاوز مانا گیا۔" اس تفسیر میں روایات سے بغاوت اپنی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس میں اصول و طریقۂ کار اور نصب العین سب کچھ پرانی تفسیروں سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام کا کوئی مسئلہ عقل اور اصول تمدن کے خلاف نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ سرسید نے ناسخ و منسوخ، معراج جسمانی، جہاد، سود، غلامی، تعداد ازدواج، ابلیس کی کہانی، ملائکہ اور جنات، وفات مسیح اور رؤیت باری وغیرہ کے متعلق جمہور سے اختلاف کیا ہے۔"۱ سرسید کی مخالفت کئے جانے کے باوجود نئی نسل کا مذہبی ذہن کم و بیش اسی روشنی میں تعمیر ہوا۔ قدیم علماء نے کلی طور پر سرسید کی توجیہوں کو نہ مانتے ہوئے بھی ان کے بنیادی اصولوں سے بیشتر اختلاف نہیں کیا، جس سے مذہب پر غور کرنے اور عقل کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی راہ صاف ہوتی گئی۔ اس آخری دور میں ان کا زور بیان بہت کچھ مذہبی مباحث اور دقیق مسائل تفسیر اور مذہبی توجیہات میں صرف ہوا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں "زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو غلط سمجھتا تھا تاہم اس سے مجھے کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔"۲

سرسید کا ایک اہم کارنامہ جو ادب سے تعلق رکھتا اور اس دور میں ہمہ گیری حاصل کرتا ہے ان کی مضمون نگاری ہے۔ یہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ نہایت کامیابی سے پروان چڑھی۔ تہذیب الاخلاق سرسید کی اصلاحوں کا کارزار اور ادب و تنقید کا میدان خاص تھا۔ علمی و مادی لحاظ سے تہذیب کا یہ کارنامہ بھی کم نہیں مگر اس کی قدر و منزلت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ ملک میں ایک خاص علمی و ادبی اور فکری روح پیدا ہوئی جس نے مسلمانان ہند کے انداز فکر و نظر میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔"۳ یقیناً سرسید نے کوزہ میں وہ دریا سمو دیا تھا جو ہماری تمام جدید علمی، ادبی اور سماجی ترقیوں کا محور اور نثری ترقیوں کا مخزن بن گیا۔ انھوں

۱۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۴۷

۲۔ مقالات شبلی جلد دوم ص ۶۴

۳۔ تہذیب الاخلاق کی اہمیت از ڈاکٹر سید عبداللہ در برگ گل ص ۲۰

نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اپنے زیر دست و پر اثر مضامین سے مغربی خیالات کو مشرقی زبان و بیان میں ڈھال کر پیش کیا۔ اجتماعی فکر کی روح پیدا کی۔ قومی عزت و ترقی اور اتحاد پر بہت زور دیا۔ اخلاقی و معاشرتی کمزوریوں اور خامیوں پر بڑے زور و شور سے توجہ دلائی اور ان کے نقصانات سے متنبہ کیا۔ مذہبی نظریات میں عقلیت کو شامل کر کے نئے اصول تحقیق وضع کئے۔ اس طرح نئے سماج میں بڑھتی ہوئی مذہبی بیزاری کا مقابلہ کیا۔ ماضی پر فخر کے ساتھ حال کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کی فضا پیدا کی اور مستقبل کی ترقیوں اور امکانات کا احساس دلایا ادب و انشا کا ذوق صحیح پیدا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو ادب کو قومی مفاد اور اجتماعی افکار کا وسیلہ اور زندگی کا ترجمان بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ سر سید کے یہاں موضوعات کا تنوع حیرت انگیز ہے۔ علم و ادب، تاریخ و تنقید سیر و سوانح، مذہب و سیاست، تہذیب و معاشرت عقل و حکمت، مادیت و روحانیت، مغرب و مشرق، قدیم و جدید، وہ کون سا موضوع ہے جس کو نہایت کامیابی سے نہ برتا ہو۔ اس طرح تحقیق و تنقید ہمارے ادب کا اہم جز بن گئے و مقصدیت کو پورے طور سے استعمال کر کے ادب و زندگی کا رشتہ اور اس کے نقوش واضح کر دئے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں" سر سید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے۔ اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہونچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر نا ممکن ہے"۔[1] یہی خصوصیتیں ہیں جس سے اردو نثر کو جلا ملی۔ مضمون نگاری ہر دل عزیز بن گئی اور اردو ادب کو نیا ذہن اور نئی روشنی حاصل ہوئی۔

سر سید ماہر فن تھے انھیں زبان و بیان پر پوری مہارت حاصل تھی۔ وہ اسلوب اور زبان پر حاوی ہی نہ تھے بلکہ ان کا اصل کمال یہ تھا کہ تجدید کی نئی راہیں متعین کرنے میں انکی حیثیت مجدد کی تھی۔ سر سید کا نقطۂ نظر اور طرز عمل جدید ادبی ترقیوں کا حرف اول، نئے ادبی رجحانات کا نقطۂ آغاز اور عصری تقاضوں کا حرف آخر تھا۔ جو نقوش انھوں نے بنائے اور جو زاویئے کئے وہی اس دور کے نئے علمی شعور اور ادبی ترقیوں کا ماٰمن و ماخذ تھے اس دور کے تمام ادباء، شعراء اور محققین نے انہی سے پوری روشنی حاصل کی۔ انھیں رجحانات کو اپنا کر وہ اردو ادب میں گراں قدر سرمایہ کا اضافہ کر سکے اس کا احساس

۱۔ مقالات شبلی حصہ دوم ص ۶۹

خود سرسید کو بھی تھا۔ "علم و ادب اور علم انشا سے بھی ہم نے غفلت نہیں کی کیونکہ ہم نے اپنے آرٹیکلوں کو اس طرز جدید صاف و سادہ پر لکھا ہے جو دل میں سے نکلنے والی اور دل میں بیٹھنے والی ہے۔ اس طرز پر لکھنے سے اپنی قوم کو موجودہ علم انشا کی برائی کا بتلانا اور اس میں تبدیلی کی ضرورت کا ہونا سمجھایا ہے اور اگر ہمارا خیال غلط نہ ہو تو ہم نے اپنی قوم میں اس کا کچھ اثر بھی پایا ہے۔"۱ اس دور تحریر میں سرسید کا طرز تحریر پختہ اور پر اثر نظر آتا ہے۔ زور بیان اور علمی وقار ایک طرف سادگی و دل نشینی دوسری طرف تحریروں کا حسن دلنواز بن جاتے ہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ شوخی و ظرافت بھی اکثر اوقات پائی جاتی ہے۔ جس سے دلچسپی اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض سرسید نے جو کچھ بھی لکھا اس میں ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف کی شان اور اعلیٰ طرز تحریر کا حسن نمایاں ہے۔ اس میں ایک طرف اسلوب اور اسٹائل کی جدت مسحور کرتی ہے تو دوسری طرف فکر و نظر کی وسعتیں، علم و ادب کا مکمل وقار اور موضوعات کا حیرت انگیز تنوع مرعوب کرتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جدید اردو ادب کا نقش ثانی سرسید ہی کے ذوق علم و ادب کا تعمیر کردہ ہے۔ "ادب کو شعلۂ نفس بنا کر اسے مقاصد جلیلہ کی گرمی اور سماجی شعور کی برکت عطا کر کے سرسید نے اردو ادب کو پستی سے بلندی تک پہونچا دیا۔ اس میں علمی سرمایہ پیدا کیا۔ اس کو مختلف اصناف سے مالا مال کیا۔ اس سے زندگی کی رہنمائی کا کام لیا۔ . . . سرسید ایک مجدد فن تھے اور ان کی تجدید فن سے نظم و نثر دونوں میں بلندی آئی۔ سرسید کی مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے ادب کے ذریعہ سے ہی ذہنی انقلاب ممکن ہے اور ادبی میدان میں ترقی سے ہی آئندہ کے لئے روشن اور نتیجہ خیز امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔"۲

سرسید کا کارنامۂ ادب فکر و نظر کی وسعتوں ہی میں نہیں طرز ادا اور اسلوب کی جدت حسن میں بھی نمایاں ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ جس موضوع کیلئے جس قسم کے

۱۔ تہذیب الاخلاق بابت یکم محرم الحرام ۱۲۹۱ھ

۲۔ علی گڈھ تحریک در مضمون سرسید اور مغرب کے تہذیبی و ادبی اثرات از پروفیسر آل احمد سرور ص ۷۶-۷۵۔

طرزِ تحریر کی ضرورت ہوتی ہے سرسید کی تحریریں ہمیشہ اسی اندازِ بیان میں ڈھل جاتی ہیں۔ اگر ان کے اسلوب بیان کو معلوم کرنا ہو تو یہی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر رنگ میں ڈھل جانے کی صلاحیت، یہی ان کا خاص اسٹائل کہا جا سکتا ہے۔ سادگی اور سیدھا سادہ انداز ان کا عام رنگ تھا۔ مگر ایسی سادگی جس میں حلاوت محسوس ہونے لگے انشاپردازی کا ایک بڑا کمال ہے۔ مثلاً "نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے میرؔ و دردؔ و ظفرؔ نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کو سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔" ۱ یا "دیکھ نادان بچہ گہوارے میں سوتا ہے اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے۔ اور گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے ہاتھ کام میں اور دل بچہ میں۔" ۲

اس حلاوت اور سادگی ادا کے ساتھ سرسید کے یہاں زورِ بیان بھی حد درجہ کا ملتا ہے۔ ان کے زورِ بیان میں دلالت تحریروں کے وزن و وقار کو بڑھا دیتی ہے مثلاً "انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قوی کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے پس ہر ایک انسان کو لازم ہے کہ وہ اپنے اندرونی قوی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بیکار نہ چھوڑے۔" ۳ یا "دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرضِ مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھے لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے اثر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آئند باجے کی

۱۔ مقالات سرسید حصہ دہم مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۱۱۵

۲۔ مقالات سرسید از عبداللہ خاں خویشگی در مضمون امید کی خوشی۔ ص ۱۷۱

۳۔ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، کاہلی ص ۱۹۶۔۱۹۵

آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے "۔ ۱

درد و اثر سرسید کی تحریروں کا ایک خاص جز ہے۔ یہ سرسید کے بقول " دل سے نکلے اور دل میں اتر جائے "۔ ان کی تحریریں اکثر درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو قلب میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ " اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامید دلوں کی تسلی امید تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں، اس کے مرے ہوئے خیالوں کو پھر زندہ کرتی ہیں تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانے کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں "۔ ۲

محاکات شاعری کا ایک خاص وصف ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعری میں تو سماں بندھ جاتا ہے مگر نثر میں یہ وصف ایک افسانوی انداز اور خاص کیفیت پیدا کر کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ سرسید کی تحریروں میں یہ وصف اتنا حسین اور پر اثر ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھینچ دیتا ہے اور پڑھنے والوں پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے۔ جو ایسے موقعوں پر مصنف کا اصل منشاء ہے۔ افسانوی لطف کے ساتھ درد میں ڈوبی ہوئی کیفیت سماں باندھ دیتی ہے مثلاً " دیکھو وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنویں میں سات تہ خانوں میں بند ہے۔ اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرا زرد ہے۔ بے یار و دیار، غیر مقام، غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہونچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانے کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس گھر

۱۔ مقالات سرسید مرتبہ عبداللہ خان خویشگی ص ۱۷۶

۲۔ انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق سرسید احمد خان در مضمون امید کی خوشی مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۹۸

کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید تجھی میں اس کی خوشی ہے۔" ۱

سرسید کی تحریریں ٹھوس تاریخی حقائق، علمی مسائل، مذہبی مباحث، رسوم ورواج پر نکتہ چینی اور علمی و ادبی تنقید سے بھری پڑی ہیں مگر ان سنجیدہ موضوعات کی کثرت میں حسب موقع شوخی و طنز و ظرافت ان کی علمی اور سنجیدہ تحریروں کے مقابل ایک رنگین قوس قزح کا حسن بکھیر دیتی ہیں۔ "سرسید کے انداز میں محض منطقی استدلال یا سپاٹ انشا پردازی نہیں اس میں حسب موقع شوخی و ظرافت کا بھی رنگ جھلک اٹھتا ہے۔۔۔۔ ان کی شوخیوں میں بڑائی اور بے نیازی کا انداز ہے جو انھیں معیاری سطح سے نیچے اترنے نہیں دیتا۔" ۲ محسن الملک کے نام ایک خط لکھتے ہیں "تبدیل وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب بجا ہے بشرطیکہ میرا جادو۔ توبہ تو بہ میرا معجزہ۔ نعوذ باللہ میری کرامت لاحول ولا قوۃ الا باللہ میری حماقت تم میں اثر نہ کرے گی۔ ذرا صبر کرو، تین مہینے خیر سے گذر جاویں جب الہ آباد کے اسٹیشن پر گلے ملوگے اور چھاتی سے چھاتی لگے گی اس وقت پوچھیں گے کہ جان من (معاف کیجئے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہے؟" ۳

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ "ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں ایسے تنگ آ گئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈرنا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ روایت شاذہ سے۔۔۔۔ دائی مصر کے

۱۔ انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق سرسید احمد خان مرتبہ سید ابوالخیر کشفی ص ۱۰۰

۲۔ انتخاب مضامین سرسید از محمد شمیم در تنقید۔ ص ۱۵

۳۔ مکتوبات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ص ۱۰۸

ساتھ علماء مصر بھی تھے انگریزوں کے ساتھ بغیر ذبح کئے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔"[۱]

شوخیٔ تحریر کے ساتھ ظرافت میں بے ساختگی لطیف بن جاتی ہے۔ پٹیالہ اخبار کے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں: "پس جناب اگر آپ نے بلحاظ فضل و کمال ایڈیٹروں کے نمبروں کا بکھیڑا لگایا تو وہی عالمگیری دربار کی نقل ہو جاوے گی اور خود لارڈ لٹن کو آکر دیکھنا پڑے گا کہ ایڈیٹروں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ لیکن اگر آپ ہم سے رائے ہی پوچھتے ہیں کہ اول نمبر کا مستحق کون ہے تو بمجبوری کہنا پڑتا ہے کہ ہوں تو میں ہی !! پس دوسرا نمبر آپ تجویز کر لیں۔ ۔ ۔ ۔"[۲]

روزمرہ اور محاورے کا لطف بھی سرسید کی تحریروں میں اکثر و بیشتر ملتا ہے "آپ کو معلوم ہے کرایہ کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے؟ دس روپے روز۔ میں نے کہا مرے۔"[۳] خطیبانہ انداز بھی سوائے علمی تحریروں کے ان کے یہاں اکثر ملتا ہے۔ خصوصاً اصلاحی مضامین میں۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر وہ قوم سے مخاطب ہوتے تھے ساتھ ہی پر اثر نصیحتیں بھی ملتی ہیں مثلاً "پس اے عزیزو اور ہم وطنو! جب تم کسی کے خلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔"[۴] یا "پس انسان کو چاہئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنی مخالفت پر فتح پانے کا ہے۔"[۵]

سرسید کے مضامین میں بھی بے تکلف روزمرہ کا انداز اور محاورہ کا حسن ایک خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ "اے صاحب یہ کون کہتا ہے کہ مہذب قوموں میں کوئی عیب نہیں ہوتا مگر یہ تو دیکھو کہ ان میں ان عیبوں کے ساتھ بہت سی بھلائیاں اور خوبیاں

۱۔ علی گڈھ تحریک ص ۶۰۸

۲۔ مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۲۴ (در حصہ دہم)

۳۔ بحوالہ برگ گل سرسید نمبر ص ۲۵۳-۲۵۲

۴۔ مقالات سرسید مرتبہ عبداللہ خویشگی در مضمون بحث و تکرار ص ۱۹۰

۵۔ " " " " " " " ص ۱۹۴

بھی ہیں۔ ہم ان کے عیبوں کو کیا تکیں جب کہ خود ہم میں عیب ہی عیب بھرے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ چھاج بولے تو بولے چھلنی کیا بولے جس میں نو سو بہتر چھید " ۱ مثل اور محاورے ان کی تحریروں میں بے ساختگی اور زبان دادا کی شستگی نکھار دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ " مضمون کا خاتمہ ایک مذاق کی مثل اور ایک دل لگی کی حکایت پر کریں۔ مثل تو یہ مشہور ہے کہ ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی " ۲ تشبیہ و استعارے سرسید کی تحریروں کی زینت بن کر جا بجا ان میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں اکثر تمثیلی انداز بھی خاص کیفیت اور مزا دیتا ہے مثلاً " نا مہذب ملک کی مثال منڈے پہاڑوں کی سی ہے جہاں بجز پتھر کے ڈھوؤں کے کچھ نظر نہیں آتا " ۳ یا " پس ہم کو اپنے اوپر رحم کرنا چاہئے۔ اور ایسی تعلیم اختیار کرنی چاہئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے اور دل کے سوتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو " ۴

تمثیلی انداز امید کی خوشی ، آدم کی سرگزشت ، اور نادان دیندار اور دانا دنیا پرست میں پورے آب و تاب سے نمایاں ہے۔ ایسی تحریروں میں ایک رومانوی و افسانوی انداز جھلکنے لگتا ہے۔ وہ اپنے مضامین میں اکثر اوقات پر لطف یا نصیحت آمیز حکایتیں بھی درج کرتے ہیں۔ جس سے دلچسپی اور لطف بڑھ جاتا ہے۔ محسن الملک کو ایک خط میں کنویں کی مچھلی اور مینڈک کا قصہ لکھتے ہیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی ۲ نومبر ۱۸۶۶ء میں دربار دہلی اور ایڈیٹران ہندوستانی اخبارات ، کے عنوان میں عالمگیر اور اس کے وزیر کے مباحثہ اور تجربہ کی کہانی درج کرتے ہیں کہ فقراء پاکیزہ نفس و مہذب ہوتے ہیں یا علماء " مصنف داستان تاریخ اردو " کے الفاظ میں " سرسید کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت ، بیان کی سادگی و صفائی ، استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال

۱۔ بحوالہ علی گڈھ تحریک ص ٦١

۲۔ مقالات سرسید حصہ دہم مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۲۳

۳۔ مقالات سرسید مرتبہ عبد اللہ خاں خویشگی در مضمون وحشیانہ نیکی ، ص ۸۵

۴۔ " " " " " " تعلیم و تربیت ۔ ص ۸۰

بے ساختگی بیان کا جوش، طرز ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی حسب موقع متانت و ظرافت اس قدر کثرت صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان کے پہلے کہیں نہ تھی۔" ۱

سرسید کے مضامین میں انشائے لطیف کے نمونے بھی ملتے ہیں جہاں حسن تخیل و تحریر جمع ہو جاتے ہیں۔ "اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک، اے آسمان کے تارے تمہاری خوشنما چمک۔ اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو۔ اے پہاڑ کے عالی شان درختو۔ اے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو۔ تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھوں کو بھایا ہے۔" ۲ انھیں خصوصیتوں کے باعث سرسید اعلیٰ نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ جدید اردو نثر کے جد اولین کہے جاتے ہیں۔ "یہ سرسید ہی تھے جنھوں نے دراصل اردو کو ادبی رنگ دیا جو ان سے پہلے کسی بھی دور میں لکھی گئی اردو کی کتابوں میں ناپید تھا۔" ۳

سرسید کے خطوط میں بھی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اعلیٰ مکتوب نگار کے لئے ضروری ہیں۔ "عظیم شخصیتوں کے خطوط صرف خطوط ہی نہیں ہوتے بلکہ ایک طرح سے تعلیمی، علمی ادبی اور سیاسی دستاویز ہوتے ہیں۔" ۴ ان خطوط کے ذریعہ ہم سرسید کی علمی صلاحیت، ادبی رجحانات، سیاسی نظریات، تہذیبی و اصلاحی سرگرمیوں کا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جہاں کہیں دوستانہ مراسلت ہے وہاں بے تکلفی، شوخی اور خلوص نمایاں ہے۔ جن خطوط میں علمی مباحث ہیں وہ طویل ہیں اور مضمون کی مانند معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط میں سادگی، بے تکلفی، شوخی، طنز، پرخلوص انداز تکلم اور جوشِ جذبات ہر جگہ ملتے ہیں۔ مولوی زین العابدین

۱۔ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری ص ۳۱۵

۲۔ انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق سرسید احمد خان مرتبہ ابوالخیر کشفی ص ۹۶

3. Urdu Prose Under the Influence of Syed Ahmad Khan — By Dr. S.M. Abdullah P. 34

۴۔ بحوالہ بوگ گل سرسید نمبر از خواجہ تہور حسین ص ۲۱۸

کو لکھتے ہیں "کرمی زینو بھیا ابھی تمہارا خط پہونچا۔ ۔ ۔ ۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو برا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا۔ صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو" ۱

خواجہ بہور حسین لکھتے ہیں۔ "سرسید کے خطوط ہندوستانیوں کی بدبختی خصوصاً مسلمانوں کی بداقبالی و بدحالی کا مرثیہ ہیں" ۲ ان کے خطوط میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں۔ لکھتے ہیں "افسوس مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے" ۳ مگر اس کے باوجود ان کے یہاں جوش و ہمت امید و کوشش کے عناصر بھی نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ مشکلات سے مقابلہ، حالات پر غور و خوض اور کچھ کر گذرنے کی خواہش ان کے خطوط میں قنوطیت کے بجائے جوش و ہمت پیدا کر دیتی ہے۔ سرسید کے یہاں ہر جگہ مستقبل کی بھلائی کے لئے حال کی اصلاح اور ترقی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔" ان کی نثر میں لفظی آرائش اور صنائع و بدائع کا التزام تو نہ ہوتا لیکن چونکہ وہ جو کچھ لکھتے خلوص سے پر ہوتا اور نفس مضمون اور خیالات مفید و ضروری ہوتے اس لئے ان کا طرز تحریر کامیاب رہا" ۴

مختصر یہ کہ یہی اوصاف سرسید کی تحریروں کی زینت اور ان کی نثر کا کمال بن گئے۔

۱۔ مکتوبات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی بنام زین العابدین۔ ص ۵۰۱

۲۔ بحوالہ برگ گل سرسید نمبر ص ۲۶۴۔

۳۔ مکتوبات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی مکتوب بنام محسن الملک۔ ص ۸۹۔۹۰

۴۔ موج کوثر از شیخ محمد اکرام۔ ص ۱۰۳

محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں: "سادگی، صفائی، اختصار، زور و مزا یہ پانچ صفتیں ہیں جو نثر میں ہونا چاہئیں۔ جس قدر ان کا وجود نثر میں ہوگا اتنا ہی نثر کا پایہ بلند ہوگا۔ سرسید کی نثر میں ان صفات کا وجود درجۂ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ اس درجہ تک جہاں کی کیفیت کو اعجاز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرسید حقیقت میں نثر نگاری کی جینیس لے کر پیدا ہوئے تھے سرسید کی نثر ایک معیاری تعمیر کی سنگ بنیاد ہے۔ اردو نثر کا انہوں نے ایک ایسا ماڈل پیش کیا ہے جو ہمیشہ ایک علیٰ معیار کی طرح ہر اردو نثر نگار کے سامنے رہے گا۔"۱ اسی طرح مصنف داستان تاریخ اردو لکھتے ہیں: "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے اسلوب نگارش میں فکر و تخیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، متانت و جزالت شوخی و ظرافت ہر رنگ کا حسب موقع جلوہ ہے۔"۲ سرسید کے اوصاف تحریر کو مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اچھی طرح ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔

ادیب ہو یا شاعر، صحافی ہو یا مقالہ نگار سب کے یہاں خوبیوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ سرسید کی تحریریں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ گو سرسید کا شمار ان صفوں میں نہیں ہوتا بلکہ وہ تو جدید اردو ادب کے معمار تھے۔ بحیثیت نثر نگار ان کے یہاں کچھ خامیاں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً الفاظ کی تکرار جیسے میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر ان کا حال دیکھا جاوے تو دانا اور نادان دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق نکلے گا۔ دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بے ہودہ خیال آتے ہیں۔ بے شمار وسوسے دونوں کے دلوں میں اٹھتے ہیں مگر ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳ "کر کر" کا استعمال "میں ہرگز رائے نہیں دیتا کہ آپ قرض کر کر تشریف لاویں۔ تذکیر و تانیث کی الٹ پھیر مثلاً "میں نے بڑی غل مچائی"۔ قدیم اصطلاحیں مثلاً "اصلاح کی جاوے" "پس بعد دیکھنے اس تحریر کے۔ واسطے خرچہ سفر کے" وغیرہ۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں اس طرح کی اصطلاحیں بکثرت رائج تھیں۔ کہیں کہیں بات کو سلجھا کر واضح کرنے

۱۔ برگ گل سرسید نمبر ۵۵-۱۹۵۴ء در مضمون سرسید کا طرز ادا۔ ص ۱۴۴-۱۴۳

۲۔ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری ص ۲۱۲

۳۔ تہذیب الاخلاق یکم شوال ۱۲۸۹ہجری در مضمون سمجھ۔

میں طویل جملے الجھن پیدا کرتے ہیں مثلاً "اگر تقلید کی گرم بازاری کا جیسے کہ آج کل ہے اور آزادانہ مباحثے کی مزاحمت وعدم موجودگی کا نقصان اور بداثر درصورتیکہ تسلیم شدہ مسئلے یا قرارداده رائیں صحیح ہوں اسی قدر ہوتا ہے کہ اس مسئلہ یا ان رایوں کی وجہیں معلوم نہیں ہیں تو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ گو وہ مزاحمت عقل و فہم کے حق میں مضر ہے مگر اخلاق کو تو کچھ اس سے مضرت نہیں پہنچتی۔"۱ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: "ادائے مطلب میں سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حسن بیان کو قربان کر دیتے تھے۔"۲

کہیں کہیں جوش جذبات سے تحریر میں تضحیک کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اور الفاظ میں درشتی کے ساتھ طنز یہ نشتر تیز ہو جاتا ہے۔ مثلاً نورالانوار کے کسی اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں: "بڑا بھاری کفر جو آپ سے اٹھائے نہیں اٹھتا وہ کیا ہے انگریزوں کے ساتھ کھانا سو اول تو آپ ان اصحاب رسول کو کافر بتایئے جنھوں نے بیت المقدس کے گرجے میں عیسائیوں کی دعوت کھائی۔ پھر ان مسلمان فخرالاسلام بادشاہوں کی تکفیر کیجئے جنھوں نے صیدا اور شفیق کے عیسائی امیروں کو اپنے ساتھ کھلایا تھا۔ پھر ان تمام ترکوں پر لعنت کیجئے جو روز مرغیاں چٹ فرماتے ہیں اور خلیفۃ اللہ، ظل اللہ کو جن کا خطبہ مکہ کے اونچے ممبر پر صبح وشام پڑھا جاتا ہے کرسٹان بتایئے جو فرانس اور لندن اور آسٹریلیا کے بادشاہوں کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ رہتے ہیں۔ جب ان سب کی تکفیر سے کچھ کفر بچے تو خیر بنارس اور مرزاپور بھی بھیج دیجئے مگر مجھے تو امید نہیں کہ کچھ بچے۔ کیونکہ کیا وہ لوگ محروم رہ جائیں گے جو بت پرستوں کے پگڑی بدل بھائی بن کر ان کی چھوٹی پوریاں چٹ اور چار حلوائیوں کے مگد کے لڈو غٹ فرمایا کرتے ہیں۔ ان کے لئے بھی تو آخر کچھ حصہ چاہیئے۔"۳

مذہبی مباحث میں جوش جذبہ سے کبھی کبھی ایسے الفاظ ان کے قلم سے نکلتے

۱۔ مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۲۲۸ (حصہ پنجم)

۲۔ سرسید احمد خاں مصنفہ مولوی عبدالحق ص ۵۱

۳۔ تہذیب الاخلاق ۱۵ رجب المرجب ۱۲۹۰ ہجری۔

ہیں۔ جو سوء ادب میں داخل ہیں۔ یہ تیزی و درشتی غالباً ان کے مخالفین کو اور بھی مشتعل کرتی تھی جو ایسی تحریروں کو بے ادبی اور کفر و زندقہ کی دلیل سمجھتے تھے۔ مثلاً "ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم میں خدائے ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزماں محمد رسول خدا کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنائی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآن کو ایسے ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جد امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد، زندیق اور کافر و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں۔" ۱

بے تکلف دوستوں سے بے تکلفی کے انداز میں بھی ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں جو باوجود ان کے خلوص، اور نیک نیتی کے مذہبی اعتبار سے سوءِ ادب سمجھے جائیں گے۔ مثلاً محسن الملک کو لکھتے ہیں۔ "سید امداد علی صاحب کو جو عنایت و شفقت مجھ پر ہے اس کا حال معلوم ہوا خدا ان کو خوش رکھے اور وہ درجہ جو خدائی سے بھی بالا ہو عطا فرمائے"۔ ۲ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔ "سرسید کے مضامین میں تصورات اور معقولات کا غلبہ ہے۔ زندگی کی خوشنما اور دلچسپ تصویریں کم ہیں۔ وہ زندگی کے خیال انگیز اور دلچسپ مناظر کم پیش کرتے ہیں۔ اعمال انسانی اور ان کے مادی فوائد و نقصانات کی فہرست یا ان کی معقول توجیہات پر زور دیتے ہیں۔ وہ ہر چند نیچر کے دلدادہ ہیں استدلال میں اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں مگر نیچر کے وسیع مرغزاروں کی سیر نہیں کراتے ان سب باتوں کے باوجود سرسید اردو کے اولین مضمون نگار ہیں۔" ۳ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ "پنشن لے کر علی گڈھ آنے کے بعد ان کا سارا وقت صبح سے شام تک لکھنے لکھانے میں گذر جاتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے کام نکلتے رہتے تھے مثلاً سیاست، مذہب، جلسے، ایڈریسیں، تقریریں، رپورٹیں،

۱۔ تہذیب الاخلاق یکم محرم الحرام ۱۲۹۰ ہجری در عنوان حال خود و یاران خود۔

۲۔ مکتوبات سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی ص ۱۰۹

۳۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۶۷

روئدادیں، مراسلت وغیرہ۔ یہ سب کچھ وہ خود ہی لکھتے تھے جو شخص اتنی فراوانی سے لکھتا ہو اور نظر ثانی کا بھی سوال نہ ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ اس کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو عبث ہے "۱ اس کے باوجود سرسید کی تحریریں اردو ادب میں اعلیٰ اور مثالی ہیں۔ اس تفصیل سے حسن و قبح کی داستان کو طول دینا مقصود نہیں پھر بھی اس کی وضاحت لازمی تھی۔

سرسید کی تحریروں میں عقلی دلائل کو جذبات پر فوقیت ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات عقلیت و دلالت کی پیچیدگیوں میں حسن تحریر گم ہو جاتا ہے۔ خواہ مذہبی تحریریں ہوں یا تاریخی اخلاقی ہوں یا ادبی ان سب پر مقصدیت حاوی نظر آتی ہے اور بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ ادبی حسن مقصدیت کے بوجھ میں دب گیا ہے۔ یقیناً ادب و افادیت کا امتزاج ادب کو حقیقت سے آشنا کرتا اور زندگی کا حسین ترجمان بناتا ہے۔ پھر بھی مقصدیت کی اتنی شدت کہ یہ ادب پر حاوی نظر آنے لگے ادبی حسن کو مجروح کرتی ہے۔ لیکن سرسید پہلے مصلح تھے پھر کچھ اور۔ لہٰذا ان کے مصلحانہ فکر و عمل کا تقاضا تھا کہ وہ نئے سماج کی تعمیر اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اپنے تمام فکری، علمی اور ادبی حربے استعمال کریں جس سے مفید نتائج برآمد ہوں۔ ان کی یہ خصوصیت یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ تمام فکری، علمی اور ادبی دائرے مغرب کے نئے سانچوں میں ڈھلے تھے۔ چنانچہ سرسید کے اثر سے جس نئے ادب کی تشکیل ہوئی اس کے رجحانات فکر اور طرز و اسلوب پر انگریزی ادب کا خاص اثر تھا۔ سرسید نے ادب کو تصورات کی دنیا سے نکال کر زندگی سے اس کا براہ راست رشتہ جوڑ دیا اور مغرب کے نئے اجزاء سے جدید اردو ادب کی شاندار عمارت تعمیر کی یہی سرسید کا ادبی کارنامہ ہے۔

سرسید نے جو نئی روح اردو ادب میں داخل کی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ یقیناً جدید اردو ادب سرسید کے تازہ ادبی رجحانات کا مرہون منت ہے۔ افادیت و مقصدیت اردو ادب میں سب سے پہلے سرسید نے شامل کی۔ ادب و زندگی کے تعلق کو واضح ہی نہیں بلکہ اس کو مستحکم کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید مصنف اور مصلح قوم دونوں تھے۔ وہ جس طرح بحیثیت مصلح جدید راہ کے روشن چراغ تھے اسی طرح بحیثیت محقق فن، جدید اردو ادب کے معمار بھی تھے۔ خواجہ منور حسین کے الفاظ میں "سرسید کی حیثیت مصلح قوم کی

۱۔ چند ہم عصر مصنفہ مولوی عبدالحق ص ۲۴۵۔

بھی تھی اور نثار کی بھی۔ ۔ ۔ ۔ سرسید کا نصب العین تزئین حیات، پرورش ذہن اور فروغ دین و ایمان تھا۔"۱ ادب و افادیت کا یہ تصور خود سرسید کے الفاظ میں واضح کیا بہتر ہوگا۔ "لٹریچر یعنی علم و ادب اہل زبان کے لئے نہایت وسیع جولان گاہ ہے۔ اس میں وہ ان کی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے اسی کے ذریعہ سے وہ اپنی دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے ابھارتا ہے۔ انھیں لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے اور کبھی رلا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالات کو مٹاتا ہے اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔"۲ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔"زبان میں توانائی اور ہر رنگ میں ڈھل جانے کی صلاحیت پہلے پیدا کی جاتی ہے۔ اور اردو میں یہ صلاحیت سرسید کی دین ہے۔"۳

سرسید سے پہلے کی اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو غزل کو سب سے زیادہ فروغ حاصل تھا۔ مگر غزل کی شاعری حد درجہ تصنع، مبالغہ اور لفظی شوکت کی وجہ سے اپنا اصل جوہر گداز و اثر کھو چکی تھی۔"مقصد یہ تھا کہ ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ ہر وہ بات کہہ دی جائے جو شاعر کو بھلی اور مناسب معلوم ہو۔"۴ قصائد کے ممدوح عام طور پر حکمراں تھے اور شعراء کی معاش دربارداری پر منحصر تھی۔ اس لئے مبالغہ اور تصنع کی زیادتی نے اس صنف کو مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔" ان حالات میں شعراء مجبور تھے کہ اپنے مربیوں اور سرپرستوں کے مذاق کی تسکین کریں جن پر ان کا انحصار تھا۔"۵ ادبی مثنویوں کا سرمایہ عام طور پر عشقیہ داستانوں تک محدود تھا۔ جو بیشتر مافوق الفطرت تذکروں پر مشتمل ہوتی تھیں اور ایک زوال پذیر سماج کی ذہنی تفریح ادبی عیاشی اور دفع الوقتی کا اچھا ذریعہ تھیں۔

۱۔ برگ گل سرسید نمبر۔ ص ۲۶۶

۲۔ مقالات سرسید حصہ دہم مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ص ۱۱۸۔ ۱۱۷

۳۔ فکر و نظر، جنوری ۱۹۶۱ء ص ۹۳

4. The Influence of English Literature on Urdu Literature —— Dr. Abdul Latif P. 20

5. Ibid P. 19

مرثیہ بطور صنف آہستہ آہستہ ترقی کر رہا تھا اور اس کا دائرہ واقعات کربلا کی حد سے بڑھنے لگا تھا اور اس سلسلے میں ہندوستانی معاشرہ کے تمام جذبات کی تصویریں پیش کرتا تھا۔ یہی ایک صنف تھی جس میں بیانیہ شاعری اور نظم کے لوازمات ملتے ہیں۔ اکثر مرثیوں میں مبالغہ اور شوکت الفاظ کے باوجود اثر، درد و گداز ملتا ہے۔ منظر نگاری، فطرت کا بیان، شجاعت و رذالت کی تفصیل بھی پائی جاتی ہے یہ چیزیں قدیم شاعری میں حقیقت اور فطرت کی جھلک تھیں۔ چونکہ یہ طرز صرف اسی موضوع کے لئے مخصوص تھا اور جوشِ عقیدت مندی کے طور پر برتا جاتا تھا اس لئے عام شاعرانہ خصوصیت کے طور پر ان صفتوں کو فروغ نہ تھا۔ شاعری اس طرح روایتی اور رسمی ہوگئی تھی اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ فارسی شاعری کے تخیلات کو اردو کا جامہ پہنایا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردو کے شعراء موضوع کی پابندی سے نہیں بلکہ ردیف و قافیہ کی پابندی سے شاعری کرتے تھے۔" ۱

اس ساری صورت حال کو سرسید نے اصلاح طلب سمجھا اور نیچرل شاعری کی دعوت عام شروع کی اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد کو لکھتے ہیں "میری نہایت قدیم تمنا اس مشاعرہ سے بر آئی۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی خواب امن پہونچی بہت دل خوش ہوا۔ دراصل شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کئے جائیں۔" ۲

تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "حالی کی مثنویوں نے ہمارے دل کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی حب الوطن اور مناظرۂ رحم و انصاف۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درحقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگیٔ الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ بیان میں زبان میں آمد میں ایسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھتی جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ہماری

---

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature — By Dr. S. M. Abdullah P. 20, 21

۲۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۱۳

قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ ہو اور ملٹن و شکسپیر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامین عشقیہ و مضامین خیالیہ اور مضامین واقع و مضامین نیچر میں جو فرق ہے اس کو دل میں بٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جاوے گی اور ضرور وہ دن آئے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا ہی فخر کریں جیسا کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شکسپیر پر ناز کرتے ہیں" ۱

یہی رجحانات ہیں جن کے زیر اثر اور سرسید کی فرمائش پر حالی نے مسدس لکھی، جس نے اردو شاعری میں دھوم مچادی۔ انھیں رجحانات کے تحت حالی نے مقدمہ شعر و شاعری تصنیف کی اور قدیم اردو شاعری پر کڑی نقادانہ نظر ڈالی۔ اردو شاعری میں نیچر کا بیان نظم کا فروغ، حب الوطنی کے ترانے، نصیحت آمیز مثنویاں، تصوراتی محبوب کے بجائے زندگی کی عکاسی، مقصدیت اور سادگی اسی دور سے شروع ہوتے ہیں جو انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں داخل ہو رہی تھیں مگر ان نئے رجحانات کی اشاعت کا سب سے بڑا وسیلہ سرسید کی ذات تھی۔ جنھوں نے روایتی طرز سے الگ جدید راہ نکالی اور اس راہ میں موجد کا درجہ پایا۔

تنقید انگریزی ادب کے اثر سے ہم تک پہنچی لیکن یہ بات بغیر جھجک کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب تک اسے لانے کا وسیلہ سرسید ہی کی ذات تھی۔ اس سے پہلے ہمارے یہاں شعراء کے تذکروں میں ان کے کلام کے ہلکے پھلکے تبصرے ہوتے تھے جن کا انداز ایک تعارفی تحسین کا ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کلام کی خامیوں پر بھی اشارے ہوتے تھے مگر زیادہ تر یہ تذکرہ نگار کی ذاتی رائے پر مبنی ہوتے تھے نہ کہ نقد و نظر کے اصولوں پر۔ چونکہ سرسید کے یہاں مقصدیت کو اول مقام حاصل تھا اور تحقیق کاوش و فکر و نظر کی متقاضی ہوتی تھی، اس کے علاوہ مصلحانہ کاوشیں، خوبیوں اور خامیوں کی تشریح چاہتی تھیں لہذا اکثر علمی و تاریخی مباحث اور مذہبی مسائل میں سرسید کی تحریریں تنقیدی نظریات پیش کرتی تھیں۔ مروجہ رسوم و رواج اور عقائد کی خامیوں اور نقصانات کی نشان دہی کرتے ہوئے بھی وہ ایک نقاد کی مانند فکر و نظر کی جولانیوں سے کام لیتے تھے۔

۱۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۱۱

اس طرح انھوں نے تنقید کے لئے راہ ہموار کر دی۔ ادبی تنقید کے اجزاء بھی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ یہاں پر ایسے ہی چند نمونے مناسب ہوں گے۔ "ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہماری کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں بہت کم اخبار ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ و سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔"[1] اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہئے تھا۔ نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودت طبع و تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھی۔ دوسرے دوسرے قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہ تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانے نے اس کو بھی ریفارم کیا اور اہل پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا۔ ہمیشہ یاد رہے گا۔"[2] معین احسن جذبی لکھتے ہیں "نظم بھی

۱۔ مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، حصہ دہم ص ۱۱۴

۲۔ مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی حصہ دہم ص ۱۲۰

ان کی (سرسید کی) کچھ کم احسان مند نہیں، مولانا محمد حسین آزاد اگرچہ نئی اور نیچرل شاعری کے بانی ہیں لیکن اس کے رخ کو سادگی اور افادیت کی طرف موڑنے میں سرسید کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔"۱

سرسید کے تمام مضامین اور تحقیقی تصانیف میں تنقیدی نظریات بہ افراط ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نقد و نظر ایک مستقل فن کی حیثیت سے ان کے یہاں نہیں مگر تنقیدی شعور کی پہلی کرن اردو ادب کے افق پر یہیں سے ابھرتی ہے۔ سرسید کے پہلے تنقید ہمارے یہاں تقریباً ناپید تھی۔ تنقیدی صلاحیتیں کسی کے کلام کو ذاتی طور پر پسند یا ناپسند کرنے تک محدود تھیں۔ اصول و نظریات کی بنیادوں پر تنقید کا رواج مغرب کے اثر سے رائج ہوا۔ ہمارے ادب میں اس کو رواج دینے میں سرسید کا بڑا ہاتھ تھا۔ طریقۂ زندگی، رسم و رواج، رسمی عقائد، علمی تحقیقی، قدیم طرز فکر اور ادبی رجحانات پر سرسید کے یہاں اتنی کثرت سے تنقید شامل ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہمارے یہاں ایک ادبی فن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اس لئے سرسید کو اولین نقاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اردو ادب میں نقد و نظر کی روایتیں یہیں سے ابھرتی اور اہم مقام حاصل کرنے لگتی ہیں۔

سرسید نے اپنی تمام علمی، تاریخی اور مذہبی تصانیف میں تحقیق و دلائل کو بنیادی حیثیت دے کر سنجیدگی اور وزن صرف اپنی تحریروں ہی میں شامل نہیں کیا بلکہ اس سے اردو ادب میں سنجیدہ، دقیق اور تحقیق طلب علمی و ادبی مسائل کی راہ کھول دی۔ آثار الصنادید، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام اور ان کے بہت سے مذہبی و علمی مضامین اس بات پر دلالت کرتے ہیں حالانکہ سرسید سے پہلے زیادہ تر خیالی داستانیں اور مافوق الفطرت باتیں ہی اردو نثر کا عزیز سرمایہ تھیں۔ ان کے لئے اردو ادب میں کوئی ایسی مثال نہ تھی جس پر وہ علمی و تحقیقی ادب کی راہ متعین کر سکتے۔ یہ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بیدار مغزی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے مغرب کے علمی و ادبی جوہر سمیٹ کر انھیں ہمارے ادب کا محکم جزو بنا دیا۔ لہٰذا ان کی تمام مذہبی کتابیں اور علمی و ادبی تحریریں تحقیقی بنیادوں پر مبنی ہیں۔

مذہبی تحریروں میں صرف روایتوں اور نقلوں سے کام لیا جاتا تھا۔ سرسید نے مذہب کی توضیح و تشریح کے لئے تقلید کے بجائے تحقیق کو اپنا رفیق کار بنایا اور ایسی تحریروں میں، جذباتی راہ سے ہٹ کر عقل کی پیروی اختیار کی۔ انھوں نے نئے علم الکلام کی بنیاد ڈال کرنے

۱۔ حالی کا سیاسی شعور از معین احسن جذبی، ص ۸۱

مذہبی رجحانات کے لئے وہ فضا تیار کردی جو زمانے کے نئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اور مادیت کے اٹھائے ہوئے مسائل کا عقلی جواب پیش کرنے کے قابل ہو۔ مذہبیات میں ٹھوس تاریخی دلائل کو انھیں کے ذریعہ فروغ ہوا۔ روایات ومنقولات کے بجائے سرسید مذہبی تحریروں میں تاریخی و دیگر دلائل پیش کرنے لگے۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ تصنیف علم الکلام کے دوران ایک دن انھوں نے شبلی کو محوخیال ٹہلتا ہوا پایا اور وجہ پوچھنے پر بتایا کہ وہ وحی اور الہام کے متعلق لکھنے والے ہیں لیکن سرسید نے اس مضمون کو ایسا پانی کردیا ہے کہ وہ سوچ رہے ہیں کہ اب کس ڈھنگ سے لکھیں۔“ ۱ تاریخ سرسید کا عزیز موضوع تھا۔ جب بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے تقاضوں کو پورا کیا یعنی تحقیق نظری، غیر جانبداری، سچائی اور تلاش وجستجو سے کام لیا۔ جب کہ ان سے پہلے تاریخ میں صرف سرسری واقعہ نگاری ہی کافی سمجھی جاتی تھی اور اجتماعیت کے اصول ضروری نہیں ہوتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری میں جزوی تفصیلات سے خاص دلچسپی لیتے تھے اور انھیں جزوی تفصیلات سے مکمل تاریخی حقائق نمایاں کردیتے تھے۔

سرسید ہی نے سیر وسوانح کو تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی اجزاء اور نئے اصولوں سے روشناس کیا۔ خطبات احمدیہ میں اجزائے سیرت کی تلاش، تحقیق وتنقید اس کا خاص وصف بن جاتے ہیں۔ سب سے پہلے سرسید ہی نے سیرت کے اصول اور مبادی پر نظر ڈالی یہ بھی اردو میں ان کی اولیات میں سے ہے۔“ ۲ مضمون نگاری کی سرسید نے صرف ابتداء ہی نہیں کی بلکہ اسے آسمان ادب پر پہنچا دیا جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔“ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی یہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیا کے خیالات کو نہ ملائے گی جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہوگئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے اور اڈیسن کی سی ہوجاویں گی۔“ ۳ سرسید کے ان ہی کارناموں کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔“ سرسید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصر ترکیبی کی فہرست تیار کی جائے

۱۔ چند ہم عصر مصنفہ مولوی عبدالحق ص ۲۴۲

۲۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فنی وفکری جائزہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۴۴

۳۔ مقالات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی حصہ دہم ۱۰۔ ص۔ ۱۱۵ ۔ ۱۱۶

تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہوں گے۔ مادیت، عقلیت، اجتماعیت، حقائق نگاری، سرسید کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت انھیں بنیادوں پر قائم ہے۔ سرسید کے پیدا کردہ ادبی سرمائے میں مندرجہ بالا فکری و ادبی عناصر تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔" ۱

طنز و مزاح کے عنصر مصنف کے شخصی وصف کی حیثیت سے کچھ نہ کچھ پہلے بھی ملتے تھے سرسید سے پہلے غالب کی نثر میں ظرافت کا جز بہت شوخ اور نمایاں ہے مگر یہ ان کی ذاتی خصوصیت اور شخصی تصورات کے دائرے میں تھی۔ طنز و مزاح کا ہمہ گیر تصور بعد کی چیز ہے۔ زندگی و سماج پر طنزیہ تنقیدیں، وقتی مسائل پر مزاحیہ چوٹیں، اردو ادب میں سرسید کے زمانے کی دین ہیں۔ مزاح نگاری میں اجتماعی تصورات سرسید کے اثر بلکہ سرسید کی مخالفت کی شدید ترین فضا کی پیداوار کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی مخالفت سے طنز و مزاح کو نیا رخ ملا۔ اخبار اودھ پنچ اور اکبر الہ آبادی کی شاعری خصوصی طور پر اس کہانی کی کڑیاں ہیں، جنھیں ایسی مزاح نگاری کا حرف اول کہا جاسکتا ہے۔ اودھ پنچ کے طنز و مزاح میں کہاں تک رجعت پسندی تھی اور کہاں تک عمق نگاری اس سے بحث نہیں۔ مگر اس دور کا طنز و مزاح اجتماعیت، عقلیت اور مقصدیت کو اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ اسی وجہ سے ادب میں اس کا وزن و وقار پیدا ہوگیا۔ سرسید کی تحریروں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ طنز کے لطیف تیر و نشتر میں مقصدیت ایک معیار قائم کر دیتی ہے۔ سید محمد نصرت علی کو مسلمانوں کی غفلت کے بارے میں لکھتے ہیں "ان کا حال تو شتر مرغ کا سا ہے۔ اگر امور دنیاوی پر متوجہ ہونے کو کہو تو مذہب کا عذر پیش کرتے ہیں اور جب مذہبی امور پر توجہ کرنے کو کہو تو دنیوی امور سے فرصت نہیں بتاتے۔" ۲ طنز و مزاح اب صرف جولانیٔ طبع نہیں بلکہ افادی تصورات کا حامل بن گیا۔ سرسید کے ادبی رجحانات مزاح نگاری پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے۔ لہٰذا بالواسطہ یہ بھی سرسید کی ذات کا فیضان کہی جاسکتی ہے۔

اردو زبان میں صحافت انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ سرسید

۱۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۲۳

۲۔ بحوالہ برگ گل سرسید نمبر ص ۲۵۳ و ۲۵۴،

مکتوبات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی خط بنام سید محمد نصرت علی ص ۲۲۴

کا اولین صحافتی تجربہ سید الاخبار ۱۸۳۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اخبار سرسید کے بھائی سید محمد نکالا کرتے تھے جس میں سرسید بھی مضمون لکھا کرتے تھے بعد کے زمانوں میں اخبار سائنٹیفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق سرسید کے صحافتی کارنامے ہیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی جو بعد کو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کہلایا سرسید کی سیاسی و علمی صحافت کا آئینہ دار ہے اور تہذیب الاخلاق خالص ادبی صحافت کا بہترین نمونہ ہے۔ سرسید کی صحافت میں علمی و ادبی عناصر بہت زیادہ ہیں جس میں مصلحانہ کاوشیں اور فکر و نظر کی جدتیں شدت سے جاری و ساری نظر آتی ہیں۔ سیاست ان کی صحافت میں دوسرے درجہ پر ہے۔ مگر سرسید کے اخبار میں خبروں اور واقعات و معاملات پر بے لاگ تبصرے ان کی عمق نگاہی اور وسیع معلومات کو ظاہر کرتے ہیں۔ انھوں نے خبروں کی اشاعت میں ہمیشہ صحت کا خیال رکھا۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں خبریں زیادہ تر انگریزی کے مستند اخباروں سے لی جاتی تھیں۔ معلوماتی خبریں خاص طور سے شایع کرتے۔ سیاسی تبصروں میں مخالفانہ جذبات کی حدت کے بجائے اصول و نظریات کی صحت سے کام لیتے۔" واقعات پر بحث اور چھان بین اور جذبات سے الگ ہو کر عقلی توجیہہ یہ بات سرسید کے بعد بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔" ۱

سرسید کو اخبار کی طباعت میں صفائی اور حسن کا خاص خیال رہتا تھا۔ مگر سرسید کی صحافت میں ان کی علمی و ادبی کاوشوں کو زیادہ دخل تھا۔ اس کے ذریعہ وہ ملک میں علمی و ادبی فضا اور ذہنی بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ سرسید نے صحافت میں علم و ادب کو اولین درجہ دیا اور ادب کے فروغ میں خصوصی حصہ لیا۔ تہذیب الاخلاق اس کی عینی مثال ہے۔ " سرسید کی صحافت کی اہم بات علم اور صحافت کا پیوند ہے" ۲ سرسید کی ادبی صحافت کا کمال تہذیب الاخلاق کے اوراق میں نمایاں اور اس کی ہر دل عزیزی میں پنہاں ہے۔ اردو ادب پر سرسید کے زبردست اثر کی حقیقت ان کی کامیاب ادبی صحافت میں پوشیدہ ہے۔ جدید اردو ادب کی تمام تر ترقی

۱۔ سرسید کا اثر اردو ادبیات پر از ڈاکٹر سید عبداللہ در علی گڈھ تحریک ص ۳۰۵

۲۔ " " " " " " " " " " ص ۳۰۴

اسی کی مرہون منت ہے۔ بقول مہدی افادی "نئی نسل تمامتر تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے"۔ ۱ اس میں شک نہیں کہ سرسید کی ذات سے ایک عظیم ادبی و ذہنی انقلاب پیدا ہو گیا۔

یہاں پر سرسید کی شاعری کے متعلق کچھ اشارے بھی ضروری ہیں۔ سرسید شاعر نہ تھے اور نہ ان کا شمار شعراء کی صف میں ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کا تذکرہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح نثر کے معمار تھے اسی طرح جدید شاعری کے بانی بھی تھے۔ اپنی شاعرانہ سحر بیانی سے نہیں بلکہ جدید نظریات شاعری کی بناء ڈال کر اور حسن و عشق کی شاعرانہ اصطلاحوں کو مقصد و حقیقت و زندگی سے لذت آشنا کر دیا پھر بھی ابتداء ہی سے ان میں مذاق شعر و سخن ضرور موجود تھا۔ جوانی کے زمانے میں رواج کے مطابق شاعری شروع کی تھی اور آہی تخلص کرتے تھے۔ مگر جلد ہی سرکاری ملازمت کے باعث دہلی اور اس کی قدیم محفلوں سے الگ ہونا پڑا۔ ملازمت کے فرائض دیگر علمی مشاغل اور قومی اصلاح کی مشغولیت اس میدان میں سدراہ ہوئے۔ غالباً انھوں نے شاعری کی طرف اس لئے بھی توجہ نہ کی کہ وہ شاعری اور اس کے حال کو لائق اصلاح تصور کرتے تھے۔ کبھی کبھی چند اشعار کہے ہیں جو زیادہ تر فارسی میں۔ اردو کے اشعار نایاب ہیں۔ لالہ سری رام خمخانۂ جاوید جلد اول میں لکھتے ہیں۔ "تذکرۃ الشعراء میں سرسید کا ذکر کرنا لوگوں کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ . . . ان کے اشعار کی ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہو سکی جس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید نے جو کچھ لکھا نہ تو اس کو جمع کیا اور نہ اس کے چھپوانے کا شوق ہوا۔ ہم نے اس تذکرہ میں تبرکاً شاعروں کے زمرے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک شعر ان کا دستیاب ہوا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:۔

ہزار حیف کہ عمر اپنی مفت صرف ہوئی
نہ کچھ خدا کی عبادت کی نے بتوں کی چاہ ۲

بقول شبلی اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی ان کی یادگار ہے جس کا ایک مصرعہ ہے۔

نام میرا تھا کام ان کا تھا ۳

۱۔ بحوالہ علی گڈھ تحریک ص ۳۱
۲۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۰۹
۳۔ مقالات شبلی حصہ دوم ص ۵۸

سرسید نے کالج کی دو عمارتوں ایک کنویں اور ایک کمرہ کی تاریخ بھی نکالی تھی کمرے کی تاریخ یہ ہے

بنائے یادگار برکت علی خاں بہادر

۱۸۹۴

سرسید کی قبر کے کتبہ پر بھی خود انھیں کا شعر کندہ ہے۔

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور

ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدست[۱]

قیام بھوپال کے دوران جب بیگم بھوپال نے انھیں ایک قیمتی انگوٹھی عنایت کی تو سرسید نے فارسی میں چند مدحیہ اشعار بطور قصیدہ و تشکر پیش کئے تھے۔ جس کا ایک شعر درج کرتی ہوں۔

اے شاہ جہاں باد جہاں شب مرامت

دارائے جہاں یا ورو افلاک غلامت[۲]

یہ انگوٹھی سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کی نذر کر دی۔ اسی طرح اپنی تفسیر کے سلسلے میں چند فارسی اشعار کہے تھے جس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

خدا دادم دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم

ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم

ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم[۳]

۱۸۹۴ء میں علی گڈھ نمائش کے موقع پر سرسید نے جو ایک قومی ڈرامہ اسٹیج کیا تھا اس میں حافظ کی غزل پڑھی تھی اور آٹھویں شعر کے بعد آپ نے یہ دو شعر اضافہ کئے تھے۔

۱۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۰۱

۲۔ بحوالہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۵۱ء ص ۲۱

۳۔ " " " " " ص ۲۲

کیست آن سرو سہی کہ کاندر سرش
یافتم دین و دل و آرام را
قوم ما اے قوم ماکز بہر تو
دادہ ام بر باد ننگ و نام را!

راہ سنت در بدعت لکھتے ہیں تو ابتدا ایک مناجات سے کرتے ہیں جس میں اکیس اشعار ہیں اس مناجات کے دو اشعار نمونتاً درج ذیل ہیں۔

الٰہی تو غفور اور میں گنہ گار
الٰہی تو کریم اور میں گرفتار
الٰہی تو قوی اور ناتوان میں
خداوندا کہاں تو اور کہاں میں (نوٹ) ۲

سرسید کی شاعری کا یہ تذکرہ یہاں مع چند اشعار ضمناً کیا گیا ہے۔ ان کے اشعار زیادہ تر فارسی کے ہیں۔ شاید اردو شاعری کی روایتی روش سے گریز کی خاطر ایسا کیا تھا۔ دراصل سرسید کی شاعری نہیں بلکہ شاعری کے متعلق ان کے جدید رجحانات کا مقام اہم ہے جنھوں نے اردو شاعری پر خاص اثر کیا۔

سرسید کے علمی و ادبی رجحانات صرف ان کی تحریروں کی زینت نہیں بنے بلکہ انھوں نے اپنے ہم عصروں پر اور ایک پورے دور بلکہ پوری نسل پہ نئے صحت مند ادبی رجحانات کا اثر قائم و دائم کر دیا۔ بقول رام بابو سکسینہ "دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی پہچان یہی ہے کہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنا ایسا جوش و خروش اور صداقت اور راست بازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کے حواریوں کا تھا"۔ ۳ ان کا نمایاں اثر ان کے ہم عصروں پر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حالی، شبلی، محسن الملک، ذکاء اللہ نذیر احمد اور چراغ علی سرسید کے خاص ساتھیوں میں سے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک نے ادبی

۱۔ نوٹ:۔ بحوالہ ماہ نو کراچی مارچ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۱۔۲۲
۲۔ یہ پوری نظم مقالات سرسید حصہ پنجم میں مولوی اسمٰعیل پانی پتی نے صفحہ ۳۵۷ اور ۳۵۸ پر درج کی ہے۔
۳۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۱۳۳

کاوشوں میں ان کے رجحانات و خیالات کا گہرا اثر لیا۔ ان جدید رجحانات کو ادب کے مختلف شعبوں کی زینت بنادیا جو اس وقت تک اجنبی اور نئے تھے۔ ان حضرات نے فلسفہ، سیرت مذہب، علم الکلام، سوانح تاریخ، تنقید، صحافت اور مضمون نگاری کو اردو ادب میں جدت نظری کی بڑی آب و تاب کے ساتھ شامل کیا۔ مگر ان سب کی کاوشیں سرسید کے جدید نظریات کا صاف پر تو معلوم ہوتی ہیں۔ مولوی چراغ علی، مولوی نذیر احمد اور محسن الملک سرسید کے بعض اعتقادات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے مذہبی خیالات سے بے حد متاثر تھے۔ مولوی چراغ علی کی تمام مذہبی تحریریں سرسید کے مذہبی نظریات کا عکس ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر انگلش میں ہیں اور کچھ اردو میں بھی۔ یہی حال محسن الملک کا ہے وہ ایک مضمون نگار کی حیثیت سے سرسید کے نقش قدم پر چلنے والوں میں سے ہیں۔ یہ بھی سرسید کے بعض مذہبی عقائد سے اختلاف رکھتے تھے۔ پھر بھی بیشتر نظریات اور ادبی تحریروں میں وہ پورے طور پر سرسید کے مقلد ہیں۔ انداز تحریر اور خیالات ہر دو میں وہ پیرو خاص نظر آتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد بھی سرسید سے بہت متاثر ہیں حالانکہ بعض مذہبی عقائد میں ان سے منحرف ہیں۔ ان کی تفسیر القرآن اور الحقوق و فرائض ان کے مذہبی نظریات کی صاف وضاحت کرتی ہیں۔ انھوں نے دلچسپ اصلاحی ناول لکھ کر ناولوں کو پہلی بار اردو ادب میں جگہ دی۔ ان کی یہ ابتدائی کوششیں ناولوں کے معیار پر پوری نہ اترتی ہوں تب بھی ابتدائی حیثیت سے ادب میں ان کا شمول ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں جو مقصدیت اور اصلاحی جذبہ ہے وہ سرسید ہی کی دین ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے اپنی زود قلمی سے علم و ادب کو پورے طور پر نوازا تاریخ اور ریاضی میں تصانیف کیں۔ سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد اپنے ترجموں سے پورے کئے ان سب میں شبلی ہی تھے جنھوں نے سرسید کا گہرا اثر لیتے ہوئے بھی ان کے مذہبی رجحانات سے انحراف کیا۔ اور اپنی ایک نئی راہ بنائی جو ان کی اپنی خصوصیت کو واضح کرتی ہے۔ سرسید میں اور ان میں فرق یہ تھا کہ سرسید مذہبی خیالات کو جدید خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ شبلی جدید مادی اصولوں کو مذہبی زاویوں میں جانے کی کوشش کرتے تھے۔ سرسید عقلیت کی ترازو سے مذہب و عقائد کو پرکھتے تھے اور شبلی مذہب کی

روشنی میں مادیت کی وضاحت کرتے اور عقل کو جذبۂ عقیدت مندی کے تحت نباہنے کی کوشش کرتے۔ شبلی کا خیال تھا کہ سرسید اسلامی تاریخ اور اس کے پس منظر سے قطعی ناواقف ہیں "۱

بہرحال اس اختلاف اور نئے مکتب کی ابتداء کے باوجود انھوں نے اردو ادب میں مذہبیات، سیرت وسوانح اور تنقید کو جس نئے ڈھنگ سے سنوارا اور نکھارا وہ سرسید ہی کے اثر سے۔ دونوں کی راہیں دو ہیں مگر منزل اور مقصد ایک۔ حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ علی گڈھ کالج کی مدرسی کے زمانے میں شبلی سرسید کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ ان کا کتب خانہ تمام مستند تاریخوں اور مغربی و مشرقی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ سرسید نے شبلی کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اس سے مستفید ہوں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس نے شبلی کو علامہ شبلی بنادیا۔ وہ خود فرماتے ہیں "یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ تعلیمی یا علمی قرار پاسکتا ہے تو اس کا آغاز اس کی نشو و نما اور اس کی ترقی اس کی نمود اس کا امتیاز جو کچھ ہو وہ اس کالج سے ہوا " ۲

اس میں شک نہیں کہ شبلی کو اگر سرسید کا فیض صحبت حاصل نہ ہوتا تو وہ علامہ شبلی نہیں صرف مولوی شبلی ہوتے اور شعر العجم، سیرت النبی اور الفاروق جیسی اعلیٰ تصانیف اردو ادب کی زینت نہ بن پاتیں۔ حالی کی شاعری اور ان کے رجحانات قدیم شاعری کے متعلق ان کے خیالات اور ان کی تصنیف کردہ سوانح عمریوں نے اردو ادب پر جو زبردست اثر ڈالا وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن ان کا ماخذ سرسید کا زبردست تاثر ہے۔ مختصر یہ کہ سرسید اور ان کے ہم عصروں نے اردو ادب کو نئی نثر سے آراستہ کیا۔ نئی شاعری کو اس کی زینت بنایا۔ اب اردو نثر داستانوں اور تذکروں کی حدود سے باہر تحقیق و تنقید اور تاریخ و ادب کے وسیع میدانوں میں ٹھوس علمی کاوشوں سے کام لیتے ہوئے وسیع النظری جدت فکری اور رنگا رنگ اسلوب کا عظیم سرمایہ اپنے اندر سمیٹ رہی تھی۔ ادبی صحافت

---

1. The Spirit And Substance of Urdu Prose Under The Influence of Sir Syed Ahmad Khan
— By Dr S.M. Abdullah P.55

۲۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۲۵۵

علم و ادب کا بلند معیار قائم کر رہی تھی اور جدید شاعری نظم اور بیانیہ شاعری کو فروغ دے رہی تھی۔ غرض سرسید جس کشتی ادب کے ناخدا تھے یہ سب حضرات اس کے مسافر۔

سرسید سے صرف وہ ادبی شخصیتیں ہی متاثر نہیں ہوئیں جن کا ان سے گہرا اور دوستانہ تعلق تھا بلکہ وہ نئے علمی ادارے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچے جن کے ادبی کارنامے اردو زبان و ادب کے لئے باعث فخر ہیں۔ سائنٹفک سوسائٹی سرسید کے علمی و ادبی ذوق کی اہم یادگار ہے۔ سوسائٹی کے ماہوار جلسوں میں تہذیب، رسم و رواج، مذہب، اخلاق، علم تاریخ وغیرہ مختلف موضوعات پر مفید لکچر ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اس نوعیت کی یہ پہلی تنظیم تھی جس کے ممبران میں ہر مذہب و ملت کے ہندوستانی ——— برابر کے شریک تھے۔ اس سوسائٹی کے اولین (۲۳۷) دوسو سنتیس ممبران میں سے (۴۴) چوالیس انگریز (۸۳) تراسی ہندو اور (۱۱۰) ایک سو دس مسلمان تھے ا سرسید نے اس سوسائٹی کے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کو مغربی نظریات، ادر علمی و ادبی کاوشوں کے وسیلے سے مستفید کرنے کی کوشش کی۔ اس سوسائٹی کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں "جب تک ہمارے ہم وطن اپنے علم کے موجودہ ذخیرے میں اور کچھ نہ بڑھادیں گے . . . . . ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی توقع نہیں ہوسکتی، پس آؤ ہم مستعد ہوں اور کوشش کریں اور قوموں کے مختلف فنون اور علوم کے لینے اور ان کو بخوبی حاصل کرنے سے اپنے علم کو بڑھاویں . . ."۲

اس سوسائٹی کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ مغربی علوم و فنون کو ایسی زبان میں ترجمہ کریں جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہو تاکہ عام ہندوستانی ان علوم سے مستفید ہوسکیں۔ اس وقت تک اردو ہندوستان کی لینگوا فرینکا تھی اور سرسید نے اپنے مقصد کے لئے اسی زبان کا انتخاب کیا۔ دوسرے یہ کہ ایشیا کے قدیم مصنفین کی کمیاب

۱۔ رسالہ سائنٹفک سوسائٹی نشاۃ ثانیہ بموقع یوم آزادی ۱۵ راگست ۱۹۶۹ء۔ ص ۲۳ تا ۳۰۔ ان ناموں کی فہرست درج ہے۔

۲۔ رسالہ ا سائنٹفک سوسائٹی نشاۃ ثانیہ بموقع یوم آزادی ۱۵ راگست ۱۹۶۹ء ص ۷، ۸ در التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند از سرسید احمد

اور نفیس کتابوں کی جستجو اور ان کا مہیا کرنا۔ تیسرے یہ کہ ایسا میگزین یا گزٹ شایع کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی مقصود ہو۔ سوسائٹی کے قانون میں درج تھا کہ اس کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔" ۱ چنانچہ یہ سوسائٹی اور اس کا اخبار جو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہے سرسید کی مسلسل علمی و ادبی جد و جہد کا میدان رہے۔ وہ اپنے آخر دم تک اس کی ترویج و ترقی میں کوشاں رہے۔ راجہ جے کشن داس ۶ جون ۱۸۶۶ء کی تقریر میں اس کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں "یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کوئی سہل طریقہ علوم و فنون مروجہ یورپ کے حاصل ہونے کا سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اب جو یہ تدبیر یعنی تقرر سائنٹی فک سوسائٹی کا سید احمد خاں نے اپنی عالی ہمتی سے محض اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لئے کیا ہے یہ نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ اس میں صرف تھوڑا سا وقت صرف کرنے سے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے جمیع ہم وطنوں کو نہایت عمدہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔" ۲

سرسید کو ہمیشہ سوسائٹی اور اس کی علمی مصروفیات کی دھن اور لگن رہتی تھی اس کے ذریعہ کثیر تعداد میں مفید علمی و درسی کتابوں کے تراجم اردو میں کئے گئے۔ (فٹ نوٹ نمبر ۳) ۳ سرسید جب انگلستان کے لئے روانہ ہوئے تو بھی انہیں سوسائٹی کی فکر لگی رہی۔ چنانچہ محسن الملک کو لکھتے ہیں۔ "مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کو باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف متوجہ ہوں اور سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں۔" ۴ غرض اس سوسائٹی کے ذریعہ سرسید پورے پینتیس سال تک علمی و ادبی خدمات میں منہمک رہے۔ اس طرح علوم مغربی سے روشناسی کے علاوہ انگریزی ادب کے اثرات و رجحانات سے مانوسیت پیدا کی۔ بقول حالی "پینتیس سال کے عرصہ

۱۔ سرسید احمد خاں مصنفہ مولوی عبدالحق ص ۱۴۱-۱۴۲

۲۔ رسالہ سائنٹفک سوسائٹی نشاۃ ثانیہ بہ موقع یوم آزادی ۱۹۶۹ء ص ۲ و ۳

۳۔ (دیکھیں تفصیلی نٹ نوٹ نمبر ۳ باب پنجم) ص ۳۲۱

۴۔ مکتوبات سرسید مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ص ۲۴

میں جتنی سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم ہوئیں اور چلیں وہ اسی کے اثر سے نیز اس کے اخبار نے تمام اخباروں کا رنگ بدل دیا۔"۱

۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام سرسید کی وہ کوشش تھی جس کا وجود و فائدہ کسی علمی ادارے سے کم نہیں۔ اس کے سالانہ اجلاس نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر غور و خوض کرنے کی خو ڈالی۔ مفید اور تیز تر ذرائع تعلیم کے سوچنے پر متوجہ کیا۔ علی گڈھ کالج کے لئے میدان ہموار کیا۔ انگریزی تعلیم کی رغبت دلائی اور اجتماعی فکر کا میدان پیدا کیا۔ کانفرنس نے وقتاً فوقتاً بہت سی مفید تجاویز منظور کیں۔ مثلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا۔ تمام شہروں اور قصبوں میں مقاصد کانفرنس کی تائید میں کمیٹیاں بنانا۔ تعلیم نسواں کے لئے کوشش اور مدرسے جاری کرنا۔ یورپ کے مورخین کے غلط الزاموں کی تردید جو اسلام یا مسلمانوں پر لگائے ہیں اور اس کے متعلق رسائل لکھنا۔ مسلمان بادشاہوں کے قدیم فرامین جمع کر کے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے چھپوانا۔ اردو میں اخلاقی کتابیں اور رسالے لکھا جانا جو لڑکوں کی تعلیم میں کام آسکیں۔ ان قدیم اور مستند کتابوں کا جو کمیاب ہیں پتہ لگانا اور بہم پہنچانا۔ وغیرہ۔ ان تجاویز پر کہاں تک عمل درآمد ہوا اس سے بحث نہیں مگر اس کانفرنس نے یقیناً مسلمانوں میں تعلیمی رجحان، حال کے مسائل پر توجہ اور مستقبل کی فکر پیدا کر دی۔ اسی کانفرنس کے ذریعہ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن نے ابتدا سے اب تک اردو ادب کی جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں وہ پوشیدہ نہیں۔ انجمن ترقی اردو کے دامن سے اردو ادب کے قابل قدر علمی و ادبی و تحقیقی کارنامے وابستہ ہیں، جو آج ہمارے ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ شبلی کے ذوق علم کی پیداوار ہے۔ اس ادارے نے نئے طرز پر تاریخی و مذہبی تحقیق میں جو خدمات انجام دیں ان کا سہرا شبلی کے سر ہے۔ مگر شبلی کا ذوق نظر، ذہنی جدت اور تحقیقی جوش سرسید ہی کے وسیع علمی و ادبی تاثرات سے وابستہ ہے۔

یہ سرسید ہی کی پیدا کردہ علمی و ادبی فضا تھی جس نے اردو ادب کے فروغ د

۱۔ حیات جاوید حصہ دوم ص ۲۴۴ (پہلا ایڈیشن ۱۹۰۱ء)

ترقی میں زبردست کارنامے انجام دئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اسی روشنی سے روشن کیا ہوا ایک نیا چراغ تھا۔ اردو زبان کے ذریعہ تعلیم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ سرسید کی ورنیکولر تعلیم کی اسکیم اس وسیع حد تک تو نہیں پوری ہوئی جیسا کہ وہ چاہتے تھے یعنی ایک کل ہند زبان کی حیثیت سے اس میں تعلیم دی جاتی جس سے Masses کی تعلیم اور عام تعلیمی بیداری پھیلتی۔ مگر قدرے محدود صورت میں اسے ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد عثمانیہ یونیورسٹی نے پورا کیا۔ دارالترجمہ کے ذریعہ اردو میں بیش بہا اضافے ہوئے۔ اس سلسلے میں سرسید کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علمی فضلا سے معمور، ذوق ادب سے سرشار وہ اذہان پیدا کر دئے جنھوں نے نئی نظر اور نئے ذہن کے ساتھ ہر چہار طرف ادبی ترقیوں کے دریچے کھول دئے۔ اردو ادب کی تمام علمی و ادبی ترقیاں اسی تازگی اور بالیدگی کی رہین منت ہیں۔ سرسید کے لگائے ہوئے اس پودے سے جس کا حسن نئے ذہن، مغربی تعلیم اور انگریزی ادب کے زبردست اثر و امتزاج سے نکھارا گیا تھا۔ اس پودے میں لاتعداد رنگارنگ شگوفے پھوٹ نکلے۔ ان تمام علمی و ادبی کو جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے اور ان تمام جدید ادبی رجحانات کو جو اس وقت اور اس کے بعد ظہور میں آئے ہم انھیں نوشگفتہ کلیوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گویا سرسید کی ذات ہی ان تمام ادبی سرچشموں کا مخزن تھی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سرسید کی جستجو و چراغ علی گڈھ تحریک نے اردو کو کیا دیا۔ اگر صرف ایک جملہ میں اس مفہوم کو ادا کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تحریک نے بانئی تحریک کی جدت نظری، ذوق ادبی اور بیدار مغزی کو عام اذہان میں منتقل کر دیا۔ سرسید نے جو نئی روشنی دکھائی تھی اس سے بے شمار چراغ روشن کر کے اردو ادب کی ایک نئی دنیا آباد کر دی۔" سرسید کے ادبی کارنامے، تہذیب الاخلاق اور اس کی جاندار نثر، علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث و مباحثے، ڈاکٹر نذیر احمد کے ناول اور لکچروں کے مجموعے، خواجہ الطاف حسین حالی کی شاعری اور تنقیدی بصیرت محسن الملک، ذکاءاللہ، چراغ علی، وقار الملک، سید علی بلگرامی کے ادبی کارنامے، تحریک کی مخالفت کے باوجود شبلی کے ادبی اور علمی شاہکار اور ان سب سے بڑھ کر وہ زندہ، متحرک اور ترقی پذیر فضا جو ان بزرگوں کے کارناموں سے وجود میں آئی

یہ ساری چیزیں علیگڈھ تحریک کے دفترِ عمل میں لکھی جائیں گی،، ۱ ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ تحریک کا مرکز و محور تھا۔ سرسید کے زمانے میں انگریزی کی اشد ضرورت نے انگریزی تعلیم کو ہی اس کا خاص جزء بنا دیا تھا جس کے لئے سرسید ہمیشہ کوشاں رہے۔ اردو کی تعلیم کو شعبۂ مشرقی جس میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا، ٹوٹ جانے کے بعد اس کالج کے تعلیمی شعبہ سے بظاہر کوئی خاص لگاؤ نہ رہا تھا۔ مگر اس کالج نے مشاہیر ادب دفن کا وہ جمِ غفیر پیدا کیا جو سرسید کی تمناؤں کا عین مرکز تھے اور سرسید کے لگائے ہوئے پودے کا وہ شیریں پھل تھے جو ان کی زندگی ہی میں شجرِ ادب کی زینت بنے۔

علی گڈھ تحریک نے اس نئی پود کو پروان چڑھایا جس نے سرسید کے اثر سے ان کے جدید ادبی رجحانات کی روشنی میں علم و ادب کی جدید روایات کو سنبھالا اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ وحید الدین سلیم پانی پتی، حاجی محمد اسمٰعیل، حاجی محمد موسیٰ خاں، محمد مقتدیٰ خاں شروانی، شیخ عبداللہ، عبدالعلی خاں، سید عبدالباقی، رشید احمد سالم، میر ولایت حسین، سجاد حیدر یلدرم، حبیب الرحمان خاں شروانی، مولوی عبدالحق، مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عنایت اللہ، ظفر علی خاں، محفوظ علی بدایونی، مولوی طفیل احمد منگلوری محمد داؤد عباسی، مولوی شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، خوشی محمد خاں ناظر اور سر رضا علی وغیرہم یہ سب علی گڈھ کالج کی اولین نسل میں سے ہیں، جن کے ادبی اور صحافتی کارنامے اردو ادب کا جدید سرمایہ ہیں۔ سرسید ہمیشہ باصلاحیت نوجوانوں کی ہمت افزائی کرتے اور ان کی ادبی خدمات سے خوش ہوتے تھے۔ وحید الدین سلیم کے مضامین میں عربوں کی شاعری کی تلخی اس شاعری اور میر کی شاعری اہم ہیں۔ ان کے یہاں تحقیقی ذوق خاص طور پر نمایاں ہے۔ یہ اسی ذوق کا اثر تھا کہ انھوں نے لسانیات کی طرف توجہ کی اور اصطلاحات وضع کیں۔ کچھ دنوں تک سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ رہے اور تفسیر القرآن کی تصنیف میں مدد کرتے رہے۔ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت بھی کی۔ علی گڈھ سے رسالہ معارف نکالا۔ اس رسالے نے علمی اور تحقیقی خدمات سے اردو میں ادبی صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کر دیا۔ وہ شاعری میں بھی جدیدیت کے علمبردار تھے اردو شاعری میں

۱۔ ذوق ادب اور شعور از پروفیسر احتشام حسین صاحب ص ۲۱۵

تاریخی و بیانیہ نظموں کو فروغ دینے میں انھوں نے بڑا حصہ لیا۔

مولوی عبدالحق کا نام تو ایک اعلیٰ محقق کی حیثیت سے مسلم ہے۔ وہ اردو ادب کی جو بیش بہا خدمات ساری عمر کرتے رہے اسی کے باعث بابائے اردو کہلائے۔ ان کی بدولت بہت سی نادر الوجود کتابیں منظر عام پر آئیں۔ سب رس، معراج العاشقین، نصرتی، ریاض الفصحا، نکات الشعراء، مرحوم دلی کالج، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، یہ سب ان کے تحقیقی کارنامے ہیں۔ اردو کی قواعد اور لغت بھی ان کی خدمات ادب میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف اور مضامین اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہیں۔ مولوی عبدالحق اردو زبان کے خادم خاص تھے جنھوں نے انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنی تمام عمر ادبی خدمات کے لئے وقف کر دی۔ ان کے یہاں ادبی وقار، سنجیدگی و متانت اور ٹھوس علمی و تحقیقی شان بہ افراط ملتی ہے۔ مولوی عنایت اللہ، مولوی ذکاء اللہ کے فرزند اور علی گڈھ کے اولین طلباء میں سے تھے۔ اپنے والد کی مانند وہ بھی ترجموں کی خاص لیاقت اور ذوق رکھتے تھے۔ ان کی ادبی صلاحیت کے باعث سرسید کی ان پر مشفقانہ عنایت تھی۔ چنانچہ سوانح البیرونی کی تالیف پر سرسید مولوی عنایت اللہ کو مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "جس خوبی اور عمدگی سے تم نے اسے لکھا ہے، وہ محتاج تعریف نہیں۔ میرا دل نہایت خوش ہوا کہ خدا نے تم کو تالیف کی بھی اس قدر لیاقت دی ہے۔"[۱] سرسید کی فرمائش پر انھوں نے آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا بھی ترجمہ کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ مولوی عنایت اللہ نے اعلیٰ مغربی مصنفین کی تحریروں کا ترجمہ کرکے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کئے۔ (فٹ نوٹ نمبر ۴)۔[۲]

شیخ عبداللہ جو ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ تعلیم نسواں کے سکریٹری منتخب ہوئے، مسلم گرلز کالج علی گڈھ انھیں کی شاندار یادگار ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے رسالہ عصر جدید نکالا، اور ادبی صحافت کا بلند معیار قائم کیا۔ ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی

۱۔ بحوالہ علی گڈھ تحریک ص ۳۱۹

۲۔ (دیکھیں تفصیلی فٹ نوٹ نمبر ۴ باب پنجم) ص ۳۳۲

کے نام بلند پایہ صحافیوں کی حیثیت سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی صحافت گو سیاسی تھی مگر اس میں ایک خاص ادبی لطافت اور شان بھی تھی۔ ہمدرد کے مضامین میں خاص ادبی حسن ہوتا تھا اور اس کا معیار اپنے زمانے کی صحافت سے بہت بلند تھا۔ مولانا محمد علی اس میں خود بھی سیاسی اور دیگر موضوعات پر مضمون لکھا کرتے تھے جو مضامین محمد علی کے نام سے شایع ہو چکے ہیں۔ جوہر تخلص کرتے تھے اور شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ مگر سیاسی رجحان ان سب پر غالب تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کے باوجود شعر و ادب سے ان کا لگاؤ ان کی صحافت میں عیاں رہا ہے۔ ظفر علی خاں طالب علمی میں ہی مضمون نگاری، شاعری اور خطابت کے لئے مشہور ہو گئے تھے۔ ان کی سیاسی نظموں نے تو پرجوش زندہ موضوعات کے ذریعہ گویا آگ لگا دی تھی۔ "روزنامہ زمیندار ان کے باغیانہ صحافتی اور سیاسی رجحانات کی مکمل تصویر ہے۔ قادر الکلامی اور جوش ان کا خاص وصف تھا۔ ان کی ہجویات بڑی زبردست ہوتی تھیں، جن کی زد سے اس زمانہ کی بڑی شخصیتوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔" زمیندار کے ذریعہ ظفر علی خاں نے اردو کے دامن کو بے شمار صحافتی الفاظ سے وسیع کیا۔ خبروں کی ترتیب کا رخ بدلا۔ ۔ ۔ ۔ تب کئی کالمی سرخیاں دینے کا رواج نہ تھا۔ زمیندار نے یہ تنوع بھی اختیار کیا جو تحریروں کی مختلف منزلوں سے گزر کر ہر اخبار کا جز لاینفک بن گیا۔"۱ انھیں کی بدولت عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، چراغ حسن، قاضی احسان اللہ، شورش کاشمیری، حسرت موہانی، اور حاجی لق لق جیسے صحافیوں کی ایک پوری نسل نے تربیت پائی۔ حسرت موہانی کی حیثیت ایک سرگرم سیاست داں ہونے کے باوجود ایک اعلیٰ غزل گو کی بھی ہے۔ انھوں نے غزل کو حالی کی آتشین اصلاح کی زد سے بچا کر اسی قدیم ڈھانچہ میں ایک نئی تازگی، نیا حسن، نئی روح اور نئی آن بان دی۔ ان کا رسالہ اردوئے معلی ایک ادبی رسالہ تھا جو علی گڈھ سے جاری کیا تھا۔ حسرت اعلیٰ غزل گو کے علاوہ ایک سرگرم سیاسی کارکن اور ایک سرمست خادم وطن بھی تھے، جنھوں نے جیل کی قید و بند، مشقتوں اور صعوبتوں کے ساتھ اپنی اعلیٰ شعری صلاحیتوں کو قائم رکھا۔

خوشی محمد خاں ناظر اور محمد داؤد عباسی کالج کے نامور نظم گو اور ہجو گو تھے جو

۱۔ س (شورش کاشمیری) بحوالہ علی گڈھ تحریک ص ۳۲۶

"پوئٹ لاریٹ" اور "لانگ فیلو" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ناظر پیروڈی اور پھبتی میں ماہر تھے اور تضمین کے ذریعہ شعرا کی خوب گت بناتے تھے۔ ظریفانہ کلام کے علاوہ اخلاقی نظمیں، مثنویات اور غزلیں بھی کہیں مگر کوئی مجموعہ شایع نہیں ہوا۔ "خیالات عزیز" مولوی عزیز مرزا کے اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کالی داس کے مشہور ڈرامے "وکرم اروشی" کا ترجمہ اور محمود گاوان کی سیرت ان کی ادبی کاوشوں کی یادگار ہیں۔ مرحوم مقرر بھی تھے مگر "تقریر سے زیادہ ان کی تحریر پر زور اور شاندار ہوتی تھی۔ . . . . . ریاست حیدرآباد میں کوئی علمی اور سوشل مجلس اور سوسائٹی ایسی نہ تھی جس کے وہ پریسیڈنٹ یا وائس پریسیڈنٹ نہ ہوں مثلاً دائرۃ المعارف نظام کلب، کتب خانہ آصفیہ، علی گڈھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، انجمن اردو وغیرہ"[1] خواجہ غلام الثقلین نے رسالہ عصر جدید نکالا۔ انھوں نے محسن الملک کی فرمائش پر فلسفہ اخلاقیات اور مابعد الطبعیات کی بعض مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔[2] مولوی عبدالحق لکھتے ہیں "یونین کلب میں ان کی تقریروں کی آتش فشانی اور اخوان الصفا میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی . . . . خود سرسید مرحوم بعض اوقات محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔"[3]

غرض یہ کہ علی گڈھ کی پروردہ یہ پوری نسل اردو ادب کی علمبردار بنی۔ اس معنی میں اگر اس نسل کو سرسید کی اولاد معنوی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نسل نے نثر و نظم، ادب و صحافت کے میدان میں مغرب کے آفتاب سے ایک نئی سحر نما کی، وہ سحر جس میں افق کی رنگینی کے ساتھ روشن تر ہونے، وقت کا ساتھ دینے اور آگے بڑھتے رہنے کی صلاحیت ہو۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ علی گڈھ کالج میں انگریزی کا بے انتہا چرچا اور مغربی تعلیم کا زور شور ہونے کے باوجود اس کی پروردہ اولین نسل ایک مکمل اور باصلاحیت اردو داں طبقہ اور ان ادبا، و شعرا اور صحافیوں کو پیدا کرتی ہے جنھوں نے مستقبل کی تمام ادبی روایات کی رہنمائی کر کے اردو ادب میں نئی راہیں متعین کیں۔ یہاں سرسید کا

۱۔ چند ہم عصر از ڈاکٹر عبدالحق ص ۳۷

۲۔ علی گڈھ تحریک ص ۳۲۱

۳۔ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق۔ ص ۱۱۱ - ۱۱۲

نظریہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ یہ کہ انگریزی تعلیم سے ان کا مطمح نظر محض تقلید مغربی و سرکاری رسوخ نہیں بلکہ مقصود اصل ذہنی بیداری اور علمی روشنی کا حصول تھا۔ یعنی مغربی علوم سے استفادہ کر کے بیدار مغزی، وسیع النظری اور ایک علمی و ادبی فضا پیدا کر دی جائے جو فکر و عمل کی راہوں میں شمع راہ بنے۔ کہتے ہیں: "اگر یہ مدرستہ العلوم نوجوان مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جن کے خیالات مہذب اور ترقی کی طرف مائل ہوں تو ہم کو کچھ شک نہیں ہے کہ اس کا نتیجہ بے انتہا فوائد سے مالامال ہوگا۔"۱ چنانچہ علی گڑھ کالج کی اولین پود نے علم و ادب کی وسعتوں کو اپنے قومی سانچہ میں ڈھال کر خوب سنوارا اور نکھارا جس کی تمام کارگزاریاں یقیناً علی گڑھ کالج کے اعمال نامے میں لکھی جائیں گی اور اس کا سہرا سرسید ہی کے سر ہے۔

یہ داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی علی گڑھ کی بعد کی نسلوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، قاضی عبدالغفار، سلطان حیدر جوش، آغا حیدر حسن، اقبال احمد سہیل، سجاد انصاری، فانی بدایونی، عظمت اللہ، اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، سردار جعفری، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، معین احسن جذبی، اسرار الحق مجاز، آل احمد سرور وغیرہ سیکڑوں شخصیتیں شامل ہیں جنھوں نے مختلف راہوں سے خدمات ادب انجام دیں — بلکہ نئے اصول فکر کے ساتھ نئے تجربات شامل کئے اور وقت و زمانہ کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہے۔ ایم، اے، او کالج نے اپنے اولین اور بعد کے دور میں خادمان ادب بلکہ خادمان قوم کی ٹولیوں کی ٹولیاں پروان چڑھائیں۔ ان نئی نسلوں نے جدید دور میں جو ادبی خدمات انجام دیں اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے جس کا یہاں موقع نہیں یقیناً یہ علی گڑھ کی نئی اپج سرسید ہی کے دائرۂ خدمت میں شامل ہوگی۔ اب ہمیں سرسید کے اس زبردست اثر کا اندازہ ہوتا ہے جو اردو ادب و ادیار دونوں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ یہ اثر بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں قسم کا تھا۔ جو ان کے زمانے اور بعد کے زمانے تک پھیلا نظر آتا ہے۔ "ہمارا بیان ناقص رہے گا۔ اگر یہ نہ کہا جائے کہ

۱۔ تہذیب الاخلاق ۱۵ رجمادی الثانی ۱۲۹۱ھ۔

سرسید کی صحبت خود ایک درس گاہ تھی جس کے اثر نے بڑے بڑے ادبی و علمی انقلاب کئے۔" ا

ان زبردست اثرات کے ساتھ جن مغربی قدروں کی اشاعت ہوئی ان میں زیادہ حصہ ادبی روایات کا ہے۔ مذہب میں انھوں نے عیسائیوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کی۔ تمدن میں اس مشترکہ تہذیب کی پاسبانی کی جو ہندو مسلم اتحاد کی یادگار تھی۔ اس میں مغرب کی آمیزش بھی اتنی ہی کی جتنی مفید اور کارآمد ہو۔ انھوں نے پوشاک اور رہن سہن مغربی اختیار کیا لیکن کچھ تو ہندوستانیوں اور انگریزوں میں موانست کی خاطر تھا اور کچھ مسلمانوں میں مغرب سے مانوسیت پیدا کرنے کی غرض سے جدید مغربی تعلیم کے ساتھ مشترک کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور تربیت اخلاق وعادات کو ہندوستانیوں کی عادت ثانیہ بنانا چاہا۔ بورڈنگ ہاؤس کو تربیت گاہ کی حیثیت سے خاص اہمیت دی تاکہ اجتماعی تصورات، قومی وحدت اور جدید یک رنگی کو فروغ حاصل ہو۔ مگر ادب کی وسعتوں میں سرسید نے زیادہ سے زیادہ مغربی اثرات سمو دئے۔ انھوں نے اردو نثر ہی نہیں بلکہ اردو شاعری میں بھی ان گہرے اثرات سے انقلاب بپا کر دیا۔

اردو ادب کو دیکھیں تو انیسویں صدی سے قبل اس کا بیشتر سرمایہ چند داستانوں تذکروں اور تصوف کے رسالوں پر مشتمل تھا اور غدر کے بعد سرسید کی تحریک سے قبل فورٹ ولیم کی درسی کتابیں اور دلی کالج کے ترجمے ان پر اضافہ تھے۔ فورٹ ولیم کی درسی کتابوں نے پہلی بار اردو نثر میں سادگی اور سہل بیانی کی ابتدا کی اور ظاہر ہے کہ یہ ادبی خصوصیت کی حیثیت سے نہیں رائج کی گئی بلکہ غیر ملکیوں کی تعلیمی سہولت کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کے قیام کے ستاون سال بعد غدر کے بعد تک بھی سرسید کی تحریک سے پہلے یہ آسان طرز تحریر اردو ادب میں رواج نہ پا سکا تھا۔ اس لئے فورٹ ولیم کی روایتی سادگی حکام کے درسی مقاصد کی تکمیل کی رہین منت تھی جس کے مقابلہ میں سرسید کی سادہ نثر حسن فن اور اجتماعی مقاصد کی تکمیل کی محرک بنی۔ موضوعات کے لحاظ سے

ا۔ بحوالہ تذکرہ سرسید از محمد امین زبیری ص ۳۵۵

دلی کالج فورٹ ولیم پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس لئے کہ یہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ لھذا سائنس جغرافیہ، تاریخ، و ریاضی وغیرہ تمام مضامین جو درسی حیثیت کے ہوں انگریزی سے ترجمہ کئے جاتے تھے۔ اس طرح اردو میں انگریزی ادب سے استفادہ کی ابتدا ہوئی۔ مگر اس وقت تک تعلیم میں مذہبیات کو اتنا زیادہ دخل اور فارسی کو اتنا زیادہ فروغ تھا کہ درس وتدریس میں دیگر مضامین ہیچ تھے اور حد یہ ہے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے ادارے مجہلے مشہور تھے۔ علاوہ ازیں غدر ۱۸۵۷ء نے دلی کالج اور اس کا ادبی سرمایہ بھی ختم کر دیا۔ نیز دلی کی مکمل تباہی نے سماجی بربادی کے ساتھ علمی ماحول بھی درہم برہم کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی ادب اور مغرب کا اثر دلی اور نواح میں تیز نہ ہو سکا۔

پھر بھی دلی کالج سے جدید علمی ماحول کے لئے فضا تیار ہو رہی تھی۔ مخصوص تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی تھی جنھیں اس کالج اور اس کی تعلیم سے خاص شغف تھا۔ مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، ماسٹر رام چندر وغیرہ اسی کالج کے پروردہ تھے۔ مولانا صہبائی اور ان جیسے قدیم ادباء کالج سے تعلق رکھنے کے باعث انگریزی ادب سے کچھ ترجموں کے ذریعہ اور کچھ انگریزی مدرسین کی صحبت کی وجہ سے تھوڑا مانوس اور آشنا ہو گئے تھے۔ مگر غدر کے شعلۂ آتشین سے یہ ساری فضا خاک ہو گئی۔ اس وقت پہلی بار سرسید نے مغربی معاشرت کی قبولیت، مغربی تعلیم کی ضرورت، انگریزی زبان وادب کے حصول کی اہمیت، کا شمالی مغربی علاقے میں اعلان کیا۔ اسے وقت کا لازمہ اور ترقی کا زینہ بتایا۔ اب جاگیر دارانہ نظام شکستہ ہو چکا تھا مگر اس کے اثرات پورے ہندوستانی سماج میں جاری وساری تھے۔ ہمارا ادب بھی سماج کی اس جمودی اور قنوطی کیفیت کے اثر سے بے جان اور نڈھال تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ نئی قدریں ابھی کوئی واضح خاکہ متعین نہ کر سکی تھیں۔ "غدر ۱۸۵۷ء قرون وسطی اور عہد جدید کے ہند اسلامی ادب اور زندگی کے ہر گوشے میں خط تمیز ہے۔"[1]

---

1. Islam In India — By Aziz Ahmad P. 104

سرسید کی تحریک نے ہمارے عقائد و معاشرت اور تعلیم و ادب کا جو نیا خاکہ بنایا اس میں محض مغرب کی تقلید نہ تھی بلکہ مغرب کی جان دار روایات اور تعلیم و ادب اپنانے کی تلقین اور کوشش تھی۔ چونکہ تعلیم اس تحریک کا مرکزی جز تھی اس لئے زبان و ادب پر سب سے گہرا اور نمایاں اثر ضروری تھا۔ "یہ سرسید کا کارنامۂ خاص ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو اپنی زندگی کا ہی نہیں بلکہ اس وسیع معاشرہ کا بھی ترجمان بنایا جس کے وہ ایک مقتدر فرد تھے۔ اس لحاظ سے سرسید ہی رہنمائے دور تھے"۔ ۱ سرسید کی ادبی جہد یقیناً اردو زبان میں افادیت کی اولین پکار تھی۔ زمانے نے سرسید پر مقصدیت کی اہمیت واضح کی اور سرسید نے اردو ادب کو اس سے آگاہ کرکے ادب و زندگی کے رشتہ کو مضبوط کیا اور ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں "سرسید کی تحریریں اس امر کا ثبوت ہیں کہ مقاصد اعلیٰ ہوں تو ان کے فیضان سے زبان خود ارفع و اعلیٰ ہو جاتی ہے۔ تمام ملکوں اور قوموں کے شعر و ادب کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ شعر و ادب کو توسیع و ترقی اور ترفع اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کو کسی بڑے مقصد کے حصول یا حفاظت کا وسیلہ بنایا گیا"۔ ۲

مقصد سرسید کی تحریروں کا غالب جز ہے۔ ان کا طرز و اسلوب اور موضوع دونوں مغرب کے ادبی اثرات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے اثر سے اردو ادب میں جدید موضوعات اور اسلوب عام ہوئے۔ نئے نئے ادبی انواع بھی سرسید ہی کے نظریات اور ان کے اثر سے قائم ہوئے۔ ان سب کے ساتھ مضمون نگاری خاص سرسید ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ "تہذیب الاخلاق میں سرسید کے مضامین اردو کے کلاسیکس ہیں"۔ ۳ مگر ان کے یہ کلاسیکس بھی انگریزی ادب کے اثر سے ہمارے یہاں پہنچے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انگریزی کی براہ راست تعلیم نہ ہونے کے باوجود وہ کس طرح انگریزی کی بلند پایہ کتابوں، بڑے بڑے مصنفین اور ان کی تحریروں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

۱۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ص ۷۰

۲۔ اردو نثر کا بنیادی اسلوب از رشید احمد صدیقی در فکر و نظر جنوری ۱۹۶۰ء ص ۹۶

۳۔ پریم چند۔ بحوالہ انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق۔ ص ۱۶